نورِ مبین
کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے
آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا
ٹھہرا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے
پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں
کو پیدا کیا۔ سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے
ہوئے ہیں۔ دیکھو سب مخلوق اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی
کا ہے) یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔
(الاعراف۔54)

اس شمارے میں

اس شمارے میں

طاقت چھین لے جانے تک چلتی چلی گئی۔ جیل انتظامیہ کی کرپشن، بدعنوانی، خورد و برد اور انتظامیہ کی ذاتی مفادات کے باعث زندانوں میں انہیں موبائل فون، بیرونی رابطوں اور پیغام رسانی کی تمام سہولیات میسر تھیں۔

موت کی سزاؤں پر عمل درآمد رکوانے کی اپیلیں کرنے والے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اپنے ملک برما میں مسلمانوں کی اجتماعی نسل کشی رکوانے کے لیے آج تک ایک بھی اپیل نہیں کر سکے، جہاں کی بدھ حکومت باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہزاروں مسلمانوں کو قتل، جلاوطن کرنے اور گھر اور جائیدادوں سے بے دخل کرنے میں مصروف ہے۔

گزشتہ آٹھ سال سے ہماری کمزور اور نوتا نظریاتی حکومتوں نے یورپی یونین کے دباؤ کے تحت، عدلیہ سے ملنے والی موت کی سزاؤں پر عمل درآمد معطل کر رکھا تھا اور پھانسی کی سزاؤں سے بے فکری نے مجرموں کی گردنوں کو مزید موٹا کر دیا تھا۔ وہ جیلوں کے عملے کی ملی بھگت، رشوت اور روپے پیسے کے زور پر جس سے چاہتے رابطے، ملاقاتیں کرتے، گھروں کے کھانے کھاتے اور جیلوں کی محفوظ چار دیواری میں بیٹھ کر جرائم پیشہ گروہوں کی سرپرستی کرتے، چوری، ڈاکے اور قتل کی وارداتیں کرواتے اور جیلوں کے اندر دندناتے پھرتے تھے۔

ہمارے بدقسمت ملک میں، جو لاکھوں قربانیوں کے بعد قائم ہوا تھا، اب غیر ملکی امداد، پاکستان دشمن طاقتوں کے ایجنڈے اور اسلام مخالف نظریات پر مشتمل ایسی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں نام نہاد سول سوسائٹیاں بھی وجود میں آ چکی ہیں جو اس ملک کا کھاتی اور اپنے سرپرستوں کے گن گاتی ہیں اور جنہیں نہ صرف پھانسی کی سزا بلکہ تمام اسلامی تعزیرات وحشیانہ، غیر انسانی اور دورِ جدید کے تقاضوں کے خلاف اور بے معنی نظر آتی ہیں اور ان کے خلاف گلا پھاڑ پھاڑ کر ڈھنڈورا پیٹنا، مظاہرے کرنا اور ان نام نہاد مظاہروں کی ویڈیو بنا کر اپنے سرپرستوں کو "مزید فنڈز" کی اپیلوں کے ساتھ بھیجنا اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے اب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں ایسی کالی بھیڑوں کی کوئی کمی نہیں، جنہیں اپنے ملک کی ہر اچھی چیز میں خرابی اور دوسروں کی ہر خرابی میں بھی اچھائی کے پہلو نظر آ جاتے ہیں۔ برساتی مینڈکوں کی طرح قائم ہونے اور دن رات نشریات کرنے والے ٹی وی چینلوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن بے غیرتوں کو عزت، شہرت اور دولت تو اس ملک نے دی ہے لیکن وہ پروگرام دشمن ملک کے دکھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، جیسے "امن کی آشا"، "کون بنے گا کروڑ پتی"۔ حالانکہ اس ملک میں ہمارے کسی بھی ٹی وی چینل کا دیکھا جانا ناممکنات میں سے ہے اور پھر کون نہیں جانتا کہ ہمارے ملک میں دہشت گردوں کو تربیت، اسلحہ و گولہ بارود اور روپیہ پیسہ کون دے رہا ہے؟

اسی طرح چند معروف اردو اخبارات کے احساسِ کمتری کا شکار ایڈیٹر صاحبان چند بھارتی صحافیوں نے

انگریزی کالموں کے تراجم شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسے کالموں میں پاکستان کے خلاف تعصب صاف محسوس کیا جا سکتا ہے اور ان بھارتی کالم نگاروں کو زرمبادلہ کی صورت میں بھاری معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہم نے آج تک بھی کسی انڈین اخبار میں کسی پاکستانی صحافی کا کالم شائع ہوتے نہیں دیکھا۔

جہاں تک یورپی یونین یا انگلینڈ کا موت کی سزائیں ختم کرنے کے مطالبے کا تعلق ہے، تو وہ آج تک بنگلہ دیش میں محب وطن پاکستانیوں اور بھارت میں حریت پسند کشمیریوں کی پھانسیوں کو رکوانے کے لئے ان دونوں ملکوں پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکے۔ کیا ایسے ہر ناجائز دباؤ کے لئے صرف پاکستان ہی رہ گیا ہے؟ کیا گورے تاریخ کے اس دور کو بھول چکے ہیں جب انہوں نے برصغیر پر قبضہ کرنے کے لئے لاکھوں ہندوستانیوں کو درختوں کے ساتھ پھانسی کے پھندے لگا کر بے گناہوں کو اپنے وطن کی "حفاظت" کرنے کے جرم میں لٹکایا تھا۔

چند سال قبل انسانی حقوق کے سب سے بڑے چیمپئن، امریکہ نے دہشت گردی کے جرم میں اپنے ایک سابق فوجی کو، جس نے "ٹائم بم" کے ذریعے اوکلاہاما سٹی میں امریکی انٹیلی جنس ادارے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کو تباہ کیا تھا، زہر کا ٹیکہ لگا کر مرتے ہوئے، پوری دنیا کو دکھایا تھا۔ وہاں آج بھی الیکٹرک چیئرز اور زہریلے انجکشن کے ذریعے سزائے موت برقرار ہے لیکن پاکستان میں دہشت گردوں، انسانیت اور اسلام دشمن درندوں، ہزاروں معصوم انسانوں اور پھول جیسے ہنستے مسکراتے بچوں کو ذبح کرنے والے قاتلوں کے لئے یہ سزا گوارا نہیں۔ انہیں تو سر عام لٹکایا جانا چاہئے تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

پاکستان کے سابق صدر ضیاء الحق کے دور میں ایک معصوم بچے پپو کے قاتل کو جب سر عام پھانسی پر لٹکایا گیا تھا تو کئی سال تک کے لئے اغوا اور قتل کی وارداتیں رک گئی تھیں۔

لہٰذا دہشت گردی کے ناسور کے خاتمے کے لئے عبرتناک سزاؤں پر عمل درآمد ضروری ہے۔ جس طرح آج سیاسی اور فوجی قیادت کی سوچ ایک ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے حکمرانوں کو کسی قسم کے اندرونی یا بیرونی دباؤ، پریشر، دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، عدالتوں سے سزائے موت پانے والے دہشت گردوں، قاتلوں اور انسانیت دشمنوں کو کال کوٹھڑیوں سے نکال کر اور تختہ دار پر لٹکا کر جیلوں کو ان کے ناپاک وجود سے جلد از جلد پاک کر دینا چاہئے تا کہ پاکستان کے عوام سکھ کی نیند سو سکیں، ورنہ آج کل تو لوگ اپنے گھر کے دروازوں پر محفوظ نہیں ہیں۔

اسلامی تعزیرات کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں

کر فساد برپا کریں، اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑی سزا ہے"۔ (سورۃ المائدہ:33)

زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔

موجودہ دور میں بھی دنیا میں سب سے کم جرائم سعودی عرب میں ہوتے ہیں کیونکہ وہاں صحیح اسلامی تعزیرات نافذ ہیں اور کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ کیئے بغیر مجرموں کو یکساں سزائیں دی جاتی ہیں، جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔

میاں محمد ابراہیم طاہر

وقاص شاہد پر قاتلانہ حملہ

محترم عنایت اللہ مرحوم کے پوتے وقاص شاہد ایڈووکیٹ جو "حکایت" کے قانونی مشیر بھی ہیں کو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا۔ 24 دسمبر شام ساڑھے آٹھ بجے وقاص شاہد گھر کے باہر دو پڑوسیوں سے گفتگو کر رہے تھے تو اچانک دو موٹر سائیکل سوار ان پر فائرنگ کر کے فرار ہو گئے۔ وقاص شاہد کو تین گولیاں لگیں جس سے ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ وہ ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ قارئین سے اپیل ہے ان کی مکمل کامل صحت یابی کی دعا کریں۔ جزاک اللہ!

(ادارہ)

معصوم شہداء۔ راہ متعین کر گئے

- دہشت گرد کون ہیں اور کہاں سے آتے ہیں؟
- روس کو بھگانے کے بعد مسلح قبائلی دہشت گرد بن گئے۔
- ماضی میں افغانستان میں پاکستان مخالف حکومت رہی۔
- اسرائیل، امریکہ، روس اور انڈیا کا پیسہ رنگ دکھا گیا۔
- مسلمان ہی مسلمان کو مار رہا ہے۔
- ضرب عضب ناگزیر ہو گئی تھی۔
- نائن الیون کے بعد حالات زیادہ بگڑ گئے۔
- اسلامی ایٹمی پاکستان کا تحفظ پہلی ترجیح۔
- دہشت گردوں کو پھانسی، راست اقدام ہے۔

☆ afzaalmazhar@gmail.com افضال مظہر انجم

پاکستان جب آزاد ہوا تو جس طرح سے یہاں جاگیرداری اور سرداری نظام ختم کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی اسی طرح سے قبائلی علاقہ کی حیثیت ختم کرکے اسے اپنی عملداری میں شامل کرنے کی ہمت کوئی بھی فوجی یا جمہوری حکومت نہ کرسکی۔ قبائلی علاقہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان آزاد قبائل کا علاقہ تھا۔ نہ ان پر پاکستان کا قانون لاگو ہوتا تھا نہ ہی افغانستان کا۔

دو سو سال تک تو یہ علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں رہا تھا لیکن ایک اسلامی مملکت بن جانے کے بعد ان کلمہ گو اور نماز کے پابند لوگوں کو اسی مملکت میں شامل ہو جانا چاہئے تھا لیکن ہزاروں سال سے ان کا پیشہ ہر آنے والے حملہ آور کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرنا رہا تھا اور اسلامی مملکت کے قیام کے بعد بھی ان لوگوں نے اپنے اوپر قبائلی کا ہی لیبل چڑھا رہنے دیا۔ یعنی آزاد لوگ ہر غلط، غیر قانونی اور غیر اخلاقی فعل کرنے میں آزاد۔ کسی ملک میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں تعلیم، سڑکیں، ہسپتال وغیرہ قائم نہ کئے جاسکے تھے۔

ان کا کاروبار یا پیشہ ہر قسم کا ناجائز اسلحہ، ہیروئن، چرس کی سمگلنگ تھا جس سے ان کی گزر اوقات ہوا کرتی تھی۔ پورے ملک سے اغوا کئے ہوئے بچے یا دیگر مجبور لوگ بھی یہاں پر ہی پہنچائے جاتے تھے اور تاوان لے کر رہا کرائے جاتے تھے۔ چوری کی گاڑیاں بھی علاقہ غیر سے برآمد ہوتی تھیں اور سمگلنگ کا سارا مال ہر قسم کی اشیاء یہاں سے ہی پاکستان اور افغانستان میں جاتی تھیں کیونکہ انہی سارے ناجائز کاموں کی آمدن کی وجہ سے یہاں عام لوگوں اور یہاں کے کرتا دھرتا بڑے خوانین کی سرداری اور رعب داب قائم رہتا تھا۔ تمام ناجائز اور غیر قانونی کام کرنے کے علاوہ بحیثیت قوم یہ لوگ برصغیر کی دوسری اقوام کی نسبت مذہبی شعائر نماز، روزہ، حج کے بھی سختی سے پابند تھے۔

ہر آنے والی پاکستانی حکومت نے لاکھوں کی تعداد میں ان قبائلیوں کو اس لئے نہ چھیڑا کہ یہاں اسلحہ کی فراوانی ہونے اور اسلحہ کے کاروبار کی وجہ سے یہ لوگ مسلح ہوتے تھے اور پاکستان میں اس علاقہ کو شامل کرنے یا ان کو بغیر قانونی کاموں سے روکنے پر ایک بڑی مسلح مزاحمت کا خطرہ تھا جو کوئی بھی حکومت مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور ملک کو خطرہ میں دیکھ کر ان قبائلی سرداروں سے بیان دلوائے جاتے تھے کہ وہ پاکستان کی طرف دیکھنے والے کی آنکھ نکال دیں گے۔ حالانکہ یہ صرف بیانات کی حد تک ہی تھا۔ ان قبائلیوں کو تو اپنے ناجائز کاروبار جاری رکھ کر پیسہ کمانے سے غرض تھی اور یہ غرض بھی پاکستان میں آنے والی ہر حکومت نے ان کو دیا ہوا تھا۔ کبھی پاکستانی دکاموں سے الجھنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔

1979ء میں روسی فوج افغانستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنا کر افغانستان میں داخل ہو چکی تھی۔ یہاں سے کئی سیاسی و مذہبی گروپوں اور مجاہد قائدین نے روس کو اپنے ملک سے نکالنے کے لئے مسلح جدوجہد شروع کی۔ اس وقت جنرل ضیاء الحق ملک کا اقتدار سنبھال چکے تھے۔ انہوں نے ان گروپوں کی ہر طرح سے فوجی و مالی مدد کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ مستقبل میں روس کے پیچھے جم جانے کی وجہ سے پاکستان کو اگلا نشانہ بننے سے بچایا جا سکے۔ لاکھوں کی تعداد میں اس جنگ سے متاثرہ افغانوں کو بھی ایک تو ہمسایہ ملک اور دوسرے مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان میں پناہ لینا پڑی اور آہستہ آہستہ پشاور سے لے کر کراچی تک کے علاقہ میں یہ افغانی پھیل کر رہائش پذیر ہو کر اپنا کاروبار، ملازمت وغیرہ میں مشغول ہو چکے تھے۔

امریکہ نے بھی پاکستان کو افغانوں کی مدد کرنے

ہے؟ ایسے اَلمناک اور شرم سے غرق کرنے والے سانحات اور حادثات مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہے تھے۔ مسلمان ہی مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے تھا۔ مسلمان ہی مسلمان کے خون کا پیاسا بنا ہوا تھا۔

ایک گروپ اپنے آپ کو درست ثابت کرتا اور دوسرا اپنے آپ کو سچا کہتا۔ ان کے ذہن میں یہ سیدھی سادی بات نہیں آتی کہ 57 مسلم ممالک کی واحد ایٹمی طاقت واحد مسلمان ملک پاکستان کو نقصان پہنچے گا تو عالم اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ غیر مسلم یہی تو چاہتے ہیں عرصہ دراز سے وہ ہمیں لڑا لڑا کر ہمیں کمزور تر بناتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہموار کیا کہ آج ہم خود ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹ کر اسلام دشمنوں کا راستہ ہموار کرتے جا رہے ہیں۔

طالبان کے اس دوران درجنوں گروپ وجود میں آ چکے تھے اور اسلام دشمن یا پاکستان دشمن کئی ممالک انہیں استعمال کر کے پاکستان میں تخریب کاری کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ ویسے تو باریش اور ظاہراً شریعت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے لیکن روپے پیسے کے لئے اسلام دشمن عناصر سے مل کر مسلمانوں کی عظیم طاقت پاکستان کو کمزور کرنے کے ناپاک منصوبے پر عمل درآمد کر رہے تھے۔ جنرل مشرف اور سابق آرمی چیف جنرل کیانی کے دور میں ان گروپوں کی طرف سے حساس نوعیت کے مقامات پر حملوں کے علاوہ عوام الناس پر حملوں کا سلسلہ شدت سے جاری رہا۔ حملوں کے دوران خواتین، معصوم بچوں اور بڑے بوڑھوں کو جس بے دردی سے سرعام اور مساجد میں مارنے کا ایسا مذموم سلسلہ شروع ہوا جو اسلام دشمن عناصر نے بھی نہ کیا ہوگا۔

چھوٹی عمر کے ناپختہ ذہن کے نوعمر لڑکوں، نوجوانوں کو ورغلا کر اور ان کی برین واشنگ کر کے حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ ان کے ذہنوں میں یہ ڈالا جاتا کہ یہ لوگ کافر ہیں کافر رہے ہیں اور تم جو کام کر رہے ہو وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے۔ اگر تم یہ حملہ کرتے وقت ہلاک ہو جاتے ہو تو تم جنت میں جاؤ گے۔ گھر والوں کی فکر نہ کرنا۔ تمہارے اہل و عیال کی ڈالروں سے مدد کی جائے گی جو ان کی کئی نسلوں تک کے لئے کافی ہوگی۔ اس لالچ اور ذہنی خلفشار کی وجہ سے یہ نوجوان ان کے چنگل میں پھنس جاتے۔ وہ حملہ کرنے والے خود تو اپنی جان قربان کر دیتے لیکن حملہ کرنے والے یہ گروپ اور نام نہاد مذہبی اور قبائلی لیڈروں کو اسلام دشمن سونے میں تول دیتا۔ پیسے کی یہ دوڑ تیز ہوگئی کہ کئی گروپ دھماکوں اور تخریب کاری کے لئے میدان میں آ گئے۔

جنرل راحیل شریف موجودہ چیف آف سٹاف نے ان ملک دشمنوں کو پیغام دیا کہ ان حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ انہوں نے ہمیشہ کے لئے اس سنگین جرم کو ناکام بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایسے عناصر پر مضبوط ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر کے 18 کروڑ عوام پر ہونے والے اس سنگین مذاق کا قلع قمع کرنے کا تہیہ کیا کہ چند لوگ آ کر روزانہ معصوم اور بے گناہ عوام کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ حساس نوعیت کے مقامات پر تخریب کاری کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ان کے منبع یعنی قبائلی علاقے پر مشتمل علاقہ شمالی وزیرستان میں قائم ان کا مضبوط نیٹ ورک توڑنے اور تباہ کرنے کا عزم کیا جو اس سے پہلے کسی بھی دوسری حکومت کے دور میں انجانے خوف، مصلحتوں اور سیاسی مفادات کی وجہ سے نہیں کیا جا رہا تھا۔

قبائلی علاقوں اور خیبر پختونخوا کے سرپھرے مولویوں نے کبھی شریعت اور کبھی جہاد کے نام پر لوگوں کو مسلح کرنا شروع کیا۔ حالانکہ یہ وہ نازک وقت تھا جب بڑی طاقتیں اور اسلام دشمن عناصر واحد اسلامی ملک پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد اس کے در پے ہو

چکی تھیں اور یہاں افراتفری، تخریب کاری اور لاقانونیت کو فروغ دینے والے ہر شخص، گروہ اور جماعت پر روپے پیسے کی بارش کر رہی تھیں تاکہ پاکستان ایٹمی طاقت بننے کے بعد اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو سکے۔ معاشی مسائل اور قرضوں کے بوجھ تلے دبا رہے۔

یہاں بھانت بھانت کی بولی بولنے والوں صوبائی قوم پرست جماعتوں، فرقہ واریت پھیلانے والی جماعتوں اور ظاہراً شریعت کے نام پر مسلح جدوجہد کرنے والی لیکن اصل میں ایٹمی اسلامی طاقت کو کمزور کرنے اور گھیراؤ جلاؤ کرنے والی جماعتوں کی روپیہ پیسہ سے ہر ممکن امداد کی جائے اور جب ریاست ان کی توڑ پھوڑ یا ملک کی سیکیورٹی پر مامور اداروں سے ان پر سختی یا کنٹرول کرنے لگیں تو جمہوریت اور انسانی حقوق کی آڑ میں واویلا برپا کیا جائے۔ اسی لئے کبھی مولوی فضل اللہ، کبھی صوفی محمد اور کبھی منگل گروپ، لشکر اسلام، وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے۔ طالبان، کبھی پاکستان تحریک طالبان، محسود اللہ گروپ، جند اللہ، خالد خراسانی گروپ اور کبھی فرقہ وارانہ تنظیمیں، کراچی کی سیاسی اور بلوچستان کی قوم پرست جماعتیں بلوچ لبریشن آرمی پر ٹارگٹ کلنگ میں ملوث ہو کر عوام کے خون سے ہولی کھیلتی رہیں۔ صرف کراچی شہر جہاں ملک کا 40 فیصد کاروبار اور انڈسٹری ہے کو آٹھ ممالک تخریب کاری کے لئے فنڈنگ کر رہے ہیں۔

مسلمانوں پر ابتلا کا دور

سوویت یونین کے بعد دنیا کی بڑی سپر پاور کا سربراہ جارج بش مسلم ممالک اور مسلمان عسکری تنظیموں پر دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر اس طرح سے ٹوٹ پڑا گویا یہ کوئی صلیبی جنگ ہو اور اکڑ دکھانے والے ممالک افغانستان اور عراق (صدر صدام) کو تہ تیغ کر کے رکھ دیا۔ بڑی طاقت کا مقابلہ ہمیشہ بڑی طاقت ہی کرتی ہے۔ طاقتور پہلوان کے پیچوں میں جس طرح طاقتور پہلوان ہی بچ کر نکل سکتا ہے۔ دوسرے مسلم ممالک کے حکمرانوں نے وقت کا تقاضا جان کر اور نازک ترین حالات میں اس موقع پر اپنی طاقت کو بچائے رکھا۔ دوسرے لفظوں میں اپنے ممالک میں ہونے والی تباہی سے بچائے رکھا۔ پاکستان، ایران اور سعودی عرب ان اہم ممالک میں شامل ہیں۔ یہ آنے والے وقت نے ثابت بھی کیا۔ 2001ء کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سپر طاقت کی یہ سب سے بڑی جنگی مہم تھی جس میں 26 ممالک کے ایک لاکھ سے زائد فوجی ہزاروں میل دور افغانستان اور عراق کی سرزمین پر اتر چکے تھے۔

57 ممالک کی ایٹمی قوت کا تحفظ

پاکستان 57 اسلامی ممالک میں واحد ایٹمی طاقت ہے جو ایٹمی طاقت بننے کے بعد امریکہ، یورپ، انڈیا اور اسرائیل کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ سوویت یونین کے بعد امریکہ کو اس کی ہمسائیگی افغانستان میں ایک بڑی فوج لے کر آنے کا نادر موقع میسر آ چکا تھا۔ افغانستان میں امریکہ کا مطلوب ترین شخص (Most Wanted Man) اسامہ بن لادن چھپا ہوا تھا۔ جہاں طالبان کی حکومت اس کو پناہ دئیے ہوئے تھی۔ امریکی فوج کے آپریشن کے بعد طالبان یا القاعدہ کے ارکان کا پاکستان کے قبائلی علاقہ یا متصل صوبہ میں فرار ہو کر آنا قدرتی امر تھا لیکن اپنے ملک کو خطرات اور نازک حالات سے دوچار ہونے سے بچانے کی خاطر ان عسکری تنظیموں یا دہشت گردوں کو یہاں آنے سے روکنا یا ان پر ہاتھ ڈالنا ضروری تھا۔

پاکستان ایٹمی طاقت ہونے کے علاوہ دنیا کی پانچویں بڑی فوج، فضائیہ اور بحریہ بھی رکھتا ہے۔ اس کا

اس وقت امریکہ کا ساتھ نہ دینے کا مطلب امریکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف تھا گویا اپنی ہی تباہی. اس وقت کی اعلیٰ فوجی قیادت نے حکمت عملی سے ملک کو ان خطرات سے بچانے کے لئے پھونک پھونک کر قدم رکھا کیونکہ اس کے پیش نظر 18 کروڑ مسلمان عوام تو تھی ہی، ایٹمی اثاثے اور میزائل ٹیکنالوجی کو بچانا بھی اہم ترین فریضہ تھا۔ جنرل مشرف حکومت، اپنے ملک اور اس کے ایٹمی اثاثے بچانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مذہبی لوگ جذباتیت میں مبتلا ہو کر اس کے خلاف ہو گئے۔ جس نے بھی مسلمانوں کو بچانے یا انہیں مضبوط بنانے کی خاطر کام کیا

سلطان صلاح الدین ایوبی کا دور ہو یا برصغیر کی اپنی قوم کو نیست و نابود ہونے سے بچانے والے کمال اتاترک کا رول یا ملک بنانے والی عظیم شخصیت قائداعظم چند مذہبی جنونی اپنے اوپر مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو سچا اور ان تمام اشخاص کو غلط ثابت کرنے کے لئے میدان میں اتر آئے۔ یہی حال طالبان، القاعدہ اور اس قسم کی دیگر مذہبی عسکری تنظیموں کا تھا۔ انہوں نے اپنے سے وابستگان کے ذہن میں ڈال دیا تھا کہ جو کافر کا ساتھ دیتا ہے وہ اس کا ساتھی ہے۔ اس لئے چھوٹی عمر کے ناپختہ ذہن کے نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے وہ مسلسل تیرہ چودہ سال سے اس ملک کے معصوم بچوں، خواتین، بوڑھوں، جوانوں کو بم دھماکوں سے اڑانے کی مذموم حرکات میں ملوث ہوتے رہے۔ انہوں نے عقل و شعور پر جذباتیت اور جنونیت سوار ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سوچا کہ مسلمان ممالک کے پوری دنیا سے ٹکر لینے کی وجہ سے یا امریکہ سے ٹکر لینے کی وجہ سے تباہی صرف مسلمانوں کی ہی ہو گی کیونکہ سپر پاور امریکہ سے تو روس اور نئی ابھرتی پاور چین بھی ٹکر نہیں لے سکا چھوٹے ممالک کی حیثیت ہی کیا ہے۔

امریکی فوج کے انخلاء کا وقت

یہ وہ وقت تھا کہ جب 13 سال تک افغانستان میں برسرپیکار امریکی فوج واپس جا رہی تھی۔ اسے واپس جانے دیا جاتا۔ امریکی یا نیٹو فورسز کے انخلاء کے وقت خونریزی اور بم دھماکوں کی دو اہم وجوہات ہو سکتی ہیں. ایک تو پاکستان جیسے ملک میں بھی افراتفری کے سے حالات پیدا کر دیئے جائیں کیونکہ اس وقت کئی مذہبی اور عسکری گروپ پاکستان دشمن ممالک انڈیا اور اسرائیل کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی پیسہ لے کر یہ کام کر رہے ہیں۔ دوسرے امریکہ بھی یہی چاہے گا کہ اس کی فوج کے انخلاء کے بعد طالبان کی طاقت بھی تتر بتر ہو جائے لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اصل طالبان کون ہیں اور نقلی کون؟ اچھے طالبان اور برے طالبان کی تخصیص ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت صرف اپنے ملک دنیا کی واحد اپنی طاقت کو بچانا سرفہرست ہے اور پاکستان کو بچانے کے لئے جتنی بھی قربانی اپنی پڑے مہنگا سودا نہیں ہے۔

معصوموں کی قربانی راہ متعین کر گئی

پشاور میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرنے والے 132 معصوم شہداء اور ان 19 اساتذہ اور فوج کے محسن انسٹرکٹرز کی یاد ایک درد ناک شہادت مدتوں لوگوں کو رلاتی رہے گی. اگر ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو یہ شرمناک حقیقت نظر آئے گی کہ مسلمانوں کو ہمیشہ غداروں نے مروایا ہے. شام، لیبیا، مصر، پاکستان، عراق میں مسلمان ہی مسلمان کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے. مسلمان ہی مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں کا کام ہم خود ہی آسان بنا رہے ہیں۔ ان کے اسلام دشمن مشن اور مسلم کش پروگرام میں ہم

مسئلہ میں ہی ان کی معاونت کر رہے ہیں۔

پہلی حکومتوں کی مصلحتوں، سیاسی مفادات اور خوف کی وجہ سے چھوڑے جانے والے آپریشن کو موجودہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے ضرب عضب کے نام سے شروع کرنے کا اعلان کیا تاکہ اپنے ملک کو روز روز کے بم دھماکوں، ٹارگٹ کلنگ اور انسانیت کش اقدامات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اس ملک کی سیاسی قیادت، مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے نیم دلی سے اسے قبول کیا۔ ان مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے دلوں میں بھی کھوٹ تھا۔ ان کا اندر اور باہر صاف نہیں تھا۔ ان پر خوف بھی سوار تھا۔ ووٹ یا سیاسی مفادات کی خاطر ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ دہشت گردوں کے بارے میں حقیقت سامنے لائیں۔

8 لاکھ افراد کو آپریشن سے متاثر ہو کر گھر بار بھی چھوڑنا پڑا لیکن سیاسی و مذہبی جماعتوں کے لیڈروں کے دل میں بغض تھا اور وہ دوغلی پالیسی چل رہے تھے۔ اس صوبہ خیبر پختونخوا کے وزیراعلیٰ خٹک ان آٹھ لاکھ متاثرین کو سنبھالنے کی بجائے لاؤ لشکر، پروٹوکول اور سینکڑوں سکیورٹی اہلکاروں کے جلو میں اسلام آباد ہر دوسرے روز پہنچتے رہے۔ دھرنوں اور جلسوں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں پولیس و دیگر سکیورٹی اہلکار تعینات کرنے پڑے۔ ملک کی تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نظریں اور توجہ انہی دھرنوں پر تھی۔ پورے ملک کا میڈیا صبح سے شام تک دھرنوں کی خبریں دے رہا تھا اور تماش بین اور چسکے لینے والی قوم کا ہر فرد صبح سے لے کر شام تک ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جب بغداد کے چوراہوں میں عالم حضرات بیٹھ کر مناظرے اور بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ملک کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آخر ہلاکو عذاب الٰہی بن کر آیا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

بین الاقوامی سازشیں اور پاکستانی سیاست

☆ ...... 0301-3005906, 0345-8599944 ...... گلزار اختر کاشمیری

گزشتہ تیس سال سے پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف عالمی سازشیں ہو رہی ہیں۔ عالمی دنیا تو پاکستان کی طاقتور فوج کے خلاف ہیں جبکہ پاکستان کے دفاع کے اعتبار سے پاکستانی فوج بڑی موثر قوت ہے اور آئی ایس آئی عالمی سازشیں جو پاکستان کے خلاف تیار کی جاتی ہیں ان کو ناکام بنا سکتی ہے۔ اس لئے عالمی قوتیں ان کے خلاف ہیں مگر میر جعفر اور میر صادق عالمی قوتوں سے پیسے لے کر پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں۔ ان میں سیاسی شخصیات بھی ہیں اور میڈیا بھی ہے۔ بعض سیاسی لوگ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ارادہ یا بغیر ارادہ کسی کے خلاف کام کر رہے ہوں۔

دیگر ممالک کی طرح ہندوستان بھی اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب بھی پاکستان کو ہم روایتی جنگ سے نہیں ہرا سکتے اسی وجہ سے انہوں نے پاکستان میں پیسے سے پجاریوں کو خرید لیا ہے وہ نظریہ پاکستان اور اسلامی اقدار کے خلاف تسلسل کے ساتھ پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ان تمام طاقتوں نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ 2025ء تک پاکستان تقسیم ہو جائے گا جس کے نقشے بھی جاری کر دیے گئے ہیں۔

ایک سیاسی جماعت کے ذریعے انہوں نے گزشتہ پانچ سالوں سے مختلف ممبران قومی اسمبلی میڈیا اور مختلف این جی اوز کے ذریعے قومی سلامتی کے اداروں کو نشانہ بنانا شروع کر رکھا ہے۔ وہ فوج جو بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اندرونی طور پر دہشت گردی کا شکار تھی اور ہے۔ اس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اور دولت کے پجاریوں کے ذریعے دشمن ملکوں کے کئی

ایجنٹوں کو پاکستان میں داخل کیا گیا جنہیں پاکستانی سکیورٹی ایجنسیوں سے کلیئر نہیں کرایا گیا۔ ایسے ناپسندیدہ ہزاروں لوگوں کو ویزے جاری کیے گئے۔ اس وقت کچھ اہم شخصیات کے ذریعے دوبئی سے بھی سینکڑوں دشمن کے ایجنٹوں کو پاکستان میں داخل کیا گیا۔ جن کی مثال ریمنڈ ڈیوس اور اس کے ساتھیوں کی سب کے سامنے ہے۔ ایسی جماعت جس کے کھرب پتی سربراہ جن کے تمام کاروبار بیرون ممالک میں ہیں اور جن کا بیشتر سرمایہ غیر ملکی بنکوں میں ہے۔ وہ اپنا سرمایہ پاکستان نہیں لاتے ہیں وہ غیر ملکی پالیسیاں اپنانے پر کیوں مجبور ہیں۔ ایک طرف وہ 50 ارب ڈالر کے غیر ملکی جن میں سے 35 ارب ڈالر عوامی جمہوریہ چین کے پراجیکٹ سرِ فہرست ہیں کو تیزی سے جاری کئے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف مغربی ممالک کے دباؤ اور چند بااثر دوستوں کی وجہ سے پاک ایران گیس منصوبے کو تاخیری حربوں کا شکار کئے ہوئے ہیں۔ ایران سے وہ کہتے ہیں کہ دو بلین ڈالر میں وہ پائپ لائن خود تعمیر کر کے دیں کیونکہ ہم امریکی دباؤ اور پابندیوں کے ڈر کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ مغربی ممالک اور بھارت کو یہ ڈر ہے کہ یہ پائپ لائن مختصر ترین راستے سے چین چلی جائے گی۔ اس لئے وہ اس راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔

اگر امریکہ، روس، جاپان اور کینیڈا بھارت کے ساتھ ایٹمی تعاون کا عملی سمجھوتہ کریں تو بالکل ٹھیک اور اگر پاکستان اور چین کا تعاون ہو تو وہ عالمی طاقتوں کو منظور نہیں۔ وہ طاقتیں بھی اپنے زرخرید ضمیر فروش لوگوں کے ذریعے کالا باغ جیسی سستی ترین بجلی کے تکنیکی منصوبے کو بھی سیاسی مسئلہ بنوا دیتے ہیں۔ ان کے ایجنٹ اعلان کرتے ہیں کہ ہماری لاشوں سے گزر کر ڈیم بنے گا اور ہم نوشہرہ کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔ جب کہ یہی ایجنٹ بھارت کے فرخا بیراج، کشن گنگا بیراج وغیرہ پر بالکل

خاموش ہیں۔ سابقہ دور میں حکومت میں عالمی ثالثی عدالت میں حکومت نے اپنے نان پروفیشنل لوگ کیس لڑنے کے لئے بھیجے جو سیر سپاٹوں میں مصروف رہے اور کیس ہار کر واپس آ گئے جبکہ بھارت نے اپنے ماہرین کو بھیجا تھا جو اس کے تکنیکی ماہرین تھے اور وہ کیس جیت کر گئے اور اب نیلم جہلم پروجیکٹ کو روکنے کا مطالبہ بھی پورا کیا جانے لگا ہے اور اب یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ انڈس واٹر ٹریٹی کا سربراہ بھی غیر ملکی ایجنٹ تھا جو اپنا نام E.C.L میں ہونے کے باوجود پاکستان سے باعزت طور پر کینیڈا بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

ان تمام حالات میں پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظوں، ریسکیو ایجنسیوں، افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ تمام تر مجبوریوں کے باوجود ملک کے تحفظ کی ذمہ داری نبھائیں اور یہ ساری قوتیں ہیں۔ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کے خلاف درج ذیل پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ میڈیا کے مخصوص گروپ کے ذریعے بھی اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بھی۔

1- یہ دنیا کی خوفناک ترین دہشت گرد فورس ہے۔

2- اس نے ہزاروں لوگوں کو ماورائے عدالت قتل کر دیا ہے۔

3- ہزاروں لوگ اس نے لاپتہ کئے ہوئے ہیں۔

4- یہ کشمیر کے مجاہدین کو عسکری تربیت دے کر ہندوستان کے خلاف لڑا رہی ہے۔

5- مسئلہ کشمیر اور بھارت کے ساتھ دوستی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

6- اس کی ایجنسیاں قانون سے بالاتر ہیں اور کسی کو جواب دہ نہیں ہیں۔

7- USSR کے خلاف جہاد میں جہادیوں کی انہوں نے مدد کی۔ یہ کمشنت کی تو اور اسے کو اور کرنے

کرتے ہوئے گرم پانیوں میں جانے سے روکا جس کی وجہ سے 30 لاکھ سے زیادہ افغانی پاکستان میں آ گئے اور واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔

8۔ ملک کا 80 فیصد بجٹ کھا رہے ہیں جس کی وجہ سے ملک ترقی نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔

اس پروپیگنڈہ میں تیزی آئی کبھی منافق لوگوں کی کتابوں کے ذریعے، کبھی مغربی میڈیا کی رپورٹوں کے ذریعے اور کبھی بعض پاکستانی سیاست دانوں کے بیانات کے ذریعے۔ ایک میڈیا گروپ جو اس میں پیش پیش رہا اور ان کے حواریوں کے بیانات آپ سب لوگ ٹی وی پر دیکھتے رہے ہیں اب جبکہ بھارت میں نریندر مودی جیسا مذہبی انتہا پسند فرد جو مسلمانوں کا کٹر دشمن ہے برسر اقتدار آ چکا ہے۔ جو سانحہ گودھرہ گجرات کا خالق ہے۔ اس کی دعوت ملنے پر ہمارے حکمران دوڑنا چاہ رہے تھے۔ بقول ان کے انہیں تو مینڈیٹ ہی ہندوستان سے دوستی کا ملا ہے۔ پیپلز پارٹی، جے یو آئی، ایم کیو ایم، اے این پی نے خوشی کا اظہار کیا اور امن کی آشا کے گیت گائے گئے۔ عمران نے بھی خوشی کا اظہار کیا لیکن جماعت اسلامی اور پاکستانی عوام اس پر پریشان ہو گئے کیونکہ وہ حکمرانوں کی طرح مصلحت کو نہیں جانتے وہ ہندو کی ذہنیت کو خوب جانتے ہیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق جب اپنے بھائی کے ذریعے افواج پاکستان کی رائے لی گئی تو انہوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے انہیں حقائق سے آگاہ کیا اور کہا گیا کہ اگر جانا ہی ہے تو اپنے کسی وزیر کو بھیج دیں، ایسے موقع پر وزیراعظم کا جانا ان کی شایان شان نہیں ہے۔ وہاں جو ہونے والا ہے وہ کوئی زیادہ بہتر نہیں ہوگا۔

افواج پاکستان کو وہاں کے حالات کا درست اندازہ تھا کہ بھارتی وزیراعظم کیا کرنے جا رہا ہے مگر نواز شریف اس کے باوجود خود گئے۔ وہاں حامد کرزئی نے جو گل کھلائے دو دنیا نے دیکھا بھی اور سنا بھی۔ نریندر مودی نے پانچ مطالبات کر کے وزیراعظم کو بے بس کر دیا جبکہ بھارت کا ایک اعلیٰ عہدیدار عدالت میں بیان حلفی جمع کروا چکا ہے کہ بمبئی حملہ خود بھارتی ایجنسیوں نے مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لئے کرایا تھا۔ یہ مطالبات مضحکہ خیز اور پاکستانی فوج کو نشانہ بنانے کے علاوہ کچھ نہ تھے۔ ہمارے بعض سیاستدان کہہ رہے تھے کہ وزیراعظم بننے کے بعد مودی بدل جائے گا مگر اس نے اپنا اصلی ہندو ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ بھارت کی موجودہ صورت حال میں وہ سیاستدان اب کیا کہیں گے؟ اس نے بھارتی آئین میں کشمیر کے لئے دفعہ 370 کو ختم کر دیا۔ بھارت میں قرآن پر پابندی لگانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بھی سامنے آ چکا ہے۔ ہندوستان اور اس کے مغربی اتحادی آقا کیا چاہتے ہیں؟

1۔ پاکستان کی حیثیت ایک طفیلی ریاست کی رہ جائے ہندوستان کی منڈی بن جائے۔

2۔ پاکستان مسئلہ کشمیر کو ہمیشہ کے لئے بھول جائے۔

3۔ مقبوضہ کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک کی حمایت سے خواہ وہ سفارتی یا اخلاقی ہی ہو دستبردار ہو جائے۔

4۔ پاکستان اور چین کے درمیان جو زمینی رابطے قائم کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان چین کے درمیان پائپ لائن، ریلوے لائن، شاہراہ قراقرم، گوادر کی بندرگاہ سے چین تک شاہراہ ریشم کے ترقیاتی منصوبے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

5۔ بلوچستان کو پاکستان سے علیحدہ کیا جائے اس کے ذخائر پر قبضہ کیا جائے۔

6۔ پاکستان کو ہمیشہ عدم استحکام کا شکار رکھا جائے۔

7۔ افواج پاکستان اور آئی ایس آئی کو مکمل طور سے بے بس کر دیا جائے۔ اس پر ملک میں اعلیٰ عہداروں پر تنقید

ان میں بھی اکثریت کا تعلق لاہور اور گوجرانوالہ ڈویژن سے ہے جبکہ سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا سے نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ پاکستان چلانا ہے تو دوسرے صوبوں کو بھی اہمیت دی جائے۔ 1971ء سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ دوسرے صوبوں کی اپنی ہی جماعت یا اتحادی جماعتوں پر اعتماد کریں ان کو بھی نمائندگی دیں تاکہ ملک میں تعصب پیدا نہ ہو۔ بین الاقوامی سازشوں کو سمجھیں اور ان کا تدارک کریں۔

سادہ پاکستانی قوم سے گزارش ہے کہ دشمنوں کے آلہ کار نہ بنیں جو اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کی حفاظت کے لئے سوچیں۔ آپس میں بھائی چارہ اتفاق پیدا کریں ان سازشوں کا مقابلہ اتفاق اور اتحاد سے ہی ممکن ہے۔ اپنی مسلح افواج پر اعتماد کریں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں یہ لوگ آپ میں سے ہی ہیں۔ اس جانب سے اندازہ ہو رہا ہے کہ حالات بہتری کی طرف نہیں جا رہے جبکہ ہندوستان ایک خطرناک وار کا آغاز کر چکا ہے۔ عقلمندوں کے لئے اشارہ ہی کافی ہے جبکہ حکمران ذاتی مفادات کے تحفظ کے لئے سرگرم ہیں۔

***

انتقال

رانا محمد شاھد مرتب "اِدھر اُدھر سے" کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

ادھر اُدھر سے

دُنیا بھر سے دلچسپ و عجیب خبریں

رانا محمد شاہد ....0345-7094506............

نئی باتیں یاد رکھنے کے لئے پرانی یادیں بھلانا ضروری ہے

نئی زبانوں سمیت اور بہت ساری چیزیں سیکھنے میں بچے بڑوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑوں کے دماغ ''بھرے'' ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ وہ پرانی باتوں کو یاد رکھتے ہیں اور یوں اس میں نئی معلومات کے لئے جگہ نہیں رہتی۔ یہ تحقیق ایک امریکی جریدے سائنٹفک امریکن مائنڈ نے کی تھی۔ جریدہ کہتا ہے کہ کوئی بات یا چیز یاد کرنے کے لئے پرانی یادوں کا ختم ہونا ضروری ہے۔ حالیہ تحقیق کے مطابق بڑوں کے دماغ میں ایسے لحمیات ہوتے ہیں جو ان کو پرانی باتیں بھولنے نہیں دیتے جب بھی انسان کچھ نیا سیکھتا ہے تو اس کے دماغ کے خلیوں میں کچھ نئے کنکشن پیدا ہوتے ہیں اور جب خلیوں کے بیچ یہ رابطے کمزور ہو جاتے ہیں تو یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے بے کار معلومات نئی معلومات کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ فوری اور قریب کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔

چھوٹے قد کی گوریاں باوفا ہوتی ہیں: چھوٹے قد

کی خاتون باوفا اور تاعمر ساتھ نبھانے والی ہوتی ہے۔ اس کا دعویٰ گزشتہ دنوں لندن کی اوپن یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہونے والی ایک تحقیق میں کیا گیا۔ تحقیق میں 1958ء سے پیدا ہونے والے دس ہزار جوڑوں پر تحقیق کی گئی جس کے مطابق چھوٹے قد کی حامل خواتین لمبے قد کی خواتین کی نسبت شوہروں کا ساتھ زیادہ دیر تک نبھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کے معاملے میں بھی حساس ہوتی ہیں۔ تحقیق کے مطابق برطانوی خواتین کا اوسط قد 5 فٹ 4 انچ ہے۔ لیکن تحقیق میں 5 فٹ 2 انچ کی حامل خواتین کی اکثریت باوفا ثابت ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے ایک اور انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ چھوٹے قد کی حامل برطانوی خواتین عموماً چھ فٹ قد تک کے حامل مردوں کے ساتھ شادی کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک بڑے قد کے حامل مرد چھوٹے قد والوں کی نسبت زیادہ باوفا اور مخلص ہوتے ہیں۔

پالتو کتے نے مالک کی جان بچائی: جانوروں کی وفاداری کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں اور یہ اکثر اوقات اپنے مالکان کی زندگی بچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ایسا ہی واقعہ ایک امریکی خاتون کے ساتھ پیش آیا۔ جس کی جان اس کے کتے نے بچائی۔ امریکی میڈیا کے مطابق ریچل نامی چالیس سالہ خاتون اپنے گھر کے کچن میں کام کے دوران چیونگم چبا رہی تھی کہ اچانک چیونگم اس کے حلق میں پھنس گئی اور اس کے لئے بولنا تو دور کی بات سانس لینا بھی مشکل ہو گیا اور وہ تکلیف کے باعث دہری ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

اس کا پالتو کتا جو پاس ہی کھڑا تھا، نے ایسی صورت حال دیکھ کر فوراً اپنی مالک پر چھلانگ لگائی اور اس کی کمر پر زور زور سے اپنی ٹانگوں کی مدد سے دھکے مارنے شروع کر دیے۔ اس کی اس کوشش کے نتیجے میں چیونگم جو ریچل کے حلق میں پھنس گئی تھی، باہر زمین پر آ گری۔ ریچل نے اپنے کتے کے اس کارنامے کے متعلق سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر کہا ہے کہ اس کا کتا حقیقت میں ایک ہیرو ہے اور اس نے اس وقت میری جان بچائی جب میں موت کے منہ میں تھی اور کسی کو اپنی مدد کے لئے نہیں پکار سکتی تھی۔

اے ٹی ایم مشین سے دودھ نکلنے لگا: اے ٹی ایم مشین سے پیسے تو نکلتے ہی ہیں لیکن اگر دودھ کے پیکٹ بھی اے ٹی ایم مشین سے نکلنے لگیں تو کیسا ہو گا۔ جی ہاں Milk any time اے ٹی ایم مشین جسے بھارت کی ریاست گجرات میں مقامی کمپنی نے تیار کیا ہے۔ اس سے دودھ کے پیکٹ کسی بھی وقت خریدے جا سکیں گے۔ اب دودھ والے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس مشین میں دس روپے ڈالیں اور نین سو ملی لیٹر دودھ خرید لیں۔ مشین کو بھارت کے دیگر شہروں میں بھی متعارف کرایا جائے گا۔

برف پر دوڑنے والی سائیکل: برف باری کے بعد سڑکوں پر جمی برف پر پھسلن سے سائیکل چلانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جس کے باعث کئی حادثات بھی رونما ہوتے ہیں۔ نیدرلینڈ میں چند ذہین افراد نے اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے سائیکل کے ٹائروں کے لئے ایسی منفرد بائیکس سپائیکس تیار کی ہیں جن کی بدولت اب شدید برف باری میں بھی سائیکل چلانا آسان ہو گیا ہے۔ ان بائیک سپائیکس کو پلاسٹک سے بنا کر ان پر کانٹوں کی طرح ابھرے ہوئے مضبوط ٹکڑے نمایاں کئے گئے ہیں جو سڑک پر جمی برف میں دھنس کر ٹائروں کو پھسلنے سے محفوظ بناتے ہیں۔ برف باری ختم ہونے کے بعد ان سپائیکس کو ہٹا کر سائیکل سڑکوں پر چلنے کے قابل ہو جائے گی۔

نوجوان نے مسلسل ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کار جیت لی: چینی باشندے دنیا کو حیرت میں مبتلا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ چین کے صوبے جیان ژی میں

ایک ٹانگ پر سب سے زیادہ دیر تک کھڑے رہنے کا مقابلہ ہوا جس میں پورے ملک سے ڈیڑھ سو سے زائد نوجوانوں نے شرکت کی۔ اس مقابلے کا اہتمام ایک کار ساز کمپنی نے کیا تھا۔ فائنل مرحلے میں صرف 20 نوجوان رہ گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقابلہ نوجوانوں نے خوب کیا مگر مقابلہ دو ڈیجی ٹی نوجوان نے جیتا۔ جس نے مسلسل سات گھنٹے اور چھپن منٹ تک ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا مظاہرہ کیا۔ کئی شرکا نقاہت کے باعث گر گئے۔ جنہیں طبی امداد دی گئی۔ اس نوجوان نے یہ کارنامہ انجام دے کر ایک بیش قیمت بی ایم ڈبلیو کار تو جیت لی لیکن وہ بھارتی شہری سریش کا ایک ٹانگ پر مسلسل 76 گھنٹے کھڑے رہنے کا عالمی ریکارڈ نہیں توڑ سکا۔

باپ جان، پاپا اور ڈیڈی

پاکستان میں 70 فیصد بچے اپنے والد کو "بابا جان"، 13 فیصد "پاپا" جبکہ 9 فیصد "ڈیڈی" کہتے ہیں۔ ایک معروف سماجی تنظیم کی جانب سے جاری کردہ دلچسپ اعداد و شمار میں بتایا گیا ہے کہ 2 سال سے 39 سال کی عمر تک بچے بچیاں، لڑکے لڑکیاں اپنے والد کو سب سے زیادہ بابا جان کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مغرب زدہ معاشرے کا شکار اولاد اپنے والد کو "پاپا" اور "ڈیڈی" کہتی ہیں۔ اسی طرح سے 13 فیصد اپنی ماں کو "مام"، 48 فیصد "ممی جان" کہہ کر پکارتی ہیں۔ سماجی تنظیم کا کہنا ہے کہ بچیاں اپنے والد سے بے پناہ محبت کی وجہ سے بابا کہہ کر پکارتی ہیں جبکہ لڑکے بھی ان کی دیکھا دیکھی والد کو بابا جان کہتے ہیں۔ 3 فیصد والدین خود ہی اپنے بچوں کو پاپا جانی، پاپا اور ڈیڈ کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

چار لاکھ کتابوں کا خلاصہ: حضرت شیخ منیریؒ نے اپنی اسناد میں تحریر فرمایا کہ میں نے چار لاکھ کتابوں کا مطالعہ کر کے ان میں سے چار باتیں انتخاب کیں۔ اپنے ذہن سے کہتا ہوں کہ (1) اے شخص! اگر تو عبادت کرتا ہے تو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے عبادت کر ورنہ اس کا دیا ہوا رزق کھانا چھوڑ دے۔

(2) اے شخص! جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تجھ کو منع فرمایا ہے اس سے باز رہ ورنہ اس کی زمین سے باہر نکل جا۔

(3) اے نفس! جو کچھ اللہ نے قسمت میں لکھ دیا ہے اس پر راضی ہو ورنہ اللہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا پروردگار ڈھونڈ لے۔

(4) اے نفس! اگر تو کسی گناہ کا ارادہ کرے تو پہلے ایسی تجویز کر جہاں تجھ کو خدائے پاک نہ دیکھے۔ ورنہ اگر نجات کی خواہش ہے تو ہرگز گناہ کا نام نہ لے۔

پیسے دیں...... پیار و محبت خریدیں: کہا جاتا ہے کہ پیار و محبت جیسے پرخلوص جذبوں کو دولت سے نہیں خریدا جا سکتا۔ تاہم دورِ جدید میں تمام تصورات بدل رہے ہیں اور حال ہی میں چین کے ایک سکول میں نئی سکیم متعارف کرائی گئی ہے جس کے تحت بچوں کو صرف 13 ڈالر ماہانہ کی ادائیگی پر سکول میں روزانہ ٹیچر کی جانب سے جپھی ملا کرے گی۔ تعلیم کے نام پر کاروبار تو بہت سے ملکوں میں جاری ہے اور عام طور پر نجی سکول نت نئی سکیمیں متعارف کرا کر اضافی فیس وصول کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں چین میں یہ سکیم شروع کی گئی ہے جس میں 13 ڈالر ماہانہ کی ادائیگی پر ایک مرتبہ سکول پہنچنے پر اور دوسری مرتبہ سکول سے چھٹی کے وقت جپھی دینے کو اپنی ایجوکیشن کا حصہ ہے اور اس کا مقصد بچوں کی خود اعتمادی کو بڑھانا اور انہیں تحفظ و پیار کا احساس دینا ہے۔

یقین کامل: ایک بزرگ سفر پر جانے لگے تو بیوی سے کہا۔ "میں کئی ماہ تک شہر سے دور رہوں گا تمہارے لئے کس قدر خرچ دے کر جاؤں؟" بیوی نے جواب دیا۔ "جس قدر آپ کو میری زندگی منظور ہے"۔ بزرگ نے کہا۔ "تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں تو نہیں ہے"۔ تو بیوی نے

روزی بھی آپ نے ہاتھ میں نہیں لی ہے"۔ بیوی نے جواب دیا۔ بزرگ چلے گئے تو ان کی بیوی سے ایک عورت نے پوچھا۔ "حضرت آپ کے واسطے کتنی روزی چھوڑ گئے؟" بیوی نے جواب دیا۔ "حضرت تو خود ہی روزی کھانے والے تھے، جو کھانے والا تھا وہ چلا گیا اور جو دینے والا ہے وہ کہیں نہیں گیا"۔

مالٹا کھائیں...... زیادہ عرصہ تک جوان رہیں: ایک مالٹا روزانہ کھانے سے طویل عرصے تک جوان نظر آنے میں مدد ملتی ہے۔ امریکی ماہرین نے ایک تحقیق کے نتائج جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ مالٹا میں تیزابی مواد کثیر تعداد میں پایا جاتا ہے جس سے چہرے پر کیل مہاسے اور چھائیاں نہیں ہوتیں اور چہرہ شفاف و تر و تازہ دکھائی دیتا ہے۔ روزانہ ایک مالٹا کھانا اگر معمول بنا لیا جائے تو اس سے 50 سال میں بھی جوان نظر آنے میں مدد ملتی ہے۔ ماہرین کے مطابق مالٹے میں وٹامن بی 6 اور میگنیشیم پایا جاتا ہے جس سے ہیموگلوبن کی نشوونما میں مدد ملتی ہے اور اس سے بلڈ پریشر بھی قابو رہتا ہے۔ مالٹے میں وٹامن سی بھی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے جس سے چہرے پر قدرتی نکھار آتا ہے۔

بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے والے: بیوی کی ہر بات ماننے والے شوہر اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں۔ ایک نئی تحقیق میں انکشاف ہوا ہے کہ شوہروں کا بیویوں کی ہاں میں ہاں ملانے کا رویہ انہیں اندر سے دکھی بنا دیتا ہے۔ محققین اس بات کا جائزہ لینا چاہتے تھے کہ بیویوں کی رائے سے اتفاق کرتے رہنے کی عادت کیا شادی شدہ زندگی میں بہتری لا سکتی ہے؟ آکلینڈ یونیورسٹی کے محققین کی جانب سے تجربے میں شامل شادی شدہ مردوں کے گروپ سے کہا گیا کہ دوران تجربہ وہ اپنی بیویوں کی ہر رائے اور مطالبے سے اتفاق کریں۔ اگرچہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی بیوی کی رائے صحیح نہیں تو پھر بھی وہ اپنی بیوی سے مخالفت یا بحث نہ کریں۔ "برٹش میڈیکل جرنل" میں شائع ہونے والی تحقیق میں ماہرین نے اندازہ لگایا کہ صرف 12 روز کے تجربے نے دوران شوہروں کو بری طرح متاثر کیا۔ جس کی وجہ سے تحقیق کو بیچ میں ہی ترک کرنا پڑا۔ تحقیق میں شریک شوہروں کا کہنا تھا کہ اگرچہ بیویوں کے مطالبات پورے کئے گئے لیکن ساتھ ہی ان کے ہر کام پر بیویوں کی وجہ سے تنقید بڑھتی جا رہی تھی۔ محققین نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ کسی ایک فریق کی ضرورت سے زیادہ خوشی شادی شدہ زندگی پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

43 سال میں کیا گریجویشن مکمل: کسی شخص کو گریجویشن مکمل کرنے میں 43 سال لگ سکتے ہیں۔ مائیکل نامی شخص نے اپنی گریجویشن مکمل کرنے میں 43 سال لگا دیئے۔ مائیکل نے 1971ء میں 22 سال کی عمر میں برطانیہ کی اوپن یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا لیکن پھر وہ اپنی زندگی اور کاروباری امور میں اتنا مصروف ہو گیا کہ اس کے لئے ڈگری وقت پر حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب جبکہ وہ خود پوتوں اور نواسوں والا ہو گیا تو اس نے دوبارہ ڈگری کے حصول کے لئے امتحان دیا اور کامیاب ہو گیا اور 65 سال کی عمر میں سائنس گریجویٹ بن کر دنیا کو یہ پیغام دیا کہ علم کسی بھی عمر میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شیطان کو جلانے کا تہوار: دنیا کے مختلف ممالک میں شیطان سے نفرت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ وسطی امریکہ کے ملک گوئٹے مالا میں شیطان سے نفرت کا اظہار اسے جلا کر کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر سال شیطان کو جلانے کا سالانہ تہوار منایا جاتا ہے اور سب لوگ شیطان کے پتلے کو آگ لگاتے ہیں۔ اس تہوار میں لوگ اپنے گھر کا پرانا سامان نکال کر سڑکوں پر ڈھیر لگا دیتے ہیں جس کے بعد اس سامان سے شیطان کے پتلے بنا کر انہیں آگ لگا کر اس رسم کو پورا کیا جاتا ہے۔

غزل

انداز وہی ہیں سبھی، اطوار وہی ہیں
مدت گزر گئی، ترے انکار وہی ہیں

میں غم کے جزیروں سے یوں ہجرت نہ کر سکا
کشتی نئی ضرور ہے، پتوار وہی ہیں

کیسے کہوں کہ حال کہن اب بدل گیا
دکھ درد کے وہ ڈھیر وہ انبار وہی ہیں

میری ضرورتوں کا سفر رک نہیں سکا
کام آ سکے نہ اب بھی میرے یار وہی ہیں

تیرے غموں کو اب بھی خوشی سے خرید لوں
گو تو بدل گیا، میرے افکار وہی ہیں

مجھ کو بس اس کے ہاتھ میں پتھر برا لگا
ورنہ تو ستم گر مرے ہر بار وہی ہیں

میری ہر اک اپیل بھی یوں رائیگاں گئی
حاکم، وکیل، منصف و سرکار وہی ہے

امسال بھی خلوص کا بھاؤ وہی رہا
بدلے نہیں بازار، خریدار وہی ہیں

میں پھر ستم ظریف کی چالوں میں آ گیا
حالانکہ داؤ پیچ وہی، وار وہی ہیں

کس نے کہا کہ وقت نے عاقب بدل دیا
اس کی وہ ضد وہ ہٹ، انا، تکرار وہی ہیں

(ریاض عاقب کوہلر کے مجموعہ کلام "روداد کوہلر" سے انتخاب)

غزل

آیا تھا پچھلا سال تو رنگ جفا لئے
اب سال نو بھی دیکھئے آتا ہے کیا لئے

ابھرے تو غیروں نے بھی نچھاور کیے تھے پھول
ڈوبے تو دوستوں نے بھی پتھر اٹھا لئے

کچھ خواب تھے کہ جا چکے اس بے وفا کے ساتھ
کچھ درد تھے جو ہم نے گلے سے لگا لئے

مل ہی گئے ہیں راہ میں گر اتفاق سے
برسوں کے آشناؤں نے چہرے چھپا لئے

فرصت ملے تو خاک نشینوں سے مل کبھی
بیٹھے ہیں یہ بھی لوگ پر کیمیا لئے

اس آس پر کہ ہونے لگی ہے سحر ضیاء
لوگوں نے اپنے گھروں کے دیئے بھی بجھا لئے

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟
پنجاب کے ساتھ ساتھ برصغیر کی اصل تاریخ کا حال

شیش محل میں قتل

ماگھ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، سردی اب بھی زوروں پر تھی، راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو گئے تھے۔ ایک دو دن سورج چہرہ دکھائے تو راتیں اور بھی لمبی اور ٹھنڈی محسوس ہوتی تھیں۔ ایسی ہی ایک رات کو طہماس خان پہریداروں کے کیمپ میں الاؤ کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا، اس نے شام ڈھلے شہباز خان کو ملاقات کا پیغام بھجوایا تھا۔ صبح کی اذان ہونے کو تھی مگر شہباز خان ابھی نہیں آیا تھا۔ مغلانی بیگم شہباز خان پر سب سے زیادہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ پرویز بیگ اور سرفراز خاں کے بعد اگر کوئی بیگم کے منصوبوں میں اس کے لئے کام کرتا تھا تو وہ شہباز خان تھا۔ انحصار اور [illegible] یہ خوبصورت نوجوان بھی میر منو کے گھریلو زر خرید ملازمین کے مردانہ حصہ میں پل کر جوان ہوا تھا۔ طہماس خان کی اس سے دوستی بھی تھی اور رقابت بھی۔ گل بنفشہ شہباز خان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی تھی، طہماس خاں کو یہ پسند نہیں تھا۔ گل بنفشہ اس سے نفرت کرتی تھی اور خود غرض سمجھتی تھی جبکہ شہباز خاں جوانی اور حسن کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود صاف دل تھا۔ اس میں اعلیٰ کردار کی وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو حکمرانوں کے محلوں کی ورکنیزیں پسند کرتی ہیں جو سکینڈلوں سے دور رہنا چاہتی ہیں۔ طہماس خاں کے دل میں اس کے لئے کوئی محبت نہیں تھی لیکن جس کام پر خواجہ مرزا نے اسے لگایا تھا۔ اس کی ذاتی ترقی کا دارومدار اس میں کامیابی پر تھا اور یہ کامیابی شہباز کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی، وہ اس کے ذریعے بیگم کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صبح کی نماز کے بعد مغلانی بیگم نے قرآن اور دیوان حافظ منگوائے۔ تلاوت کے بعد دعا کی اور دیوان حافظ سے فال نکلوائی کہ اس کے مقدر کے بارے میں اشعار کیا کہتے ہیں۔ پاس کھڑی گل بنفشہ کا چہرہ کھل گیا۔ وہ اپنی مالکہ کے چہرے کے تاثرات سے آنے والے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ مغلانی بیگم نے قرآن مجید اور دیوان حافظ اس کے حوالے کئے اور خود سجدے میں گر گئی۔ کافی دیر بعد جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو گل بنفشہ نے بتایا کہ شہباز خان قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔ دن کے اس حصے میں ملازمین کو قدم بوسی کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ مغلانی بیگم نے کچھ سوچ کر اجازت دے دی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ شہباز خان نے فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر بتایا کہ طہماس خاں باہر کمانڈنٹ کے خیمے میں موجود ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔

"کوئی مضائقہ نہیں اس کی سنیں اور اپنے اپنے دل میں رکھیں"۔ مغلانی بیگم نے اجازت دے دی۔

شہباز کو دیکھتے ہی طہماس خاں لپک کر اس سے لپٹ گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، پہریداروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ طہماس خاں شہباز کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور اپنی دوستی اور خلوص کے اوراق کھول کھول کر پیش کرنے لگا۔ مغلانی بیگم کی خدمت کے لئے اپنی جان پیش کر دی۔

"نواب مغفور اور بیگم عالیہ کے اس غریب پر اتنے احسانات ہیں کہ جان دے کر بھی بدلہ نہیں چکا سکتا، اس مشکل میں ان کے کام آ جاؤں تو خوش قسمت ہوں گا"۔

"میں آپ کی خواہش اور جذبہ بیگم عالیہ تک پہنچا دوں گا"۔ شہباز نے جواب دیا۔

"میں رات بھر ان مردودوں کے درمیان بیٹھا رہا، جب تک بیگم عالیہ مجھے قدم بوسی کی اجازت نہیں دیں گی میں حویلی کے دروازے پر بیٹھا رہوں گا"۔ طہماس خاں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"بیگم عالیہ کا جو بھی حکم ہو گا تم تک پہنچا دوں گا"۔ شہباز نے کہا اور واپس چلا گیا۔

طہماس خان کماندار کے خیمے میں واپس آ گیا، وہ ایک دوسرے کے ماضی اور حال سے واقف تھے۔

تھوڑا دن چڑھے شہباز آیا اور طہماس خان کو ساتھ حویلی کے اندر لے گیا۔ نشست گاہ میں قدم رکھتے ہی طہماس خان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فرشی سلام کر کے اس نے بیگم کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ شہباز خان ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ گل بنفشہ کمرے میں داخل ہوئی اور طہماس خان کو سجدہ ریز دیکھ کر جلدی سے واپس لوٹ گئی۔

"ہم نے اپنے گھر میں پرورش پانے والوں کو ایسی تربیت نہیں دی تھی، ہمیں افسوس ہے کہ تم چند ہی دنوں میں ہماری تربیت بھول گئے۔ کوئی مشکل آن پڑی ہے تو کھڑے ہو کر پیش کرو، ہم جو دور کر سکتے ہیں کریں گے"۔ مغلانی بیگم نے حاکمانہ انداز میں کہا۔

طہماس خان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ "خادم کی سب سے بڑی مشکل حضور کی ناراضی ہے"۔

"ہم نے تمہیں کبھی ان لوگوں میں شمار نہیں کیا جن پر ہمیں ناراض ہونا چاہئے"۔

"خاکسار کے پاس ایک جان ہے اور وہ حاضر ہے"۔

"ہمیں جانوں کی نہیں انسانوں کی ضرورت ہے"۔

"بندہ کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا"۔

"جب ضرورت ہو گی ہم تم پر ضرور اعتماد کریں گے، تمہیں وظیفہ ملتا رہے گا، حویلی میں رہے تو تم بھی مفید ہو جاؤ گے۔ میاں خوش فہم سے رابطہ رکھو اور جو حکم وہ دیں اس پر عمل کرو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

طہماس خان نے ایک بار پھر فرشی سلام کیا اور الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تمہارے کسی عمل اور بات سے بھی ظاہر نہ ہو کہ ہم طہماس خان پر اعتماد نہیں کرتے۔ میاں خوش فہم کو سمجھا دو اور اس کا وظیفہ ادا کرواتے رہو"۔ مغلانی بیگم نے شہباز کو ہدایت کی۔

شہباز نے تعمیل میں سر جھکا دیا۔

"ہم سمجھتے ہیں نادر بیگ کے بچوں کی دیکھ بھال ٹھیک ہو رہی ہے"۔ بیگم نے پوچھا۔

"انہیں مسجد وزیر خاں کے عقب میں ایک مکان میں منتقل کر دیا گیا ہے اور دیکھ بھال نسلی بخش ہے"۔ شہباز خان نے بتایا۔ "نادر بیگ بھی دو روز تک آنے والے ہیں"۔

"ہمیں سرفراز خان کی ضرورت ہے"۔ بیگم نے کہا۔

"ملک سجاول کو حضور کا پیغام پہنچا دیا گیا ہے"۔ شہباز نے جواب دیا۔

"طہماس خان کو کل کسی وقت پیش کرو، وہ یہ نہ جانے کہ ہمارا حکم ہے۔ اس پر ظاہر کرو کہ تم اس سے دربار اور بھکاری خان کے بارے میں خبریں جاننا چاہتے ہو"۔

شہباز نے ایک بار سر جھکایا اور واپس لوٹ گیا۔

طہماس خان دو روز سے متفکر تھا۔ شہباز اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ بھکاری خان اور خواجہ مرزا خان کے باہمی تعلقات کیسے ہیں، مغل سرداروں اور امراء کا کیا رویہ ہے، نئے حکمران کے بارے میں اہل شہر کی کیا رائے ہے؟ طہماس خان بھی یہی چاہتا تھا کہ مغلانی بیگم کے ملازم اس سے دربار، شہر، امرا، اور نئے حکمرانوں کے بارے میں کھل کر بات کریں تاکہ وہ ان کی سوچ کا اندازہ کر سکے۔ اس نے بڑی تفصیل سے حالات بتائے اور دعوہ کیا کہ وہ کل

بھکاری خان کے بارے میں اور بھی خبریں لائے گا۔

میاں خوش فہم نے طہماس خاں کو حویلی سے باہر جاتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ "مرزا اتنے روز کہاں غائب رہے؟ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اس بے نیازی پر بستر مرگ سے لپٹ جائے گا"۔ مرزا کا خطاب حکمران نسل کی اعلیٰ کارکردگی پر دیا کرتے تھے، کسی گھریلو ملازم کو "مرزا" کہہ کر مخاطب کرنے میں جو طنز پوشیدہ تھا اس کے زخم چھپانے کو طہماس خاں نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "میاں بندہ تو خود بستر مرگ سے اٹھ کر آیا ہے"۔

"اللہ شفا دے، مرزا کسی حکیم کو نبض دکھایا ہوتا، ہم جانتے تو خود مزاج پرسی کو حاضر ہوتے۔ اس جمعرات کو پانچ پیسے کا تیل شاہی مسجد بھجوا دیں، کسی بات کہتے ہیں شکرانہ کے سو نفل ادا کریں"۔

"بندہ کے حق میں آپ کی دعا ہی شفا ہے، اپنی دعاؤں میں ایک اور کا اضافہ کر لیجیے"۔

"ہم ہی کیا مرزا اس حویلی کے سب باسی دعا کے لئے وضو کر رہے ہیں۔ آپ کا چہرہ تو نصیب ہوا، ہم امید رکھیں کہ اب آپ نایاب نہ ہوں گے"۔

"آپ کا حکم ہو تو ہر روز حاضر خدمت ہو جاؤں!"

"ہم کون ہیں حکم دینے والے۔ مرزا! آپ ذرا سفر سے پرہیز کریں، بیماری کی نقاہت بھی تو ہو گی۔ ہر روز نہیں دوسرے چوتھے چہرہ دکھانے آ جائیں تاکہ کسی کو زیادہ پریشانی نہ ہو"۔

"آپ کے ارشاد کی تعمیل سے اس ناچیز کی صحت بحال ہو جائے گی"۔

"ہم اپنا ارشاد واپس لئے لیتے ہیں، آپ اس کے بغیر ہی اپنا فرض نبھاتے رہیں، اللہ جزا دے گا"۔

"بندہ یقین رکھے کہ حضور کا کرم شامل حال رہے گا؟"

"ہمارے کرم سے حضور کو کبھی شکوہ نہ رہے گا"۔

میاں خوش فہم نے اس انداز میں کہا کہ طہماس خاں کے لئے کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ اس نے اجازت لی اور حویلی سے باہر نکل گیا۔

دوسری شام اس نے دربار امراء اور بھکاری خاں کی بہت سی خبریں شہباز کو سنائیں۔ بیگم پورہ سے واپسی پر وہ سیدھا نواب معبد کے پاس گیا تھا اور اسے اپنی کامیابی کی جملہ تفصیلات سے آگاہ کیا تھا مگر بھکاری خاں کے بارے میں شہباز کی دلچسپی اسے نہیں بتائی گئی، اس نے ترپ کا یہ پتا کسی مناسب موقعہ کے لئے بچا لیا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو بھکاری خان حالات سے مطمئن ہو گا، جیسے کیا ہے؟" شہباز نے پوچھا۔

"اس کے لئے اطمینان کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ خود میرزا خاں کا حالات پر قابو ہے، فوج اس کے ساتھ ہے، مسند حکومت بھی اس کے پاس ہے۔ سنا ہے بابا خان دلی کے وزیر سے اس نے قند حزر سے بھی تعلق قائم کر لیا ہے۔ دربار میں بھی سنا جاتا ہے۔ بھکاری خان اپنی غداری کی سزا کاٹ رہا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"اس کی سزا تو آنے والے اللہ کے حضور بھی ملے گی، نمک حرامی سب سے بڑا گناہ ہے"۔ شہباز نے کہا۔

"ہم نے تو دیکھا جس نے نواب مغفور کا نمک کھایا، اسی نے غداری کی"۔ طہماس خاں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کو کہا۔

"اللہ سب غداروں کو دوزخ میں ڈالے گا، ہمارا ایمان ہے"۔ شہباز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اس ایمان اور وفا کے لئے تمہیں وہاں ضرور اجر ملے گا، تم نے ہر حال میں بیگم عالیہ کی خدمت کی ہے"۔

"بیگم عالیہ تو تم پر بھی بہت شفقت فرماتی ہیں۔ کل ہی حکم دیا، طہماس خاں کا خیال رکھیں۔ ہم نے اسے اس

گھر میں بچے سے جوان ہوتے دیکھا ہے، وہ کبھی محسوس نہ کرے کہ اب یہ اس کا گھر نہیں"۔ شہباز اپنے منصوبے پر کام رہا تھا۔

"یہ بیگم عالیہ کا اس ناچیز پر کرم ہے، ان کے لئے خادم کی جان بھی حاضر ہے"۔ طہماس خاں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ بیگم صاحب نے شہباز کو طلب فرمایا ہے، وہ جانے کے لئے اٹھا تو طہماس خاں نے کہا۔ "خاکسار کا سلام پہنچا دیں تو نوازش ہوگی"۔

شہباز کے جانے کے بعد وہ اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ بیگم اب بھی اس پر شفقت فرماتی ہیں اور اس کی خطائیں معاف کر دی ہیں۔ اپنی دو روز کی کارکردگی اور کامیابی کا تجزیہ کر کے اس نے اپنے آپ کو شاباش دی۔

شہباز نے طہماس خاں سے ملنے والی ساری خبریں بیگم کو پہنچا دیں، درمیان میں سوال پوچھ کر وہ مزید معلومات حاصل کرتی رہیں۔ شہباز واپس جانے لگا تو کہا۔ "ہو سکے تو اسے اپنے پاس ٹھہرا لو، رات گفتگو سے مزید کھل جائے گا۔ ہمیں اس سے کچھ کام لینا ہے"۔

شہباز نے واپس آ کر دربار امراء اور بھکاری خاں کی بجائے اپنے بچپن اور گزرے ہوئے دنوں کی باتیں شروع کر دیں۔ طہماس خاں جاننا چاہتا تھا کہ اس نے بیگم عالیہ تک اس کا سلام پہنچایا تھا یا نہیں اور بیگم صاحب کا ردعمل کیا تھا مگر شہباز اس کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

"بیگم حضور کی صحت کیسی ہے؟" طہماس خاں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

"بیگم عالیہ کی طبیعت ناساز ہے مگر ہم کسی کو بتانا نہیں چاہتے۔ جب سے حویلی میں منتقل ہوئی ہیں بیمار رہتی ہیں۔ کوئی مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے افاقہ نہیں ہو رہا"۔ شہباز نے فکرمندی سے سرگوشی کی۔

"کسی حکیم سے دوائی تو لی ہوگی، بیگم عالیہ نے؟" طہماس خاں نے اس سے بھی زیادہ فکرمندی ظاہر کی۔

"حویلی میں حکیم کہاں؟ باہر سے حکیم منگوانے کے لئے وہ کسی سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں فرمائیں۔ ایسی درخواست خواجہ مرزا خاں کے پاس جائے گی، ان سے کوئی رعایت مانگنا انہیں گوارا نہیں"۔ شہباز خاں نے جواب دیا۔

"بیگم حضور کی زندگی ہمیں اپنی جانوں سے عزیز ہے۔ کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے اس بارے میں؟" طہماس خاں اور بھی پریشان ہو گیا۔

"تم جانتے ہو اس حویلی کے سب باسی قید کی حالت میں ہیں، وہ کیا کر سکتے ہیں؟" شہباز نے جواب دیا۔

"یہ ناچیز تو قید میں نہیں، بیگم حضور حکم دیں تو میں کوئی انتظام کروں، کماندار میرا دوست ہے"۔ طہماس خاں نے کہا۔

"بڑے نواب مغفور اور چھوٹے نواب مرحوم کو زہر دیئے جانے کے بعد سے بیگم عالیہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتیں"۔ شہباز نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

میاں خوش فہم کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میاں بہت پریشان تھا انہوں نے شہباز کو ایک طرف لے جا کر کوئی بات کی اور پھر دونوں بھاگتے ہوئے زنان خانہ کی طرف چلے گئے۔ ملازمین کو دوڑتے بھاگتے دیکھ کر طہماس خاں اپنے مستقبل کے نقشہ پر غور کرنے لگا۔ مغلانی بیگم کو کچھ ہو گیا تو خواجہ کے لئے اس کی کچھ بھی اہمیت نہ رہے گی۔ وہ خلوص دل سے بیگم کی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے دعا کرنے لگا۔ اگر یہ گھرانہ اجڑ گیا تو گل بنفشہ کہاں جائے گی؟ وہ ضرور شہباز کو پسند کرے گی۔ اگر میں کسی طرح کسی مرتبہ تک پہنچ جاؤں تو ضرور اسے حاصل کر لوں گا۔ بیگم عالیہ مر گئیں تو یہ امید بھی ختم ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر اس کی دعا میں خلوص بھر گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی اس کا دل چاہتا تھا وہ رات یہیں گزار دے۔ شہباز کو آتا دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ "بیگم عالیہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

شہباز نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "بیگم عالیہ کو بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔" اس نے سرگوشی کی۔ "یہ خبر حویلی سے باہر جانا انہیں گوارا نہیں۔"

"مرض کیا ہے؟" طہماس خان نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ معلوم نہیں، ان کا جسم بھی اسی طرح نیلا پڑ جاتا ہے جس طرح بڑے نواب اور چھوٹے نواب کو ہوا تھا۔"

"خدا نہ کرے بیگم عالیہ کو بھی......"

"ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔" شہباز نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"کیا تم بھی میرے خلوص پر شبہ کرتے ہو؟" طہماس خان نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" شہباز بھی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے بیگم عالیہ کے حضور لے چلو، میں ان کے پاؤں پکڑ کر التجا کروں گا کہ اجازت دیں تو حکیم لاؤں۔ میں ان کے پاؤں تب تک نہ چھوڑوں گا جب تک وہ مان نہ جائیں۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے، بیگم عالیہ اس دنیا میں ہمارا آخری سہارا ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔

"اب تو ان کی طبیعت اس قابل نہیں صبح بحال ہوئی تو میں درخواست کروں گا، ہو سکے تو تم یہیں ٹھہر جاؤ مگر کمرے سے باہر نہیں جانا ہوگا، کسی اور نے دیکھ لیا تو شکایت نہ کر دے۔"

مغلانی بیگم کی بیماری کی خبر سن کر خواجہ مرزا خاں پریشان ہو گیا اگر وہ قید میں مر گئی تو اس کی موت کا الزام اس پر آئے گا۔ شہر کے لوگ پہلے ہی بیگم سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ مر گئی تو عمادالملک بھی خاموش نہیں رہے گا۔ بھکاری خاں کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ شبہ تھا کہ اس نے میر منو کو زہر دلوا دیا تھا اسی وجہ سے امراء، درباری، علماء اور بادشاہ اس سے بدظن ہو گئے تھے۔ مغلانی بیگم کو زہر دینے کا شبہ اس پر کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کی قید میں ہے۔ اس نے فوری طور پر خواجہ سعید کو بلایا، جب دونوں بھائی کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو بھکاری خان کو مشورے کے لئے بلایا گیا۔ اگرچہ خواجہ مرزا خاں بھکاری خاں کے منصوبے اور تعاون سے حاکم پنجاب بنا تھا مگر دل سے وہ بھی مرزا خان سے ناخوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خواجہ مرزا خان اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے امیرالامراء کے عہدے پر بحال کر دے گا مگر اس نے بڑے عہدے اپنے بھائیوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ بھکاری خان نے یہ ناخوشی کسی پر ظاہر نہ ہونے دی تھی۔ مغلانی بیگم کی بیماری کا سن کر اسے خوشی محسوس ہوئی۔

"ہم سمجھتے ہیں بیگم صاحبہ کے علاج کے لئے فوری حکما کو بھیجنا لازم ہے۔" بھکاری خاں نے رائے دی۔

"ہم سنتے ہیں کہ وہ کسی حکیم سے علاج پر آمادہ نہیں۔" خواجہ مرزا خاں نے اپنی مجبوری بیان کی۔

"ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور ان کی پسند کا حکیم بھیجا جا سکتا ہے۔" بھکاری خان نے تجویز کیا۔

"یہ بہت مناسب مشورہ ہے مگر ان سے پوچھے گا کون؟"

"ان کے ماموں خواجہ عبداللہ خان اس کام کے لئے سب سے مناسب رہیں گے۔" بھکاری خاں نے بتایا۔

خواجہ مرزا خان بیگم کے ماموں کا نام سن کر سوچ میں پڑ گیا کہ اسے بھیجنا چاہئے یا نہیں، اسے خدشہ تھا کہ ماموں بھانجی مل بیٹھے تو کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دیں گے۔ بھکاری خان ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگا، اس نے خواجہ عبداللہ کا نام بلاجواز پیش نہیں کیا تھا۔ خواجہ مرزا خان کے لئے ان کی تجویز ماننے سے اسے مسترد کرنا اور بھی دشوار تھا۔

"خواجہ سعید ہم چاہتے ہیں خواجہ عبداللہ تک ہماری خواہش پہنچا دی جائے اور ان کے بیگم سے ملنے کا جلد از جلد اہتمام کیا جائے"۔ اس نے مجبوراً حکم دے دیا۔

خواجہ سعید نے تعمیل حکم میں سر جھکا دیا۔ "خواجہ ان گئے تو سہ پہر تک انہیں بیگم کو وہ پہنچا دیا جائے گا"۔

"آپ کو بیگم کی بیماری کا علم کیسے ہوا؟" بھکاری خان نے پوچھا۔

"طہماسپ خان نے ابھی صبح خبر دی ہے"۔

"گویا ہمارا تجویز کردہ مخبر مفید رہا"۔

"ہم آپ کی فراست کے ہمیشہ سے معترف ہیں"۔ خواجہ مرزا نے جواب دیا۔

مغلانی بیگم کی بیماری کے بعد دونوں شہر اور صوبہ کے حالات پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

خواجہ سعید نے واپس آ کر بتایا کہ خواجہ عبداللہ خان مغلانی بیگم سے ملاقات کرنے پر تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ان کی بھانجی نے اس کے خاندان کے لئے نیک نامی نہیں کمائی۔ خواجہ مرزا خان کے لئے یہ اور بھی پریشان کن خبر تھی۔ پرانے امراء سے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ملک سجاول کو مغلانی بیگم کے پاس بھیجا جائے۔ میر منو کی وفات کے وقت ملک سجاول کے کردار سے تو خواجہ مرزا خان واقف تھے لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ مغلانی بیگم اس پر اتنا اعتماد کرتی ہیں۔

اس تجویز پر عمل سے کسی سازش کا بھی خطرہ نہیں تھا، اس لئے فوری طور پر خواجہ مرزا خان کے پیغام کے ساتھ ایک سوار دستہ ملک پور روانہ کر دیا گیا۔

***

خواجہ سعید کی پریشانی کماندار کی آنکھوں میں جھلکنے لگی، بیگم کی حویلی کے پہریدار چاک و چوبند تھے لیکن خواجہ سعید میں پہلے والی چستی اور سختی نہیں تھی معلوم ہوتا تھا اس کا جسم تو خیمے میں ہے مگر روح کہیں دور چلی گئی ہے۔ ملک سجاول صبح حویلی میں داخل ہوا تھا۔ اب دو پہر ڈھلنے والی تھی، طہماسپ خان نے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ بیگم عالیہ کو پھر بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس لئے ملک سجاول کو ان کے حضور پیش نہیں کیا جا سکا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو وہ بے دلی سے اٹھا لیکن مسجد نہیں گیا۔ کماندار کو پانی اور جانماز لانے کا حکم دیا، اپنے رمنے کے سواروں کے ساتھ وہیں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ جانماز پر کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اس کے بھائی کا عروج ان کے خاندان کی داستان زوال کا باب اولیں تو نہیں بن جائے گا؟ اس کے بیاہ میں اس کا اپنا کردار کتنا ہے؟ بھکاری خان نے دوستی اور تعاون کے پردہ میں ان سے اپنی گرفتاری اور حراست کا بدلا تو نہیں چکا دیا؟ اگر مغلانی بیگم کو بھی زہر دیا گیا ہے تو کس نے دیا ہے؟ ان کے بھائی نے تو نہیں دلایا؟ یہ بھی بھکاری خان کی سازش تو نہیں؟ مغلانی بیگم مر گئی تو خواجہ مرزا خان کو جواب دینا پڑے گا۔ بھکاری خان زہر دلوا کر دونوں سے بدلہ تو نہیں لے رہا؟ خواجہ سعید ایک سپاہی تھا، وہ اقتدار کے کھیل کی چالوں سے واقف نہیں تھا، مغلانی بیگم کی بیماری نے اس کی سوچ کو انجانی راہوں پر ڈال دیا تھا۔ بھکاری خان نے مغلانی بیگم کو اقتدار سے محروم کر کے خواجہ مرزا خان کو حاکم پنجاب بنانے کا منصوبہ ان کے ذریعے خواجہ مرزا خان تک پہنچایا تھا۔ اب تک ہر مرحلہ پر بھکاری خان نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ خواجہ مرزا خان نے اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا

اور بھکاری خاں نے اسے ایمن آباد کے ضلع دار سے پنجاب کا حاکم بنوا دیا۔ بھکاری خاں نے ایسا کیوں کیا؟ ضرور اس میں کوئی سازش ہے جسے وہ سمجھ نہیں سکے گا۔ بھکاری خان بھی کسی کا اتنا ہمدرد نہ تھا، اپنے دشمن خواجہ مرزا خاں کا اتنا ہمدرد اور دوست کیوں بن گیا؟ اس نے پہلے بھی ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ پہلے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کوتاہی کے لئے اس نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ اس کے آدمی حویلی پر پہرہ دیتے ہیں۔ حویلی کے اندر سب ملازمین مغلانی بیگم کے اپنے ہیں اگر بھکاری خان نے زہر دلوایا ہے تو کیسے؟ مگر جب امین الدین کو زہر دیا گیا تو اس وقت بھی ملازمین تو مغلانی بیگم کے گھر کے ہی تھے۔ بھکاری خان نے طہماس خاں کی سفارش کیوں کی تھی؟ وہ بھکاری خاں کی سفارش اور مغلانی بیگم کی جاسوسی پر غور کرنے لگا۔

جب کماندار نے طہماس خاں کی آمد کی اطلاع دی تو خواجہ سعید نے اسے ڈانٹ دیا پھر کچھ سوچ کر بے دلی سے کہا۔ "حاضر کرو"۔

طہماس خان نے فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا خبر لائے ہو؟" خواجہ سعید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"حضور! مغلانی بیگم ہوش میں آ چکی ہیں مگر ملک سجاول کو حاضری کے لئے ابھی نہیں بلایا۔ وہ پوچھتے ہیں انتظار کروں یا واپس چلا جاؤں"۔ طہماس خاں نے جواب دیا۔

"جس کام کے لئے انہیں بلایا گیا ہے اس کی تکمیل ضروری ہے، بیگم صاحبہ کے حکم کا انتظار کریں۔ وہ جو حکم دیں ہمیں اطلاع دی جائے"۔

طہماس خاں سلام کر کے خیمے سے نکل گیا۔

"بیگم صاحبہ کے ملازمین میں سے کسی سے تمہارا تعلق ہے؟" خواجہ نے کماندار سے پوچھا۔

"ایک دو ملازم جو باہر کے کام کے لئے آتے ہیں، ان سے کبھی بات چیت ہو جاتی ہے"۔ کماندار نے عرض کیا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ حویلی کے حالات اور بیگم کی صحت کے متعلق ان سے معلومات حاصل ہوتی رہیں"۔

"حضور کے ارشاد پر ہم نے پہلے بھی کوشش کی تھی مگر وہ کچھ بتانے پر تیار نہ ہوئے، اب پھر کوشش کر دیکھتے ہیں شاید کوئی تیار ہو جائے"۔

"یہ بہت ضروری ہے، یہ سمجھو پہرہ کے علاوہ یہ بھی تمہارا فرض ہے۔ جو انعام دینا پڑے طہماس خاں کو اس کا علم نہیں ہونا چاہئے، وہ اپنے طور پر کام کرتا رہے"۔

"حضور کے ارشاد کی تعمیل کے لئے پوری کوشش کریں گے"۔ کماندار دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر رکوع میں چلا گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد خواجہ سعید نشست پر دراز دن بھر کے واقعات دہرانے میں مصروف تھا کہ کماندار نے اطلاع دی کہ ملک سجاول اور طہماس خاں حویلی سے برآمد ہو کر ادھر آ رہے ہیں۔ خواجہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ملک سجاول کو ہمارے حضور پیش کریں اور طہماس خاں کو باہر روک لیں، ہم ان سے تنہا میں بات کرنا چاہتے ہیں"۔ اس نے حکم دیا۔

کماندار سلام کر کے خیمے سے باہر نکل گیا، ملک سجاول اور طہماس خاں خیمے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ کماندار نے آگے بڑھ کر ملک سجاول سے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے ان کے ہاتھ کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہتا ہو۔ ملک نے ہاتھ دبا کر اپنے ارادہ اور قوت کا ثبوت فراہم کر دیا۔ "خواجہ حضور آپ کے منتظر ہیں"۔ اس نے خیمے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

طہماس خان ساتھ چلنے لگا تو کماندار نے اسے روک دیا۔ "خواجہ ملک صاحب سے خلیہ میں بات کریں گے تم ادھر خیمے میں ابھی آیا"۔ اس نے سپاہیوں کے خیمہ کی طرف اشارہ کیا اور ملک سجاول کے ساتھ خیمے میں داخل ہو گیا۔

خواجہ سعید نے کھڑے ہو کر ملک سجاول سے ہاتھ ملایا اور قالین کی طرف اشارہ کیا۔ "تشریف رکھیں، آپ کو زحمت ہوئی"۔

"ہم نواب صاحب کے شکر گزار ہیں، انہوں نے اس لائق سمجھا"۔ ملک نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم سمجھتے ہیں بیگم صاحبہ کی طبیعت کچھ بحال ہو رہی ہے"۔ خواجہ سعید نے پوچھا۔

"میں نہیں کہہ سکتا، بیگم صاحبہ کی طبیعت بحال ہو رہی ہے یا نہیں۔ آپ کو خبر مل گئی ہو گی کہ انہیں بے ہوشی کا پھر دورہ پڑا تھا۔ ان کا کرم ہے کہ کمزوری کے باوجود انہوں نے حاضری کی اجازت مرحمت کی"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"ہمیں امید ہے آپ نے بیگم عالیہ کو بتا دیا ہو گا کہ نواب خواجہ مرزا خان ان کی صحت کے بارے میں بہت فکر مند ہیں اور علاج کے لئے ان کے حکم کے منتظر ہیں"۔

"میں نے بیگم عالیہ کو سب کچھ بتا دیا ہے مگر وہ کسی طبیب پر اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکیں انہیں شبہ ہے کہ ....."

"ہم سمجھتے ہیں ان کا شبہ جائز ہے مگر نواب خواجہ مرزا خان پر انہیں اعتماد کرنا چاہئے۔ بیگم صاحبہ جانتی ہے کہ اس میں نواب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ نواب خواجہ مرزا خان ایسے نہیں"۔ خواجہ سعید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور ملک سجاول کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی بات کا جائزہ لینے لگے۔

"میں نے بیگم صاحبہ سے درخواست کی ہے مگر افسوس ہے انہوں نے اتفاق نہیں کیا"۔

خواجہ مرزا فکر مندی سے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ "بیگم صاحبہ اپنی پسند کے کسی طبیب کو طلب فرمانا چاہیں تو ہم ہر سہولت فراہم کرنے کو تیار ہیں"۔

"اس شہر کے کسی طبیب اور حکیم پر انہیں اعتماد نہیں، اس کی وجہ بھی سمجھ آتی ہے"۔

"وہ دہلی اور قندھار سے طبیب منگوانا چاہیں تو نواب مرزا خان اس کا بھی اہتمام کر دیں گے"۔

"میں نے بیگم صاحبہ سے اس موضوع پر بات نہیں کی لیکن شاید بیماری اتنی مہلت نہ دے"۔ ملک سجاول کے جواب میں پریشانی تھی۔

"ہماری درخواست ہے کہ آپ آج کی رات ہمیں کیمپ میں ٹھہریں آپ کے آرام کا پورا انتظام کر دیا ہے۔ بیگم صاحبہ کو اطلاع بھجوا دیں، وہ جب مناسب سمجھیں آپ ایک بار پھر حاضری دیں اور انہیں بتائیں کہ باہر سے کسی طبیب یا حکیم کو بلوانا چاہیں تو نواب مرزا خان کو بڑی مسرت ہوگی"۔

"بیگم عالیہ کی صحت کے سلسلے میں جب تک ضرورت ہو یہاں ٹھہرنے کو تیار ہوں"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

خواجہ سعید نے کماندار کو بلایا اور ملک سجاول کو قیام و آرام کا انتظام کرنے کا حکم دے کر دریائی علاقہ میں امن و امان کی صورت حال پر بات کرنے لگا۔

***

سردی اور کہر سے سرکنڈے کا جنگل کسی سوختہ جاں عاشق کی مانند ہو چکا تھا۔ لب بستہ، نیم جاں اور نیم سوختہ جنگل میں سے گھوڑوں اور جنگجو سواروں کے لئے راستہ مشکل نہیں تھا لیکن سمت کا تعین دشوار ہو رہا تھا۔ کوہ شوالک

سے آگے برف پوش پہاڑ اور چوٹیاں جب اپنا وجود سمیٹ لیتی تھیں تو راوی بھی سمت جاتا تھا اور دور دور تک پھیلے جنگل بیلے میں چھوٹے موٹے ندی نالے وجود میں آ جاتے تھے۔ جیسے حکومتوں اور حکمرانوں کے سمٹ جانے سے چھوٹے موٹے راجواڑے نواب اور حکمران وجود میں آ جاتے ہیں۔ جب دریا اور حکومتیں کناروں سے نکلتے ہیں تو یہ ندی نالے ان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ملک قاسم نے ایک چھوٹے سے نالے کو عبور کر کے سمت کے تعین کے لئے گھوڑے کی لگام کھینچی تو اس کے ساتھی بھی رک گئے۔ آسمان پر سورج کا زاویہ ناپ رہے تھے تو ہرنوں کی ڈار چوکڑیاں بھرتی ہوئی ان کے قریب شکار کو چیلنج کر کے غائب ہو گئی۔ کسی نے ہرن پر ایک تیر تک نہیں چھوڑا۔ سرکنڈوں کا بور گھوڑوں کے نتھنوں میں داخل ہوتا تو وہ خاص قسم کی آوازیں نکال کر سفر کی ناگواری کا اظہار کرتے۔ دلدلوں پھیلے جنگل بیلے پر مسلط خاموشی ٹوٹ جاتی۔ گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچلے جانے والے سرکنڈوں اور گھوڑوں کے نتھنوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر دور تک پھیل رہی تھیں۔ سواروں نے سرکنڈے کے تیز زخموں سے بچنے کے لئے موٹے لباس پہن رکھے تھے مگر گھوڑوں کو مسلسل زخم سہنا پڑ رہے تھے۔ جنگل کے درمیان میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچ کر ملک قاسم نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"تھوڑا آگے جو نالا ہے اس کے اوپر کی طرف"۔ ساتھی نے کہا۔

وہ نالے کے کنارے پہنچے تو سینکڑوں مرغابیوں نے فضا میں بلند ہو کر نغمہ سرائی شروع کر دی۔ وہ نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف چلتے رہے۔

"آپ رک جائیں پہلے اطلاع دینا ضروری ہے"۔ ان کے ساتھی نے کہا۔

سب نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اس نے گھوڑا ان کے حوالے کیا اور پیدل جنگل میں غائب ہو گیا۔ نالے کا پانی بہت شفاف تھا۔ اتنا سبک خرام کہ سطح آب کو چھونے والی سورج کی کرن بھی گہرائی کی پیمائش کے پورے سفر میں صاف نظر آتی تھی۔ اگر وہ شکار کے سفر پر ہوتے تو گھوڑوں سے اتر کر سبزہ کے قالین پر بیٹھ کر کسی ساتھی کو بنسری سے ہم کلام ہونے کو کہتے۔ گم شدہ موسیقیوں کی تلاش میں ہوتے تو جنگل ان کے گیتوں سے گونج جاتا۔ وہ سب خاموش تھے، کافی دیر بعد ان کے ساتھی کا نیزہ سرکنڈوں کے اوپر نمودار ہوا تو ملک قاسم نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

"حکم ہے کہ دو آدمیوں سے زیادہ حاضر نہیں ہو سکتے"۔ واپس آنے والے ساتھی نے بتایا۔

ملک قاسم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"آپ کا جانا ضروری ہے، ہم یہیں انتظار کرتے ہیں"۔ نوجوان ازبک سوار نے کہا۔

ملک قاسم اور ان کا ساتھی جنگل میں غائب ہو گئے۔

"یہ درویش لوگ دنیا والوں سے اتنا خوفزدہ کیوں رہتے ہیں"۔ ازبک دستہ کے کماندار نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے پاس حفاظتی دستوں کی تنخواہ کے لئے پیسے جو نہیں ہوتے"۔ دوسرے ازبک نے قہقہہ لگایا۔

"ہم نے تو سنا ہے سکھ ان جنگلوں میں چھپے رہتے ہیں اگر وہ آ جائیں تو ان کا کیا انجام ہو؟" کماندار نے کہا۔

"ان کی داڑھیوں اور سر کے بالوں کو دیکھ کر وہ سمجھتے ہوں گے یہ بھی اپنے بھائی بند ہیں"۔ ایک اور نے قہقہہ لگایا۔

"وہ اتنے بھی سکھ نہیں سب جانتے ہیں"۔ کماندار سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا یہ درست ہے کہ سکھ مسلمان صوفیا کی روحانیت کو مانتے ہیں؟" ایک سوار نے پوچھا۔

"ان کی روحانیت تو مغلانی بیگم بھی مانتی ہے، سکھ کیسے انکار کر سکتے ہیں؟" دوسرے نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"ملک قاسم تو کہتا تھا، اس جنگل میں شیر اور چیتے بھی آ جاتے ہیں"۔ ایک سوار نے کہا۔

"انہیں دیکھ کر یہ درخت پر چڑھ جاتے ہوں گے، وہ بتا رہے تھے سنبل کے جس درخت کے نیچے یہ رہتے ہیں وہ بہت گھنا اور اونچا ہے"۔ قہقہہ باز نے جواب دیا۔

"مغلانی بیگم کو اس جنگلی درویش کا علم کیسے ہوا؟"

"اس کے مرید ملک قاسم نے بتایا ہو گا"۔

"اور خواجہ مرزا مان مان گئے؟"

"مجبوری ہے، مغلانی بیگم کوئی ہم آپ جیسی مریض تھوڑا ہیں"۔

"اللہ انہیں صحت عنایت فرما دے، ان کی وجہ سے کتنے جوانوں کا روزگار لگا ہوا ہے، وہ مر گئیں تو دوسرے ہی روز ہم سب کو ایسے جنگلوں میں سکھوں کو تلاش کرنے بھیج دیا جائے گا"۔

ملک قاسم اور درویش جنگل سے برآمد ہوئے تو وہ سب خاموش ہو گئے۔ درویش گھوڑوں پر سوار تھے، ملک قاسم اور اس کا ساتھی لگامیں تھامے آگے چلے آ رہے تھے۔ ملک قاسم کے گھوڑے پر سوار درویش کے سر کے لمبے سفید بال ان کے شانوں پر بکھرے تھے۔ سفید داڑھی گھوڑے کی کاٹھی کو چھو رہی تھی، گورا چٹا رنگ، موٹی چمکدار آنکھیں لمبی ناک اور تیکھے نقوش جسم سبز چغے میں پوشیدہ جو کوئی ان کے چہرے کی طرف دیکھتا فوراً آنکھیں نیچی کر لیتا۔ دوسرے درویش کی داڑھی اور رنگت دونوں سیاہ تھے، سیاہ عمامہ، سیاہ چغہ، سیاہ آنکھیں ان کی طرف دیکھنے سے خوف اور حیرت کے ایسے ہی ملے جلے جذبات پیدا ہوتے تھے جیسے کسی مندر میں کالی دیوی کا بت پہلی بار دیکھنے سے ہوتے ہیں۔ ازبک سواروں نے آگے بڑھ کر سلام کیا، سلام کا جواب دے کر بزرگ درویش نے پنجابی زبان کا ایک شعر پڑھا۔ ازبک کماندار نے ملک قاسم کی طرف دیکھا لیکن اس کے جواب دینے سے پہلے درویش نے ازبکوں کی مادری زبان فارسی میں اس کا ترجمہ کر دیا۔

"خدا تعالیٰ کی اس سلطنت میں دنیاوی حکمرانوں کے محافظوں کی حفاظت خدا خود کرتا ہے، تمہیں غم یا فکر کی ضرورت نہیں ہونا چاہئے"۔

کماندار نے فارسی میں خدا تعالیٰ کی عنایات اور کرم فرمائیوں کا ذکر کیا اور کہا۔ "ہم خدا کے سپاہی ہیں ہماری جان خدا کے لئے وقف ہے ہمیں زندگی کا کبھی خوف نہیں رہا"۔

"بہت خوب بہت خوب ماشاء اللہ خدا تعالیٰ اپنے سپاہیوں کے سروں پر ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ رکھے۔ مبارک کی مستحق ہیں وہ مائیں جن کے بیٹوں نے دنیاوی حاکموں سے ملنے والی تنخواہوں کے بدلے اپنی جانیں خدا کے ہاتھ بیچ دی ہیں۔ خدا کے ایسے سپاہیوں کو ہم ایک بار پھر سلام عرض کرتے ہیں"۔

درویش کی بات ازبک کماندار کی ڈھال چیرتی ہوئی اس کے سینے میں جا پیوست ہوئی۔ اس نے آنکھیں نیچی کر لیں اور پھر اٹھا کر درویش کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔

***

مغلانی بیگم ریشمی قالینوں کے فرش پر آنکھیں بند کئے نیم دراز تھیں، گل بنفشہ کے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"ملک سجاول قدم بوسی کے لئے حاضر ہیں؟" گل بنفشہ نے عرض کیا۔

"اجازت ہے"۔ مغلانی بیگم تکیوں کے سہارے

سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

ملک سجاول آداب سے فارغ ہو کر بات کرنے والا تھا کہ مغلانی بیگم نے پوچھا۔ "ہم سمجھتے ہیں آپ اکیلے نہیں آئے"۔

"حضور قلندر بابا اور خان بابا حاضری کے منتظر کھڑے ہیں"۔ ملک سجاول نے بتایا۔

"ہم ان کے منتظر ہیں"۔ بیگم نے کہا۔

ملک سجاول دونوں درویشوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا تو درویشوں نے جھک کر بیگم کو فرشی سلام کئے اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"قلندر بابا آپ نے تو رخان بابا کی رنگت بھی تبدیل کر دی"۔ مغلانی بیگم نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی کی آزمائشوں میں انسان کو بہت کچھ بدلنا پڑتا ہے"۔ قلندر بابا نے جواب دیا۔

"ہماری خواہش تھی کہ نادر بیگ بھی موجود ہوں، ہم انہیں کچھ ہدایات دینا چاہتے تھے"۔ مغلانی بیگم نے کہا۔

"وہ خواجہ عبداللہ خاں کی حویلی میں پہنچ چکے ہیں اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں"۔ ملک سجاول نے بتایا۔

"ہم سمجھتے ہیں آپ نے قندھار کے سفر کی تیاریاں مکمل کر لی ہوں گی"۔ بیگم نے پوچھا۔

"جی حضور! سب تیاریاں مکمل ہیں، آپ کے حکم کا انتظار ہے"۔

سیاہ پوش نے عرض کیا۔

"خواجہ سعید تمہاری توقع سے زیادہ ہوشیار ہے۔ اس نے ملک قاسم کے ہمراہ اپنے سوار اس لئے بھیجے تھے کہ وہ قلندر بابا کا ٹھکانہ دیکھ لیں۔ اس کے مخبر ادھر بھی جا بیٹھے ہیں اس لئے تم میں سے کوئی قندھار کے سفر پر نہیں جا سکے گا۔ خواجہ عبداللہ خان اور نادر بیگ کا ہم سفر کون ہو گا؟" بیگم نے پوچھا۔

"ملک سجاول کے قبیلہ کے نوجوان تیار ہیں، آپ مناسب سمجھیں تو انہیں اجازت دیں"۔ سیاہ پوش نے عرض کیا۔

"یہ اجازت دینا پڑے گی مگر نوجوان ایسے ہوں جن کے دل و دماغ اور بازو قابل بھروسہ ہوں"۔

"وہ سفارت کی نزاکت اہمیت اور خطرات سے واقف ہیں"۔

"ہمیں ملک سجاول اور ان کے قبیلہ پر ہمیشہ اعتماد اور فخر رہا ہے جنہوں نے آزمائش میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہم نہیں جانتے اس احسان کا بدلہ کیسے اور کب دے سکیں گے۔ ان کے احسانات کا بوجھ بہت ہوتا جا رہا ہے"۔ مغلانی بیگم کی آواز احساس بے بسی سے کانپ رہی تھی۔

"ہم چاہتے ہیں کہ خواجہ عبداللہ کی سفارت جلد از جلد روانہ ہو جائے، آگے کا موسم افغانوں کے لئے گرم ہوگا۔ آپ کل صبح ملک پور روانہ ہو جائیں، رات تک خواجہ عبداللہ اور نادر بیگ آپ کے پاس پہنچ جائیں گے، انہیں روانہ کر کے آپ بھی واپس آ جائیں"۔ بیگم نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"بندہ صبح نماز کے بعد روانہ ہو جائے گا، شام تک سب سفر کے لئے تیار ہوں گے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"قلندر بابا اور خان بابا چند روز یہاں رہیں گے، آپ بھی آ جائیں تاکہ خواجہ سعید کو کوئی شبہ نہ ہو"۔ بیگم نے کہا۔

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"خان بابا وقت کی کروٹ کبھی قابل بھروسہ نہیں رہی، نہیں معلوم ہم تمہیں پھر خود ہدایات دے سکیں گے یا نہیں۔ سفارت کا نتیجہ کچھ بھی ہو تم قلندر بابا کے ساتھ رہو

گے اور یہاں سے واپس جا کر مرزا کریم بخش سے رابطہ کریں گے۔ ہم نہیں سمجھتے اس کی سب سپاہ منتشر ہو گئی ہے، انہیں ہمارا پیغام دیں کہ زیادہ سے زیادہ سپاہیوں سے رابطہ رکھیں اور ہمارے حکم کا انتظار کریں"۔

"تلعہ کی لڑائی کے بعد سے بیشتر سپاہ منتشر ہو چکی ہے، کچھ مرزا آدینہ بیگ کی فوج میں شامل ہو چکے ہیں مگر مرزا کریم بخش نے بھوانی داس کی دعوت قبول نہیں کی۔ ان سے نور بیگ کا رابطہ ہے اور بوقت ضرورت کچھ سپاہ جمع کر سکتے ہیں مگر اسلحہ اور تنخواہ ان کے پاس نہیں"۔

"قلندر بابا اور تم کو بلوانے کا اصل مقصد اسی بارے میں سوچنا ہے، سفارت کے سفر کے لئے اس کی زیادہ ضرورت نہ تھی"۔ بیگم نے کہا۔

"ہم حضور کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے"۔ خان نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ دیا۔

"قلندر بابا ہم تمہاری زبان سے بھی کچھ سننا چاہتے ہیں"۔ بیگم سفید پوش سے مخاطب ہوئیں۔

"خادم کو حضور موہن لعل کہہ کر مخاطب کریں تو اسے دلی خوشی ہوگی۔ یہ تو میر منو کے احسانات نے اسے قلندر بابا بنا دیا ہے ورنہ آپ کے لئے وہ اب بھی موہن لعل ہی ہے"۔ سفید پوش نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"موہن لعل ہم سمجھتے ہیں تم مرزا کریم بخش کی سپاہ کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر قرض کا بندوبست کر لو گے"۔

"امرتسر اور لاہور کے ساہوکاروں کے خزانے حضور کے قدموں میں ڈھیر کر کے خادم کو سب سے زیادہ خوشی ہوگی"۔ سفید پوش نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"ہتھیار کتنی تعداد میں مل سکیں گے؟" بیگم نے پوچھا۔

"روپیہ ہو تو سکھ جتھے دار اپنے ذاتی کرپان بھی بیچ دیں گے"۔

"ہم سمجھتے ہیں تم اپنی روایت پر پورے اترو گے"۔

"بھگوان کی کرپا سے خادم نے کبھی غلط بات نہیں کی"۔

"ہم قرض کی ضمانت کے لئے چند نایاب ہیرے فراہم کر سکتے ہیں"۔

"حضور اگر مجبوری نہ ہوتی تو ضمانت کی بھی ضرورت نہ ہوتی"۔

"ہم جانتے ہیں ایک قیدی کو جس کی رہائی کا بھی امکان دکھائی نہ دے بلا ضمانت کوئی قرض نہیں دے گا"۔

"خادم کو یہ سن کر دلی دکھ ہوا ہے، ہمارے لئے حضور آج بھی حاکم کشور پنجاب ہیں"۔

"ہم ضمانتیں چمن لال تک پہنچا دیں گے، حسابات وہ رکھے گا"۔

"خادم کی جان بھی حاضر ہے، جب حکم ہو پیش کر دوں گا"۔ موہن لعل کا سر قالین کو چھونے لگا۔

"ہم آپ کے جذبے کی قدر کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس کام میں کامیاب ہوں گے"۔

"حضور کے خادم دن رات پرماتما سے دعا کرتے ہیں کہ غداروں کو ان کے جرم کی سزا ملے، آپ کا راج تیاری و جاری ہو"۔

"تمہارے قیام کا اہتمام شہباز کرے گا یا خواجہ معبد کر رہا ہے"۔ بیگم نے پوچھا۔

"خواجہ سعید کیمپ میں ہمارے منتظر ہیں"۔ انہوں نے بتایا۔

"مناسب یہی ہے تم ان کے مہمان بنو، جب ضرورت سمجھیں گے ہم پیغام بھیج کر بلوا لیں گے"۔

وہ تینوں اٹھے اور سلام کر کے باہر نکل گئے اور مغلانی بیگم نے پھر سے انجانی راہوں پر تخیل کے راہوار ڈال دیئے۔

خواجہ معبد مغلانی بیگم کے مرض کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب تھے۔ قلندر بابا کے حویلی سے

برآمد ہونے کی خبر ملتے ہی وہ خیمے سے باہر نکل آئے اور آگے بڑھ کر سلام کیا۔ دونوں درویشوں نے بڑی بے نیازی سے سلام کا جواب دیا۔

''ملک سجاول! یہاں قریب کوئی مسجد ہے؟'' قلندر بابا نے قاضی سعید کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کے انداز میں پوچھا۔

''جامع مسجد یہاں سے دور نہیں، آپ آئیں خیمے میں تشریف رکھیں، نماز میں ابھی وقت ہے''۔ قاضی سعید نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم فقیروں کے لئے ہر وقت، وقت سجدہ ہے۔ کسی کو ساتھ کر دیں تو بہتر ورنہ خدا والوں کا تو معلوم ہی ہو گا''۔ قلندر بابا نے کہا اور اپنے ساتھی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

ان کا ارادہ دیکھ کر خواجہ سعید نے کماندار کو ساتھ کر دیا۔ دونوں درویش اور ملک سجاول مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ خواجہ سعید کھڑا دیکھتا رہا۔ سپاہیوں نے درویشوں کے ہاتھوں خواجہ سعید کو رسوا ہوتے دیکھا تو دل میں بہت خوش ہوئے۔

کماندار نے واپس آ کر بتایا کہ قلندر بابا کہتے ہیں ہم رات مسجد میں گزاریں گے۔

''تم نے انہیں بتایا ہوگا کہ ان کے قیام اور طعام کا ادھر انتظام ہے؟'' خواجہ نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا ہے؟''

''کیا کہتے ہیں؟'' خواجہ سعید واہمہ کا شکار ہونے لگا۔

''ان کا جواب تو حضور کے کانوں کے لئے مناسب نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ کے گھر کے مہمان ہیں۔ اللہ کی طرف سے انہیں کھانا پہنچ جائے گا، تم فکر نہ کرو''۔

''اس کا مطلب ہے درویشوں کو بھی ہم پر شبہ ہے؟'' خواجہ نے اپنے آپ سے کہا پھر کماندار سے مخاطب ہوئے۔ ''بیماری کے بارے میں کچھ بتایا؟''

''کچھ نہیں حضور! انہوں نے کوئی بات کرنا پسند نہیں کیا''۔

خواجہ سعید کو درویشوں کی بے نیازی پر بہت غصہ آیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ کروٹ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''اجازت ہو تو کھانا بھجوا دیں، شاید راضی ہو جائیں؟'' کماندار نے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں، تم ملک سجاول کو بلا لاؤ''۔

ملک سجاول خواجہ سعید کے لئے آراستہ خیمے میں داخل ہوئے تو وہ کھڑے ہو گئے۔ ''قلندر بابا نے کہا ہے ہم نہ کسی حکمران کا کھانا کھائیں گے، نہ سابقہ حکمران کا اللہ تعالیٰ خود اس کا انتظام فرمائیں گے، کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں''۔ ملک نے بتایا۔

''بیگم صاحبہ کی بیماری کے متعلق کیا فرماتے ہیں قلندر بابا؟'' خواجہ سعید نے پوچھا۔

''وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں، فرماتے ہیں، آج رات خدا تعالیٰ سے رہنمائی کی درخواست کریں گے اور جو کچھ کہیں گے کل بتائیں گے''۔

''کوئی دوائی بھی دی ہے؟''

''آج تو کوئی دوائی نہیں دی جب وہ بیگم صاحبہ کے پاس پہنچے تو ان کی صحت کافی مناسب تھی ان کی موجودگی میں دورہ بھی نہیں پڑا۔ وہ قلندر بابا سے بیماری کے بارے میں باتیں کرتی رہیں، میر منور مرحوم اور اپنے مرحوم بیٹے کی اچانک بیماری اور موت کے بارے میں بتایا تو قلندر بابا ان کی خوراک کے بارے میں پوچھتے رہے۔ صبح شام درود شریف کا وظیفہ کرنے کو بتا آئے ہیں''۔

''کل کس وقت دیکھیں گے بیگم صاحبہ کو؟''

''کچھ معلوم نہیں، بیگم صاحبہ نے کہا جب ان کی طبیعت مناسب ہوگی وہ بتا دیں گی تو قلندر بابا نے جواب دیا اگر اس وقت وہ فارغ ہوئے تو آ جائیں گے''۔

''آپ رات کیمپ میں قیام کریں ہم صبح جلد آ جائیں گے، جب بھی اندر سے اطلاع آئے قلندر بابا کو بیگم صاحبہ کے حضور پیش کر دیں''۔

''میں تو اجازت چاہوں گا، مجھے کل ہر صورت ملک پور پہنچنا ہے۔ دو قبیلوں میں لڑائی کا سخت خطرہ ہے، کل دوپہر وہاں جرگہ ہو رہا ہے۔ آپ کا حکم تھا آ گیا ورنہ اتنی کشیدگی میں آنا مشکل تھا''۔ ملک سجاول نے بتایا۔

''ہماری خواہش تھی کہ آپ یہاں رہتے، درویشوں کے ساتھ واپس چلے جاتے، آپ ان سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی آپ پر اعتبار کرتی ہیں، آپ چلے گئے تو مشکل ہو جائے گی''۔ خواجہ سعید نے اپنی مشکل بیان کر دی۔

''مجبوری نہ ہوتی تو حضور کے حکم کی تعمیل سے خوشی ہوتی۔ آپ کے دستے کے کمانڈر نے راستے اور گاؤں دیکھ لئے ہیں، جب آنا چاہیں آپ دستہ ساتھ کر دیں، جنگل میں ہم ساتھ آدمی بھیج دیں گے''۔

''ہماری خواہش ہے کہ آپ فارغ ہو کر جلد واپس آ جائیں اور جب تک قلندر بابا یہاں ہیں آپ ہمارے مہمان رہیں''۔

''اگر حضور کا حکم ہے تو تعمیل لازم ہے ورنہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں دیکھتا''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''ہم اس کی ضرورت سمجھتے ہیں''۔ خواجہ سعید نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

خواجہ کی سواری اور محافظ دستہ خیمے کے سامنے تیار کھڑے تھے، کیمپ کے کمانڈر کو ملک سجاول سے بات چیت کی روشنی میں ضروری ہدایات دے کر وہ قلعہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

★★★

دو روز بعد ملک سجاول واپس آ گیا، ان کے آنے تک قلندر بابا صفاقی بیگم کو دیکھنے نہیں گئے تھے۔ ایک روز طہماس خان نے بیگم کا پیغام پہنچایا تو قلندر بابا نے جواب دیا۔ ''ہم آج فارغ نہیں''۔ انہوں نے خواجہ سعید کو بیگم کی بیماری کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا نہ ان سے یا ان کے کسی آدمی سے ملے تھے۔ امام مسجد کو اپنے گھر سے کھانا لانے کی اجازت دے دی تھی اور دن رات مسجد سے ملحقہ حجرے میں بند رہتے تھے۔ بیگم کی صحت کی بہتری کے بارے میں بھی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔ طہماسپ خان نے حویلی کے ملازموں کے حوالے سے خواجہ سعید کو بتایا تھا کہ قلندر بابا نے بتایا ہے کہ بیگم کو کھانے میں ایسا زہر دیا جا رہا تھا جو آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے اور خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس خبر کے بعد سے بیگم اور ان کی بیٹیوں کے لئے شہباز خان کی نگرانی میں کھانا تیار کیا جا رہا ہے اور باورچی کو ملازمین کے احاطہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ خواجہ سعید اس خبر پر بہت پریشان ہوا اس نے خواجہ مرزا خان کو بتایا۔ آپس کے مشورے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ایسا ہے تو یہ بھی بھکاری خان کی سازش ہے جو صفاقی بیگم کو ہلاک کر کے ان کا اور بیگم کو راستے سے ہٹا کر اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا ہے مگر فیصلہ کیا کہ وہ اپنے رویے سے بھکاری خان پر ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ انہیں ان پر شبہ ہے۔

ملک سجاول نے بیگم کے حضور حاضری دی اور تمام دن قلندر بابا اور ان کے ساتھی درویشوں کو انہیں دیکھنے لے گئے، واپس آ کر انہوں نے طہماس خان کی خبر کی تصدیق کر دی اور بتایا کہ قلندر بابا نے امید ظاہر کی ہے کہ چند روز تک بیگم کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہو جائے گی۔ خواجہ سعید جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعی باورچی کو قید کر دیا گیا ہے، ملک سجاول نے اس بارے میں کچھ بتانے سے معذوری ظاہر کر دی اور کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

قلندر بابا جس طرح ان سے بے نیازی برت

رہنے کے دوران ان کی طرف سے کوشش کے باوجود اب تک ان سے بات نہیں کی تھی۔ اس سے خواجہ سعید کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔

"قلندر بابا نے کچھ بتایا ہے کہ اس سازش کے پیچھے کون ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ایسی باتوں کا علم خدا تعالیٰ کو ہے وہ کیا بتا سکتے ہیں"۔ ملک نجابل نے جواب دیا۔

جامع مسجد بیگم پورہ کے حجرے میں ایک ہفتہ بند رہنے کے بعد جب قلندر بابا اور ان کے ساتھی خواجہ سعید کے سواروں کے دستہ کے ہمراہ ملک پور کی طرف روانہ ہوئے تو مغلانی بیگم کی صحت بحال ہونا شروع ہو گئی تھی، خواجہ سعید اور خواجہ مرزا خان اس پر خوش تھے۔ خواجہ سعید نے قلندر بابا کو نذرانہ پیش کرنا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔

"ایک کو دکھ دے کر چھینتے اور دوسرے کو خوش کرنے کے لئے پیش کرتے ہو۔ ہم اس دینے والے سے مانگتے ہیں جو اپنے خزانہ سے دیتا ہے اور ہمیشہ دیتا رہتا ہے"۔

اس ایک ہفتہ کے دوران سوہن لعل نے لاہور کے ہندو ساہوکاروں سے مغلانی بیگم کے لئے قرض کی بات چیت مکمل کر لی تھی اور خواجہ عبداللہ خان اور نادر بیگ قندھار پہنچ گئے تھے۔

خواجہ مرزا خان بیگم کی صحت کی بحالی پر تو خوش تھے مگر زہر دے کر مارنے کی اس سازش کا جان کر انہیں اپنی حکمرانی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ بھکاری خان بیگم کو ہٹا کر انہیں لایا تھا۔ اس کے اثر و رسوخ سے اس کے لئے مغل دربار سے سند حکومت جاری کی گئی تھی۔ کیا اب وہ اسے ہٹانے کے لئے سازشیں کر رہا ہے؟ اسے نئے اندیشوں نے گھیر لیا۔ پنجاب کے مغل اور ترک سرداروں اور امراء نے شروع شروع میں اس سے مکمل تعاون کیا تھا۔ بہت سے ان سرداروں نے بھی جو مقام و مرتبہ میں اس سے بڑے تھے، دربار عام میں اسے حاکم پنجاب تسلیم کرتے ہوئے تمام فرمانوں اور اسناد پر ان کی مہر لگوانے لگے تھے لیکن جیسے ہی اس کی فوجوں نے سکھوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں ان میں سے بیشتر نے ایسا طرز عمل اختیار کرنا شروع کر دیا تھا جیسے وہ خودمختار ہوں اور حاکم پنجاب سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ لاہور میں مقیم امراء اور سردار کھانے کی دعوتوں اور ناچ رنگ کی محفلوں میں اسے ہر قسم کے تعاون اور فرمانبرداری کا یقین دلاتے تھے مگر عملاً نہ کوئی اس سے تعاون کرتا تھا نہ اس کا حکم مانتا تھا۔ خواجہ مرزا خان کی سپاہ سکھوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھی، اس لئے وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں خود ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ اپنے مرتبہ بلکہ دینے سے بھی کم تر مرتبہ کے ایک ازبک نوجوان کو دل و دماغ سے اپنا حاکم ماننا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ خواجہ نے طہماس خان کو مغلانی بیگم اور ان کی حویلی کی جاسوسی پر لگایا تھا مگر وہ خدمت کے ساتھ ساتھ وہ مغلانی بیگم اور بھکاری خان کے درمیان رابطہ کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ مغلانی بیگم نے بھکاری خان کو پیغام بھیجا۔

"ہم دونوں کے مصائب کی وجہ غلط فہمیاں ہیں جو بعض مفاد پرست سرداروں نے ہمارے درمیان پیدا کر دی تھیں۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہیں۔ اس حویلی میں قید و بند کے دوران سابقہ حالات و واقعات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے میر منو کے جاں نثار پر اعتماد کرنے کی بجائے ان مفاد پرست عناصر پر بھروسہ کیا"۔ مغلانی بیگم نے نہایت ہوشیاری سے بھکاری خان کو اپنے منصوبہ کے بارے میں شبہ نہیں ہونے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ لاہور اور پنجاب کے امراء میں وہی سب سے زیادہ ہوشیار و تجربہ کار اور بااثر ہے۔ اگر وہ اس کی بے بسی اور احساس ندامت پر یقین کر لے تو

اس کا سارا کیمپ ان کی بجائے خواجہ مرزا خان کے خلاف سازشوں میں لگ جائے گا اور اسے اپنا پروگرام مکمل کرنے کا وقت مل جائے گا۔ خواجہ مرزا خان اور اس کے بھائیوں کے عمل اور اقدامات سے بھکاری خان محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر نہیں چلنا چاہتے، اسے ان سے اس سرد مہری اور احتیاط پسندی کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر خواجہ مرزا خان امن وامان بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کے پاؤں مضبوط ہو گئے تو پھر وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ مغلانی بیگم کے بارے میں اپنے پرانے رویہ اور ان کی سوچ میں نئی تبدیلی پر غور کر کے وہ خواجہ مرزا خان سے دور ہونے لگا۔ مغلانی بیگم کو اپنے منصوبے پر عمل میں اس سے بہت فائدہ ہوا۔ خواجہ مرزا خان کو خواجہ عبداللہ خان کی قندھار سفارت کا بہت دیر تک علم ہی نہ ہو سکا کیونکہ اس کا جاسوسی کا نظام خود اسے اصلی حالات سے بے خبر رکھ رہا تھا۔

***

آدینہ بیگ کا ایجنٹ بھوانی داس لاہور سے حالات کے بارے میں تفصیل سے مراسلے ارسال کر رہا تھا۔ آدینہ بیگ اس نئی صورت احوال سے فائدہ اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ جب بھوانی داس کا مراسلہ موصول ہوا کہ مغلانی بیگم کا ساتھی خواجہ عبداللہ خان لاہور سے قندھار پہنچ چکا ہے تو آدینہ بیگ نے اپنی منصوبہ بندی تیز کر دی۔ بھوانی داس کا مراسلہ موصول ہوتے ہی اس نے فوری طور پر عماد الملک کے لئے مراسلہ تیار کرایا اور اسے خواجہ عبداللہ خان کی سفارت کی خبر دے کر خدشہ ظاہر کیا کہ اگر احمد شاہ ابدالی نے مغلانی بیگم کی دعوت پر لاہور پر حملہ کر کے پنجاب اپنی براہ راست حکومت میں شامل کر لیا تو اس سے شاہجہان آباد میں حکومت کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی اور ابدالی کی فوجیں اس کے دروازوں پر آ مقیم ہوں گی۔ کسی متوقع خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فوری تیاری اور منصوبہ سازی پر زور دیتے ہوئے اس نے اس نئے خطرہ کی ذمہ داری حاکم پنجاب پر ڈال دی جو اصلاح احوال میں ناکام رہا تھا۔

آدینہ بیگ کا مراسلہ ملتے ہی عماد الملک نے امرائے دربار کے مشورے سے خواجہ مرزا خان کو متوقع حملہ کے مقابلہ میں تیاریاں مکمل کرنے کے لئے مراسلہ بھیجا اور آدینہ بیگ کو حکم دیا کہ ابدالی کے حملہ کی صورت میں سلطنت مغلیہ کے نمک خوار اور وفادار کی حیثیت سے وہ خواجہ مرزا خان کی مدد کرے مگر اپنی طرف سے کسی مدد کے بارے میں اس نے کچھ نہیں لکھا۔ دکن میں بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے شاہجہان آباد حاکم پنجاب کی فوجی مدد کے قابل نہیں تھا لیکن یہ بتا کر عماد الملک خواجہ مرزا خان کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آدینہ بیگ کے مراسلے سے وہ اپنی سیاسی مرکزیت کے بارے میں اور بھی فکرمند ہو گیا۔ اگر مغلانی بیگم کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی لاہور پر حملہ کر کے پھر پنجاب کو اپنی سلطنت کا حصہ قرار دے کر مغلانی بیگم کو حاکم بنا دیتا ہے تو اس سے ان کے اپنے سیاسی مستقبل پر ناخوشگوار اثرات پڑیں گے اور بادشاہ کے بدظن ہونے کا خطرہ ہو گا اور ان کے مخالف امراء بادشاہ کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پنجاب ہاتھ سے نکل جانے سے مغلیہ سلطنت کا دفاع مشکل ہو جائے گا۔

خواجہ مرزا خان کو خواجہ عبداللہ کی سفارت کی خبر کے بعد عماد الملک کی طرف سے آخری آدمی تک لاہور کے دفاع کا حکم موصول ہوا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ فوری اقدام کے طور پر اس نے مغلانی بیگم کی حویلی پر پہرہ مزید سخت کر دیا اور خواجہ قاضی کو سکھوں کے خلاف مہم ختم کر کے ایمن آباد واپس پہنچ جانے کا حکم دیا اور خود امرائے دربار اور اہل شہر کی مدد حاصل کرنے کی کوشش

شروع کر دیں۔ اس نے آدینہ بیگ کے تمام مراسلہ میں اس کی دانائی بہادری اور انتظامی مہارت کی بہت تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ مغلیہ سلطنت کے نمک خواروں اور وفاداروں کو اس نازک مرحلہ پر متحد ہو کر سلطنت کا دفاع کرنا چاہئے۔

***

ملاحوں کی بستی میں جھونپڑیوں کے طویل ہوتے سائے ایک دوسرے میں گم ہو چکے تھے۔ چولہوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی لہریں اوپر فضا میں پہنچ کر ایک دوسری میں گھل مل کر ہلکے سفید بادلوں کی صورت میں شہر کی طرف اڑی جا رہی تھیں۔ راوی کے اوپر سے آنے والی ہوا نے گرما کی شام بہت خوشگوار بنا دی تھی۔ بستی کے نیم برہنہ بچے جھونپڑیوں کے سامنے کھیل رہے تھے اور ان کی مائیں رات اور اپنے خاوندوں کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ بستی کے بوڑھے اور جوان چوپال میں کانی کی صفوں پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور سب سے بوڑھا ملاح نوجوانوں کو ان اچھے دنوں کے قصے سنا رہا تھا جب ملاحوں کے لئے کوئی موسم بھی مندے کا موسم نہیں ہوتا تھا۔ ملک اور صوبے میں ہر طرف امن اور خوشحالی ہوتی تھی۔ سمرقند و بخارا کے تاجروں کے شاہجہان آباد جانے والے قافلوں اور لاہور کے تاجروں کے کابل و قندھار جانے والے قافلوں کو وہ سارا سال دریا سے آر پار لاتے رہتے تھے۔ گندم اور چاول کی فصلوں کی تیاری پر منڈی میں اس قدر غلہ آتا تھا کہ کشتیاں کم پڑ جاتی تھیں۔ جن نوجوانوں نے حکومتوں اور حکمرانوں کی کمزوری اور بدامنی کے دور میں آنکھیں کھولی تھیں وہ ان باتوں کو ایسی حیرانی سے سن رہے تھے جیسے یہ کسی اور ملک کے قصے کہانیاں ہوں۔

"اس وقت لاہور پر حملے نہیں ہوتے تھے؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"اس وقت لاہور دوسرے ملکوں پر حملے کرتا تھا، کسی کی جرأت نہ تھی جو اس طرف میلی آنکھ سے دیکھے"۔ بوڑھے ملاح نے سینہ تان کر کہا۔ اس کی آواز کی کھنک اور آنکھوں کی چمک سے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کو لاہور کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت اس کے خوف کی وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ "ہمارے بزرگوں نے بتایا کہ ان کی زندگیوں میں بھی کسی نے لاہور پر حملہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے اپنے بچپن اور جوانی میں بھی کسی کو معلوم تک نہیں تھا کہ حملہ کیا ہوتا ہے۔ لوگ امن سے زندگی گزارتے تھے۔ اگر تم اس وقت ہوتے تو دیکھتے لاہور کیسا شہر تھا۔ یہ لڑائیاں جھگڑے اور شور تو تمہاری پیدائش کے بعد شروع ہوئے ہیں"۔

"یہ سارا کام اس نے پیدا ہو کر خراب کیا ہے اگر یہ پیدا نہ ہوتا تو لوگ آج بھی امن اور خوشحالی سے زندگی بسر کر رہے ہوتے"۔ ایک نوجوان نے مذاق کیا۔

محفل میں ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔

"جھگڑے شروع تو اس کی پیدائش کے بعد ہوئے تھے مگر تمہارے پیدا ہونے کے بعد یہ اتنے بڑھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے"۔ بوڑھے ملاح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس بار زوردار قہقہہ پڑا۔

"ہم دونوں ہی ان جھگڑوں کے ذمہ دار ہیں یا ہمارے ساتھ یا بعد میں پیدا ہونے والوں کا بھی اس میں کچھ حصہ ہے؟" دوسرے نوجوان نے پوچھا۔

"اس خرابی میں سب کا حصہ ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا وہ ذمہ دار نہیں"۔ بوڑھا سنجیدہ ہو گیا۔

"تو آؤ ہم سب مل کر آج فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اپنی بستی میں اب ہم کوئی نیا بچہ پیدا نہیں کریں گے تاکہ فساد ختم نہ بھی ہو تو کم از کم اور بڑھے تو نہیں"۔ اسی نوجوان نے کہا۔

"لو بھئی، بچے پیدا کرنے کا اختیار بھی اللہ تعالی

نے اسے دے دیا ہے"۔ پہلے نوجوان نے طنز کیا۔

"خواجہ خضر کی اولاد نہ رہی تو اس کا راوی تو ویران ہو جائے گا"۔ بوڑھے ملاح نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بابا! سارا پنجاب ویران ہو رہا ہے، تمہیں راوی کی فکر لگی ہے"۔

"پنجاب کا حاکم اس کی ویرانی کا ذمہ دار ہے، ہم خواجہ کی طرف سے راوی کے حاکم ہیں، ہم اسے آباد رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ہر کسی کو اپنا فرض پورا کرنا چاہئے"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

"پنجاب کے حاکم ہر دوسرے مہینے بدل جاتے ہیں، کبھی راوی کے حاکم بھی بدلے ہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

"جب ہمارے بازوؤں میں لہروں سے لڑنے کی طاقت نہ رہے گی تو خواجہ کسی دوسرے حاکم کو لے کر آ جائیں گے۔ انہیں راوی کو آباد رکھنا ہے، مخلوقِ خدا کو سہولت پہنچانا ہے۔ جب تک تم یہ کام پورا کرتے ہو خواجہ کو نئے حاکم لانے کی کیا ضرورت ہے"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

نوجوان بوڑھے ملاح کی بات پر کچھ دیر خاموش رہے جیسے اپنی حاکمیت کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے ہوں۔

"بابا! تمہیں معلوم ہے ملاحوں کو راوی کی حکمرانی کب دی گئی تھی؟" ایک نوجوان نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"جب خدا تعالیٰ نے زمین کے سینے پر دریا کھودے تاکہ پہاڑوں کا سبزہ اور بارش کا پانی میدانوں میں رہنے والوں کو تنگ نہ کرے اور ان دریاؤں کے راستے سمندر میں چلے جائے تو دریاؤں کی حکمرانی خواجہ خضر کو دے دی تاکہ وہ انہیں قابو میں رکھیں۔ خواجہ خضر نے ہمارے بڑے بزرگ کو بلا کر کشتی چلانا سکھایا اور راوی کی حکومت اس کے حوالے کر کے حکم دیا۔" دیکھنا راوی خدا کی مخلوق کی راہ نہ روکے"۔ بس اس روز سے ملاح راوی پر حکومت کر رہے ہیں، کئی بادشاہ آئے اور چلے گئے مگر ان کی حکومت کوئی نہ چھین سکا"۔

"آدھی روٹی کا سوال ہے بابا"۔ بستی کے ایک طرف سے آواز آئی۔

کالو خاموشی سے اٹھا اور اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

"یہ فقیر کے پہنچنے سے پہلے آدھی روٹی کھانے جا رہا ہے تاکہ اس کی چٹی اسے پوری روٹی نہ دے دے"۔ ایک نوجوان نے اسے جاتا دیکھ کر کہا۔

اہلِ محفل نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ "آدھی روٹی کا سوال ہے بابا" قہقہے کی گونج میں دب کر رہ گیا۔

بستی کی جھونپڑیاں رات کے اندھیرے میں گھل مل گئیں تو جھونپڑیوں کے سامنے کھیلنے والے بچے جھونپڑیوں میں واپس چلے گئے۔ چولہوں کی روشنیوں کی بجائے دیوں کی روشنیاں رات کے اندھیرے میں ٹمٹمانے لگیں۔ بوڑھا ملاح باتیں کرتے کرتے بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔

"منوہر کی نیت آج کچھ خراب دکھائی دیتی ہے، آسمان پر ستاروں کے قدم ڈولتے ہوئے محسوس ہونے تب تو تم نے کشتیاں تو کھونٹے سے باندھ دی ہیں؟" اس نے نوجوانوں سے پوچھا۔

اہلِ محفل بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"قطب ستارے کے پڑوسیوں کو دیکھو، ان کی آنکھوں میں پہلے والی چمک نہیں۔ آج ضرور کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے"۔ بوڑھے ملاح نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"میں جب شام کو کشتی باندھ رہا تھا تو ایک بڑی سی مچھلی کنارے کی طرف سے گھوم کر پانی کی طرف کودی تھی"۔ ایک نوجوان نے بتایا۔

"خدا اپنی مخلوق کو آنے والے خطرات سے پہلے خبردار کر دیتا ہے۔ تم بھی جاؤ اور اپنی اپنی کشتیوں کو مضبوطی سے باندھ لو، جھونپڑیوں تک جانے سے پہلے سب کشتیوں کو دیکھو کہ ٹھیک سے بندھی ہیں"۔ بوڑھے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ نوجوان چٹائیاں لپیٹنے لگے، باقی تیزی سے دریا کی طرف چل دیئے۔

"آدھی روٹی کا سوال ہے بابا"۔ فقیر ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"بابا جی! موسم خراب ہو رہا ہے، آج پوری روٹی کا سوال کرو تاکہ جلد واپس پہنچ جاؤ"۔ بوڑھے ملاح کے پیچھے صف اٹھائے چلتے نوجوان نے کہا۔

"فقیر میں لالچ اور خوف منع ہیں۔ طوفان کو نہ دیکھو جس نے طوفان جمع کیا ہے اس کے کرم پہ نگاہ رکھو"۔ فقیر نے کہا اور "آدھی روٹی کا سوال ہے بابا" کی صدا لگاتا ہوا آگے نکل گیا۔

"ان درویشوں نے اپنی کشتیاں توکل اور رضا کے کھونٹے سے باندھی ہوئی ہیں۔ ان کی سلطنت کے اپنے اصول ہیں جو ہم آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے"۔ بوڑھے نے نوجوان کو نصیحت کی۔

فقیر کی صدا سے جھونپڑی کی سرکنڈے کی دیواروں میں لہریں اٹھنے لگیں تو کالو جلدی سے روٹیوں کی چنگیر اٹھا کر باہر آ گیا اور ساری روٹیاں فقیر کی جھولی میں ڈال دیں۔

"خواجہ خضر کی دعوت کے لئے کسی کو آدھی سے زیادہ روٹی دینے کی اجازت نہیں"۔ فقیر نے آدھی روٹی توڑ کر رکھ لی اور باقی روٹیاں واپس کر دیں۔ "طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، اپنی کشتی کو کھونٹے سے اور دل کو اللہ کی مرضی سے مضبوطی سے باندھ کر بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ جب رات آدھی گزر جائے تو اس اونچے درخت کے نیچے خواجہ کی دعوت میں شامل ہو جاؤ"۔ فقیر نے کالو کا ہاتھ پکڑ کر مٹھی میں لیا اور تھپکی دے کر اس کی مٹھی بند کر دی۔

"مگر آج تو موسم خراب ہونے جا رہا ہے"۔ کالو نے مٹھی بند کرتے ہوئے کہا۔

"پیغام پہنچانا ہمارا فرض تھا، آگے نہ مانو تمہاری مرضی ہے"۔ فقیر نے کہا اور "آدھی روٹی کا سوال ہے بابا" کی صدا لگاتا ہوا آگے چل پڑا۔

کالو کشتی کو کھونٹے سے باندھ رہا تھا تو شاہی مسجد میں صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوئے، پاؤں صاف کئے اور جوتا پہن کر دبے قدموں جھونپڑی کی طرف چلنے لگا تاکہ کسی کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ رات کشتی لے کر کہیں گیا تھا۔ اس کی بیوی رات بھر جاگتی رہی تھی، جب وہ گیا تھا تو طوفان زوروں پہ تھا۔ طوفان تھم گیا تھا مگر اس کا دل اب بھی کانپ رہا تھا۔ "تم کشتی لے کر ادھر گئے تھے" کالو کی بیوی نے راوی کے پار کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ادھر بھی جانا پڑ گیا تھا"۔ کالو نے سرگوشی کی۔

"تم تو کہتے تھے خواجہ خضر کی ادھر دعوت ہے؟"

"ان کے کچھ مہمانوں کو ادھر پہنچانا تھا"۔

"خواجہ خضر کو یہ بھی پتہ نہ تھا موسم اور دریا کی نیت ٹھیک نہیں، کسی اچھے موسم میں دعوت رکھ لیتے"۔

"خواجہ خضر دریاؤں کے بادشاہ ہیں، بادشاہوں کے کاموں کے بارے میں جھک جھک نہیں کیا کرتے۔ تم یہ دیکھو وہ ہم پر کتنے مہربان ہیں۔ اور بھی تو ملاح ہیں اس بستی میں"۔ کالو نے بیوی کو ڈانٹا۔

اس کی بیوی خاموشی سے اٹھی اور صبح کی نماز کی تیاری کرنے لگی۔

"میں آج کشتی نہیں کھولوں گا، کوئی پوچھے تو کہہ دینا کالو کی طبیعت ٹھیک نہیں"۔ اس نے منہ پر کپڑا کھینچتے ہوئے کہا۔

***

خواجہ مرزا خان بے چینی سے ٹہل رہا تھا، خادم خاص کمرے میں داخل ہوا، جھک کر سلام کیا اور دست بستہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ خواجہ کسی سوچ میں اس قدر گم تھا کہ اسے پتہ نہیں چلا کہ خادم کب آیا اور کب رکوع سے فارغ ہوا۔ کافی دیر بعد اس نے داخلے کے دروازہ کی طرف نگاہ اٹھائی تو خادم نے جلدی سے اپنی نگاہیں فرش پر گاڑھ دیں۔

"آ گئے خواجہ سعید؟" اس نے خادم سے اس انداز میں پوچھا جیسے جتانا چاہتا ہو کہ وہ اس کی آمد کے ساتھ ہی خبردار ہو گیا تھا مگر کسی خاص وجہ سے اس کے رکوع اور وجود کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

"جی حضور! خواجہ حاضر ہیں اور اذن باریابی چاہتے ہیں"۔ خادم نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہم منتظر ہیں"۔ خواجہ کی کرخت آواز پردوں سے ٹکرائی، خادم کانپتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

خادم کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ خیریت سے نہیں یا پھر خواجہ مرزا کے کمرے میں خیریت نہیں۔ "تم نے بہت تاخیر کر دی واپس آنے میں؟" خواجہ سعید کے چہرے پر تشویش کی لہریں گہری ہو گئیں۔

"حضور آپ کے انتظار میں تیزی سے ٹہل رہے ہیں"۔ خادم بدحواسی پر قابو نہ پا سکا۔

خواجہ سعید نے اس کے جواب پر غور نہیں کیا وہ جلدی سے بھاری پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا تو خواجہ مرزا خان اپنی نشست پر رونق افروز ہونے سے ابھی فارغ نہیں ہو سکے تھے۔ وہ آداب بجا لا کر سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ رونق افروزی کے مراحل مکمل کر کے خواجہ مرزا خان نے بناوٹی اعتماد زیب رخ کرتے ہوئے پوچھا۔ "بابا خان ولی کے بارے میں کیا خبر ملی؟"

"جستجو ناکام رہی، ان کا کچھ پتہ نشان نہیں مل سکا"۔ خواجہ سعید نے جواب دیا۔

"کچھ معلوم ہوا کہ طوفان کی شب مزار پر سے جو درویش غائب ہوئے وہ کہاں گئے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ اس تلاش میں بھی کامیابی نہیں ہوئی"۔

"وہ لازماً ان کے ساتھ گئے ہیں"۔

"جستجو کرنے والوں کا خیال بھی ہے"۔

"ایسا تو نہیں کہ وہ قندھار کی فوجوں سے جا ملے ہوں؟"

"حضور کے گمان سے اختلاف کی گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتا مگر اس طوفان میں راوی پار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس صبح وادی پار جانے والی کشتیوں کے ملاحوں سے اچھی طرح پوچھا گیا، سب نے کہا کوئی درویش اس روز یا اس سے دو تین روز بعد دریا پار نہیں اترا۔ لیکن آباد کے پرگنے کے مخبروں اور چوکیوں نے بھی اس ہفتہ میں کسی درویش کے گزرنے کی خبر نہیں دی، بابا خان ولی کے حضور پر کرم کو دیکھ کر ان پر شک کی گنجائش بہت کم ہے"۔

"بھوانی داس کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بھی کل صبح سے اپنی حویلی میں نہیں پائے گئے"۔

"قندھار کی فوجیں تیزی سے بڑھتی آتی ہیں مگر مرزا آدینہ بیگ نے ہمارے مراسلہ کا ابھی تک کچھ جواب نہیں دیا۔ شاہجہان آباد کی خاموشی کا مطلب صاف ظاہر ہے، افغان فوجوں کا مقابلہ ہمیں اکیلے کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ہم نے کیا کیا؟" خواجہ مرزا خان نے پوچھا۔

"سب فوجیں جہاں کے محاذ سے واپس پہنچ چکی ہیں، شہر کا دفاع استوار ہے اور اہل شہر مستعد ہیں"۔ خواجہ سعید

نے جواب دیا۔

"خبر ابھی ہے مگر کیا ضرورت کے وقت اہلِ لاہور پر اعتبار کیا جا سکے گا؟"

"ان کی یقینی دہائی پر یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔

"بھکاری خان کا رویہ کیسا ہے؟"

"تن من دھن سے حضور کے ساتھ ہیں"۔

"مرزا کرم بخش کی سپاہ کتنے فاصلہ پر ہے؟"

"فاصلہ زیادہ نہیں مگر جب تک قندھار کی فوج پہنچ نہیں جاتی مرزا آگے نہیں بڑھنے کے، اُس منزل میں ان کا انتظار کرے گا"۔

"مقبد خاتون سے شکست کے بعد ہم افغان فوجوں کو شکست دے سکیں گے، کیا یہ اپنے کو دھوکہ دینا تو نہیں؟" خواجہ مرزا خان نے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"حضور کے جاں نثار اپنی جانوں کی ہرگز پروا نہیں کریں گے"۔ خواجہ سعید نے آنکھیں جھکا لیں۔

اسے احساس تھا کہ مقبد خاتون سے شکست کی ساری ذمہ داری اس پر ڈالی جا رہی ہے۔

"خواجہ سعید! ہمارے جاں نثار تعداد میں کم ہیں اور ہمیں دھوکہ دینے والے زیادہ ہیں، ترک امراء اور سردار قابلِ بھروسہ نہیں، اہلِ شہر اور پنجاب ترکوں پہ بھروسہ نہیں کر سکتے، کشور پنجاب کی حالت زار کے ترک اور مغل ذمہ دار ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کا سفیر غلط نہیں کہتا"۔ خواجہ مرزا خان کی بات سے ان کی پریشانی ٹپک رہی تھی۔

"حضور نے جو فرمایا بجا فرمایا"۔ خواجہ سعید نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے اتفاق کیا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم افغانوں سے کھلے میدان میں لڑیں گے، شہر اور قلعہ کی فصیلیں زیادہ دیر ہماری حفاظت نہیں کر سکتیں، محصور امراء اور عوام زیادہ دیر ہمارا ساتھ نہیں دیں گے"۔ خواجہ مرزا خاں نے فیصلہ سنا دیا۔

"بندہ حضور کے حکم کا پابند ہے"۔

"ہم چاہتے ہیں راوی میں چلنے والی تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا جائے، شہر میں آنے اور باہر جانے والوں کی پڑتال کی جائے، بھکاری خان اور ان کے ساتھی ترک امراء کی نگرانی سخت کر دی جائے"۔

"تعمیلِ ارشاد میں بندہ دشمن اور دوست میں امتیاز نہیں کرے گا"۔

"خواجہ قاضی کی فوج راوی کے کنارے منتقل ہو جائے، افغانوں کو کسی صورت ادھر سے دریا عبور نہیں کرنا چاہیے، باقی فوج شالا مار باغ سے اس طرف کیمپ لگائے گی، جتنا جلد ممکن ہو مورچہ بندی مکمل کر لی جائے"۔ خواجہ مرزا خان نے حکم دیا۔

خواجہ مرزا خان کے حکم سے خواجہ سعید کے ذہن میں لڑائی کا نقشہ جمنا شروع ہو گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے جرنیل جہان خان کی کمان میں دس ہزار افغانوں کے لاہور کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملی تھی۔ مرزا کرم بخش دو ہزار فوج بھرتی کر سکا تھا۔ ان کی اپنی ازبک اور ترک سپاہ کی تعداد سولہ ہزار سے زیادہ تھی۔ دیگر ترک امراء اور مقامی سپاہ کو ملا کر انہیں افغانوں پر کافی زیادہ برتری حاصل تھی۔ اپنے تخیلاتی میدان جنگ میں اس نے دونوں فوجوں کو آمنے سامنے کھڑا کیا تو بھائی کی نفسیاتی پسپائی پر اسے صدمہ ہوا مگر اس نے اس کو زبان پر لا کر دوسرے مزید ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا۔

"ہم امید کرتے ہیں کہ کل شام تک ان سب امور کے بارے میں ہمیں آگاہ کر دیا جائے گا"۔ خواجہ مرزا خان نے اسے اذنِ رخصتی دیتے ہوئے کہا۔

خواجہ سعید نے ایک بار پھر سرِ تسلیم خم کیا اور کمرے

سے باہر نکل گیا۔

شیش محل کے بیرونی دروازے پر پہنچ کر اس نے واپس مڑ کر دیکھا تو اس کی نظروں کے سامنے ان حاکموں کے چہرے ابھر آئے جو اس میں تاحیات قیام کے خواب لے کر آئے تھے اور شکستہ خوابوں کی گٹھڑیاں کندھوں پر لاد کر نکال دیئے گئے تھے۔

***

قلعہ کے دیوان عام کو جانے والے راستوں کے دونوں طرف مسلح سپاہی قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ نیلے آسمان پر پوری آب و تاب سے جلوہ افروز سورج کی شعاعیں شاہی قلعہ کے ایوانوں اور دالانوں میں نئی زندگی کا منظر دیکھنے کو جھک جھک کر جھانک رہی تھیں۔ شہر اور نواح شہر کے امراء، شرفاء اور شہری افغان سپاہیوں کے درمیان سے گزر کر دیوان عام کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ نظر بچا کر سپاہیوں کو دیکھتے اور نظریں جھکا کر چلنا شروع کر دیتے۔ اہل لاہور خواجہ مرزا خان کی شکست پر خوش تھے مگر شہر اور قلعہ پر افغانوں کے قبضہ سے ناراض ہوئے تھے۔ پہلے جب بھی احمد شاہ ابدالی نے لاہور فتح کیا تھا اہل لاہور کو اپنی فاتح فوج سے مکمل تحفظ دیا تھا۔ جہان خان کی فتح کے بعد پہلی بار افغان دستوں نے شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار کی کوشش کی تھی اور شہر اور قلعہ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ جہان خان کے حکم پر کچھ لوگ خوشی سے دربار میں شریک ہو رہے تھے اور کچھ خوف کی وجہ سے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا انہیں کس لئے بلایا ہے اور جہان خان کس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔

دیوان عام ایک سرے سے دوسرے تک بھر چکا تو چوبدار نے حاکم کشور پنجاب عالی مرتبت مغلانی بیگم کی آمد کا اعلان کیا۔ حاضرین کے چہروں پر سے خوف جھلکنے لگا اور تمام نگاہیں جھروکہ کی طرف اٹھ گئیں۔ مغلانی بیگم کے نمودار ہوتے ہی سب حاضرین کھڑے ہو گئے اور ادب سے نگاہیں جھکا لیں۔ بیگم کے بعد احمد شاہ ابدالی کے جرنیل جہان خان، ان کے بھتیجے امان خان اور مغلانی بیگم کے ماموں خواجہ عبداللہ خان داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

مغلانی بیگم کے اقبال کی عمر اور ساب کی درازی کی دعاؤں کے ساتھ دربار کی کارروائی کا آغاز کیا گیا اور سب سے پہلے غداروں کو پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ افغان سپاہی خواجہ مرزا خان، بھکاری خان اور خواجہ سعید کو لے کر دربار میں داخل ہوئے تو کسی نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ان قیدیوں میں سے کسی کو نہ کوئی ہتھکڑی لگائی گئی تھی نہ کسی کے بازو باندھے گئے تھے مگر کسی کے سر پر کلاہ نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے ہجوم خلق میں سے چلتے ہوئے جھروکہ کے سامنے پہنچے تو بیگم کے حکم سے انہیں نشستیں فراہم کر دی گئیں۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بعد خواجہ مرزا خان کے امرائے دربار اور فوجی کمانداروں کو پیش کیا گیا، ان سب کو بھی جھروکہ کے سامنے بٹھایا جا چکا تو بیگم نے خواجہ مرزا خان کے جرائم سے حاضرین کو آگاہ کرنے کا حکم دیا۔

"خواجہ مرزا خان بقائمی ہوش و حواس آپ سب کے درمیان موجود ہیں، آپ کو گواہ بنا کر حاکم کشور پنجاب عالی مرتبت مغلانی بیگم اعلان عام کا حکم فرماتی ہیں کہ دربار عام میں پڑھی جانے والی خواجہ مرزا خان کی غداری اور نمک حرامی کی تفصیل میں اگر کوئی بات خلاف واقعہ ہو تو انہیں بلاخوف و خطر اس کی تصحیح اور رد و بدل کا پورا حق ہو گا"۔ یہ اعلان با آواز بلند کرنے کے بعد خواجہ کے خلاف فرد جرم پیش کی گئی۔

"خواجہ مرزا خان اپنے تین صد اور یک سواروں کے ساتھ نواب معین الملک مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب مغفور نے انہیں عزت اور ملازمت دی اور سکھوں کے خلاف ان کی کارکردگی کے اعتراف کے طور

رہا نہیں اور ان کے ساتھیوں کو انعامات سے نوازا اور نیاں دیں لیکن نواب مغفور کی وفات کے وقت خواجہ مرزا خان نے ان کی بیگم اور بیٹے کے خلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی اس سنگین جرم کے باوجود بیگم عالیہ نے ان کی خطائیں معاف کرتے ہوئے انہیں پرگنہ ایمن آباد کا ضلع دار مقرر کیا، ان پر اعتماد کیا، ان پر نوازشیں کیں لیکن انہوں نے نمک حرامی کرتے ہوئے غداری سے حکومت پر قبضہ کر کے بیگم صاحبہ کو اور ان کی بچیوں کو قید کر دیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ پنجاب بادشاہ معظم عالی جاہ احمد شاہ ابدالی کے زیر سایہ ہے۔ اس غداری سے انہوں نے بادشاہ قندھار احمد شاہ ابدالی کے غضب کو پکارا اور پنجاب کو مغلیہ سلطنت کا حصہ قرار دے کر مغل بادشاہ سے سند حکومت حاصل کی۔ ان کی اپنے آقا سے غداری اور نمک حرامی کی وجہ سے کشور پنجاب میں نظم حکومت بگڑ گیا۔ سکھوں کی شورش کچلنے کی مہم ناکام ہوئی بلکہ خالصہ بگڑ گئے اور مسلمانان پنجاب کے جان و مال کا نقصان ہوا۔ امت اور سلطنت کمزور ہوئی، دین کے دشمن مضبوط ہو گئے۔ خواجہ مرزا خان نے بادشاہ کا تل، قندھار کی فوجوں کے خلاف جنگ کی اور ذلت آمیز شکست اٹھائی۔ اس لڑائی میں دونوں طرف مسلمانوں کے جان و مال تلف ہوئے۔ ان کی نمک حرامی اور غداری کی وجہ سے اہالیان پنجاب اور لاہور کو تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔“

فرد جرم پڑھی جا چکی تو خواجہ مرزا خان کو حکم دیا گیا کہ وہ کھڑے ہو جائیں، وہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

”اس بارے میں تم کچھ کہنا چاہو تو بیگم عالیہ کی طرف سے اجازت ہے“۔ فرد جرم سنانے والے نے کہا۔

خواجہ مرزا خان سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

حاضرین ان کی اور مغلانی بیگم کی طرف دیکھتے رہے انہیں امید تھی کہ ابھی جلاد کو بلا کر ان کی گردن تن سے جدا کر دی جائے گی۔ مغلانی بیگم نے خواجہ مرزا خان ان کے ساتھیوں اور حاضرین کو غور سے دیکھا اور مجرم کو بعد برخاست دوبارہ قید خانہ پہنچا دینے کا حکم دیا۔

بھکاری خان رستم جنگ اپنے خلاف فرد جرائم سننے کے لئے کھڑے ہوئے تو ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسی دیوان عام میں جس کی شمعیں ان کے جاہ و جلال کے سامنے ماند پڑ جاتی تھیں، وہ ایک مجرم کی حیثیت میں کھڑے تھے۔ وہ اپنے پاؤں پر نظریں جمائے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مغلانی بیگم، جہان خان، امان خان، خواجہ عبداللہ خان، امراء، شرفاء، علماء، وخواص سب کی نگاہیں معین الملک میر منو کے دست راست امیر الامراء بھکاری خان رستم جنگ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پنجاب کا دارالحکومت لاہور وہی تھا شاہی قلعہ اور اس کا دیوان عام بھی وہی تھے۔ امرائے دربار اور بہت سے خدام وہی تھے مگر زمانہ وہ نہیں تھا دربار لاہور کا سب سے لائق تجربہ کار اور ہوشیار جرنیل سب سے بڑے مجرم کی حیثیت میں سب کے درمیان ایسے کھڑا تھا جیسے اپنی روح کی جلد پرواز کی دعا مانگ رہا ہو، وہ اپنے جرائم سے خود آگاہ تھا۔ حاضرین و سامعین سب ان کے گناہوں سے واقف تھے۔ کسی کے دل میں ان کے انجام کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا پھر بھی سب فرد جرم پڑھنے والے کی آواز سننے کے لئے بے چین معلوم ہوتے تھے۔

”بھکاری خان رستم جنگ بقائمی ہوش و حواس بذات خود دربار عام میں موجود ہیں۔ حاکم کشور پنجاب عالی مرتبت مغلانی بیگم کے حکم سے انہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کے جرائم کی جو تفصیل پیش کی جارہی ہے اس پر اگر انہیں کوئی اعتراض ہو اور وہ کسی بات کی تردید یا تصحیح کرنا چاہیں تو انہیں اس کا پورا حق ہوگا۔ انہیں اپنی صفائی میں گواہ پیش کرنے کی بھی پوری آزادی ہے“۔ باآواز بلند اعلان کیا جا چکا تو فرد جرم پڑھنے والا ایک لمحے کے لئے رک گیا اور پھر بستہ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ ”بھکاری

خان اس ایوان پنجاب کا سب سے بڑا مجرم ہے۔ نواب معین الملک مغفور کی وفات کے بعد کشور پنجاب کے حالات کی خرابی کا سب سے زیادہ ذمہ دار بھکاری خان ہے۔ نواب مغفور نے اسے سب سے بلند منصب پر فائز کیا۔ اس پر سب سے بڑھ کر لطف و کرم اور اعتماد کیا مگر ان کی وفات کے بعد سب سے زیادہ نمک حرامی اور بے وفائی اسی نے کی۔ نواب مغفور کی وفات کے بعد اس نے کھلی بغاوت اور حضور عدولی کی۔ بیگم عالیہ نے نواب امین الدین کے خلاف فوجی سرداروں کو بغاوت پر اکسایا۔ اس کے اتنے بڑے جرم سے درگزر کرتے ہوئے بیگم عالیہ نے نہایت لطف و کرم سے کام لیتے ہوئے اسے امیر الامراء کے منصب پر بحال رکھا مگر یہ اپنی سازشوں سے باز نہ آیا۔ نواب امین الدین کے خلاف بغاوت کے لئے فوج اور اسلحہ جمع کیے اور خواجہ مرزا خان کو کشور پنجاب کی حکومت پر غداری سے قبضہ کرنے کی ترغیب دی اور اس سازش میں اس کی مدد کی۔ اسی مجرم نے پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کو لاہور میں جمع کر کے ان سے دستاویز تیار کروا کر شاہجہان آباد کے مغل بادشاہ سے سند حکمرانی کے حصول میں اس کی مدد کر کے بادشاہ کابل و قندھار احمد شاہ ابدالی کے غضب کو دعوت دی۔ بھکاری خان کی بغاوتوں اور سازشوں سے دین کے دشمن مضبوط ہوئے امن اور سلطنت کمزور ہوئی۔ بھکاری خان جیسا بے وفا نمک حرام سازشی اور احسان فراموش منصب دار پورے ہندوستان اور کابل و قندھار کی تاریخ میں نہیں گزرا"۔

فرد جرم مکمل ہو گئی مگر بھکاری خان نے اس دوران ایک لمحہ کے لئے بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا وہ اسی طرح بے حس کھڑا رہا۔

دربار میں مکمل خاموشی تھی۔

ایک کونے میں ایک نوجوان کھڑا ہو گیا بیگم نے خدام کو اشارہ کیا وہ دوڑ کر اسے پکڑ کر جھروکے کے سامنے لے آئے۔ "گستاخی اور کارروائی میں مداخلت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں اگر یہ جرم درگزر فرمایا جائے اور اجازت بخشی جائے تو بندہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے"۔ باریش نوجوان نے آداب بجا لا کر استدعا کی۔

"تمہاری عرض بھکاری خان کے خلاف فرد جرم سے متعلق ہے؟" مغلانی بیگم نے پوچھا۔

"جی بیگم عالیہ بھکاری خان اس خاکسار کا بھی مجرم ہے اور اس کا وہ جرم اس فرد جرم میں شامل نہیں"۔ نوجوان نے عرض کیا۔

"ہم سمجھتے ہیں نوجوان جو کہہ رہا ہے اس کا مطلب اچھی طرح جانتا ہے۔ بے بنیاد الزام لگانے سے خود اسے سزا بھگتنی ہو گی"۔ بیگم نے گھورتے ہوئے کہا۔

"بندہ غلط بات اور الزام کے لئے جو سزا حضور تجویز فرمادیں بخوشی بھگتنے کے لئے تیار ہے"۔ نوجوان نے ایک بار پھر سلام کیا۔

"ہم سچ سننے پر خوش اور جھوٹ سن کر ناراض ہوں گے۔ بیان کرو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

"حضور میں ایک شاعر ہوں۔ بھکاری خان نے مجھے گرفتار کر کے قتل کروانے کا حکم جاری کیا۔ عمال سرکار مجھے ڈھونڈتے رہے، جان بچانے کے لئے بندہ کو گھر اور شہر سے فرار ہونا پڑا اور در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ اس سے میرے بال بچوں کو سخت مشکلات درپیش رہیں"۔ نوجوان نے کہنا شروع کیا تو بھکاری خان نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جس شاعر کو وہ اور اس کے عمال تلاش کر کے ہار گئے تھے وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہارا جرم؟" مغلانی بیگم نے پوچھا۔

"حضور! اس خاکسار کا جرم یہ تھا کہ اس نے یہ لکھ دیا کہ بھکاری خان رستم جنگ نے اپنے اختیارات اور جبر سے غریب عوام سے دولت چھین کر مسجد بنوا کر خدا تعالیٰ کو

دھوکہ اور رشوت پیش کی۔ خاکسار اس جبر اور ظلم کو برداشت نہ کر سکا۔ ایک شاعر تلوار نہیں اٹھا سکتا، شعر کہہ سکتا ہے۔ خاکسار نے شعر لکھ کر ان کی مسجد کے دروازے پر چسپاں کر دیئے۔ اس سچ کے جرم میں انہوں نے خاکسار کی گرفتاری اور موت کا حکم جاری کر دیا"۔

جو حاضرین نگاہیں نیچی کئے بیٹھے تھے۔ سب نوجوان کی طرف دیکھنے لگے جہان خان اور امان خان دلچسپی سے نوجوان کا بیان سننے لگے۔

"ہم چاہیں گے کہ اس نظم کا وہ حصہ پیش کیا جائے جس کی بناء پر بھکاری خان کو وہ حکم جاری کرنا پڑا"۔ مغلانی بیگم نے حکم دیا۔

"نوجوان شاعر نے مجرا ادا کیا جیب سے کاغذ نکال کر نظم پڑھنے لگا جب وہ اس شعر پر پہنچا۔

"بنا کرد مسجد بھکاری خان باشت
زر ناروا زنده بگرفت و از مرد و گذشت"۔

نو جہان خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، حاضرین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دی۔ حاضرین اور احمد شاہ ابدالی کے فاتح جرنیل کے تاثرات کا اندازہ کر کے شاعر ایک بار پھر رکوع میں چلا گیا اور ایک بار پھر یہ شعر پڑھ کر کہا۔ "انصاف کا ترازو حضور کے ہاتھ میں ہے کہ کیا اس شعر میں جھوٹ کی ملاوٹ ہے؟"

"تم نے تب ہم تک عرضداشت کیوں نہ بھیجی؟" مغلانی بیگم نے پوچھا۔

"حضور سارا شہر اور عمال اس ظلم سے بھکاری خان کے حکم اور اس غریب کی مصیبت سے آگاہ تھے، میں نے سوچا حضور کے پرچہ نویسوں نے حضور کو آگاہ کر دیا ہو گا"۔

"افسوس ہے کہ ہمیں اس بارے میں بے خبر رکھا گیا اور اس وجہ سے تمہیں مصائب درپیش رہے"۔ مغلانی بیگم نے کہا اور کاتب کو مخاطب کیا۔ "نوجوان شاعر کا بیان اور نظم شامل فرد جرم کر لئے جائیں"۔

شاعر نے جھک کر سلام کیا تو بیگم نے کہا۔ "جو منصب دار اپنے آقا سے غداری کرتا ہے وہ رعایا سے بھی انصاف نہیں کر سکتا"۔

"نواب بھکاری خان نوجوان کے الزام کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں تو انہیں آگاہ کیا جائے"۔ مغلانی بیگم نے چوبدار کو مخاطب کیا۔

چوبدار نے باآواز بلند اعلان کیا مگر بھکاری خان سر جھکائے کھڑا رہا۔ دربار میں بہت سے وہ لوگ موجود تھے جو اس "جرم" اور بھکاری خان کے احکامات سے واقف تھے۔

شاعر نے ایک بار پھر سلام کیا۔ "حضور کے کرم اور انصاف کے لئے شکر گزار شاعر کی عرض ہے کہ محسن پنجاب میر منو مغفور اور ان کے کم سن فرزند کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا بھکاری خان کا جرم عظیم بھی فرد جرائم میں شامل کیا جائے اور ساکنان پنجاب کو اس بارے میں بھی انصاف عطا کیا جاوے"۔

"یہ جرم ساکنان پنجاب کے علاوہ ہماری ذات سے بھی متعلق ہے۔ جب تک تحقیق مکمل نہ ہو جائے ہم یہ درخواست قبول کرنے سے معذور ہیں۔ جرم ثابت ہونے پر مناسب فیصلہ کیا جاوے گا"۔ مغلانی بیگم کی آواز پہلی بار کانپ گئی۔

شاعر نے جھک کر سلام کیا اور اجازت حاصل کر کے جھروکے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

"بھکاری خان کی خاموشی ان کا اعتراف جرم ہے، انہیں بھی بعد برخاست دربار کالے برج کے قید خانہ میں پہنچا دیا جائے"۔ بیگم نے حکم دیا۔

سپاہیوں نے آگے بڑھ کر بھکاری خان کو گھیرے میں لے لیا۔

"جن ترک اور مغل امراء نے غداری اور نمک

حرانی کی ہم انہیں غفت اور سلطنت کی خدمت کا ایک اور موقع دینا چاہتے ہیں لیکن جن فوجی سرداروں نے اپنا فرض ادا کرنے کی بجائے غداری اور سازش میں حصہ لیا۔ ان کو سزا دینا طرت اور سلطنت کے مفاد کے لئے لازم ہے انہیں بھی قید خانہ میں ڈال دیا جائے"۔ مغلانی بیگم نے کہا اور دو بار برخاست کر دیا۔

سورج شاہی مسجد کے میناروں کی بلندیوں سے اتر رہا تھا قلعہ کی بلند عمارتوں کے سامنے باہر جانے والے راستوں پر قابض ہو چکے تھے۔ جب نرکا نے دو بار چانی رچو بند افغان سپاہیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے لب بستہ اپنے گھروں اور خواجوں کی طرف واپس جا رہے تھے۔

***

خواجہ عبداللہ خان ہمیشہ اقتدار کی سازشوں سے الگ رہا تھا۔ اپنے بھائی ذکریا خان اور بھتیجوں یحییٰ خان اور شاہنواز خان کے دور میں بھی اس نے کبھی حکومت کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ لمبا قد، موٹی آنکھیں، گورا رنگ اور سیاہ داڑھی اور دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اس نے درباری ماحول میں پرورش پائی تھی۔ درباری آداب اور طرز گفتگو جانتا، امراء اور درباریوں کی سازشوں سے واقف تھا اس لئے جب وہ مغلانی بیگم کے سفارت کار کی حیثیت میں احمد شاہ ابدالی کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور واپسی کے وقت اسے نائب حاکم پنجاب کی سند عطا کر دی۔ احمد شاہ ابدالی کی خواہش تھی کہ پنجاب میں امن و امان قائم ہو اور مغلانی بیگم کا نائب کوئی با اعتماد آدمی ہو جو نظم اور امن کے قیام میں فعال کردار ادا کر سکے۔ خواجہ مرزا خان کو گرفتار کرنے کے بعد جہان خان نے خواجہ عبداللہ خان نادر بیگ اور سرفراز خان کے مشورہ سے بھکاری خان اور خواجہ مرزا خان کے ایسے ساتھی امراء اور سرداروں کی فہرست بنوائی جو درباری سازشوں کے عادی ہو چکے تھے اور جن کی جاہ پسندی اور خودسری کی وجہ سے پنجاب میں ہر طرف بربادی اور سرکشی پھیل رہی تھی۔

لاہور کا انتظام چمن لال کے سپرد کرنے کے بعد افغان فوجدار نے قلعہ کا چارج نادر بیگ کے سپرد کر دیا اور افغان فوج کا کیمپ راوی سے اس پار مقبرہ جہانگیر کے عقب میں منتقل کر دیا گیا تھا مگر قلعہ کی جیل پر اب بھی افغان سپاہیوں کا پہرہ تھا اور وہ سب درباری اور سردار اسی جیل میں بند تھے۔ ایک شام قیدیوں میں کھانا تقسیم ہو چکا تو پہریداروں کے کماندار کے حکم پر بھکاری خان کو اس کی کوٹھڑی سے نکال کر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور ہاتھ آہنی زنجیروں سے کمر پر باندھ دیئے اور سب بند سربند قیدیوں کو ایک جگہ جمع کر کے بھکاری خان کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ کماندار سپاہی پہریدار بھکاری خان اور قیدی سب خاموش رہے اس سارے عمل کے دوران کسی نے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ جب سارے قیدی اچھی طرح بھکاری خان رستم جنگ کی بے بسی کا نظارہ کر چکے تو سپاہی انہیں جیل سے نکال لے گئے۔ جب تک وہ نظر آتا رہا قیدی دیکھتے رہے اور جب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو چشم تصور سے اس کے انجام کا اندازہ کرنے لگے۔

شیش محل کے بیرونی دروازے پر افغان سپاہی بھکاری خان کو دربانوں کے حوالے کر کے واپس لوٹ گئے۔ دربانوں نے اپنے سابق امیر الامراء کو خواجہ سراؤں کے حوالے کر دیا اور خواجہ سرا اسے شیش محل کے اندر لے گئے جہاں مغلانی بیگم، جہان خان خواجہ عبداللہ اور نادر بیگ بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

ادھیڑ عمر جرنیل کو بھاری بیڑیوں کے ساتھ چلا کر لایا گیا تھا۔ اس کی سانس اکھڑ گئی تھی، جسم پسینے سے شرابور تھا اور چہرے پر روح اور جسم کے درد کے آثار نمایاں تھے۔

وہ دیوان کے فرش کو ایسے دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی اور طرف دیکھنے کی عادت ہی نہ ہو۔

''جو منصب دار اپنے آقاؤں کو ہلاک کرتے ہیں، وہ ایک ہزار بار ہلاکت کے حقدار ہیں مگر افسوس ہم تمہیں ایک سے زیادہ بار ہلاک نہیں کر سکیں گے''۔ جہان خان نے کہا اور سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

اس کے ساتھ ہی پردوں کے پیچھے سے درجنوں کنیزیں برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں جوتے اور ڈنڈے تھے جن میں میخیں لگی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے بھکاری خان فرش پر پڑا چیخ رہا تھا اور کنیزیں ''یہ نواب حضور کے قتل کا بدلہ ہے''۔ پکار پکار کر اس پر جوتے اور ڈنڈے برسا رہی تھیں۔

جب وہ روئی کی طرح دھنکا جا چکا تو پردے کے پیچھے سے مغلانی بیگم نمودار ہوئی، اسے دیکھ کر سب کنیزیں پیچھے ہٹ گئیں۔ ''اس غدار کی لاش شہر سے باہر گندے نالے میں پھینک دی جائے''۔ اس نے مردہ جسم کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر حکم دیا۔

اگلی صبح جب اہل شہر ٹولیوں کی صورت میں گندے نالے میں بھکاری خان رستم جنگ کی لاش دیکھنے جا رہے تھے تو جہان خان اپنی سپاہ کے ساتھ قندھار روانہ ہو رہا تھا اور خواجہ مرزا خان، خواجہ معبد اور ان سب امراء اور سرداروں کو جو سازش اور سرکشی کے مجرم پائے گئے تھے، قید کر کے اپنے ساتھ قندھار لے جا رہا تھا۔

٭٭٭

ملاحوں کی بستی اندھیرے کی چادر میں منہ چھپانے سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر نوجوان ابھی تک چوپال میں بوڑھے ملاح کے گرد بیٹھے تھے۔ لڑائیوں اور بدامنی کی وجہ سے تجارتی قافلوں کی آمدورفت بہت کم ہو گئی تھی۔ گندم کی فصل اتنی خراب ہوئی کہ لاہور کی منڈی میں باہر سے اناج بہت ہی کم آ رہا تھا۔ نواب عبداللہ خان کی ساری کوششوں کے باوجود شہر میں گندم کی قیمت مسلسل بڑھ رہی تھی اس نے ناظم شہر چمن لعل کو اس کے منصب سے الگ کر دیا مگر حالات بہتر ہونے کی بجائے مزید خراب ہو گئے۔ ملاحوں کی آمدنی کم ہو گئی تھی اور گندم یا چاول خریدنا بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ بات بوڑھے ملاح کی جوانی کے دنوں سے شروع ہوئی تھی اور گندم آٹے تک پہنچ گئی تھی۔ ''لوگ کہتے ہیں اس عذاب کا سبب مغلانی بیگم ہو وے''۔ ایک ملاح نے بوڑھے سے کہا۔

''سنی تو ہم بھی پر وہ ہیے ہو وے، گھر میں جتنی ہمارے کو کچھ لے نہ پڑے''۔ دوسرے ملاح نے بزرگ کے جواب دینے سے پہلے کہا۔

''جس گھر میں بیوہ راج ہو وے وہ نہیں چلتا، پنجاب کیسے چلے گا۔ بات بالکل سیدھی ہے''۔ تیسرا ملاح بولا۔

''عورت ذات تو کشتی نہ چلا سکے، اتنا بڑا ملک کیسے چلا سکے گی''۔ ایک اور بولا۔

بوڑھا خاموش رہا۔

''اس کے بیٹے بھی تو ٹھیک نہیں''۔ کسی اور نے کہا۔

کالو کو مغلانی بیگم کے بارے میں ایسی باتیں پسند نہیں آئیں وہ اٹھ کر چل دیا۔

''اس کا وہ آدمی، روٹی کے سوال والا بھی اب تک نہیں آیا جانے کیا ہو گا اس کے گھر میں بھی مندا ہے''۔ ایک نوجوان نے پیچھے سے کہا۔

''کیا معلوم بھوک سے ہی مر گیا ہو، اب اسے کون دے گا آدھی روٹی''۔ ایک اور آواز آئی۔

کالو اور بھی افسردہ ہو گیا اس کی بیوی نے خواجہ خضر کے دیے جو سنہری سکے جمع کر رکھے تھے وہ کب کے ختم ہو چکے تھے۔ مغلانی بیگم کی قلعہ میں واپسی کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا مگر ابھی تک اس کے فقیر نے چکر نہیں لگایا تھا۔ اس کی بیوی کئی بار پوچھ چکی تھی کہ خواجہ خضر کہیں ناراض تو نہیں ہو

گئے؟ اسے فکر تھی کہ کہیں خواجہ نے اس کی کوئی بات نہ سن لی ہو۔ کالو ہر بار جواب دیتا۔ خواجہ صرف داوی کا خفر تھوڑا ہے اسے اتنی بڑی خدائی کے دربانوں پر حکومت کرتا ہے کہیں اور نکل گیا ہوگا۔" مگر پہلے خواجہ اتنی جلدی جلدی کیسے آ جاتے تھے؟ اس کا وہ کوئی مناسب جواب نہیں دے سکتا تھا۔

مغلانی بیگم کے بارے میں اپنی برادری والوں کی باتوں سے اسے بہت دکھ ہوا۔

"بابا! آپ کے زمانے میں بھی کوئی بیگم ہوئی پنجاب کی حاکم؟" ایک نوجوان نے بزرگ سے پوچھا۔

"ہمارے دنوں میں تو کیا ہمارے بزرگوں کے دنوں میں بھی ہم نے کسی بیگم کی حکومت نہیں سنی۔" بزرگ نے جواب دیا۔ "عورت مانجت ہوگی تو نحوست ہے، کنارہ ہوگی تو بربادی لائے گی۔ ہم نے تو یہی سنا ہے، دیکھا اب بھی سب دکھ رہے ہیں"۔

"مگر اب تو سنا ہے اس کا اپنا ماموں ہے اس کے ساتھ بہت سمجھدار اور بہادر بتاتے ہیں"۔ ایک نوجوان نے کہا۔

"سمجھدار ہو یا بہادر حکم تو اس سے لیتا ہے، مرضی تو اس کی چلتی ہے۔ اس سے تو اور خرابی آئے گی"۔ بوڑھے ملاح نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مگر اس نے تو لاہور والوں کی خوب پٹائی کی، شہر کے دروازوں پر فوج بٹھا کر سب سے کہا۔ لاؤ پیسے جس کے پاس تھے وہ چھین لئے جس کے پاس نہیں تھے۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دی لاہور میں ایسے تو کبھی باہر والوں نے بھی نہ کیا تھا"۔ ایک ملاح نے دکھ سے کہا۔

"اتنا ظالم وہی مرد ہوگا جو کسی عورت سے خوفزدہ ہو گا۔ بیگم کو خوش رکھنے کے لئے وہ معصوموں کو پھانسی بھی چڑھا سکتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہم شہر کی دیوار سے باہر ہیں ورنہ کیا معلوم وہ ہماری جھونپڑیوں میں بھی فوج بھیج دیتا"۔ بزرگ افسردہ ہو گیا۔

خواجہ عبداللہ خان کو فوج بھرتی کرنے اور صوبہ کا نظم چلانے کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی دوابہ جالندھر سے آدینہ بیگ نے کئی سال سے مالیہ کی رقم ادا نہیں کی تھی۔ خواجہ مرزا خان کے دور میں جو رقم خزانہ میں آئی وہ اس کے ساتھ ختم ہو گئی تھی، جو بچی تھی وہ جہان خان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ صوبہ میں ہر طرف سرکشی اور بدحالی تھی، کہیں سے مالیہ آنے کی امید نہیں تھی۔ سکھوں کی سرکشی ختم کرنے اور امن بحال کرنے کے لئے فوج کی ضرورت تھی اور فوج اکٹھی کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ لاہور کے امراء اور شرفاء سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے اس نے ان پر بھکاری خان کا ساتھ دینے کا الزام لگایا اور شہر کے دروازے بند کر کے جس سے جو ملا چھین لیا۔

حکومت کا انتظام خواجہ عبداللہ خان اور لاہور میں احمد شاہ ابدالی کے نمائندہ مہدی خان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ دونوں مل کر روپیہ جمع کرنے اور فوج بھرتی کرنے لگے۔ دونوں مغلانی بیگم کی عزت اور احترام کرتے تھے لیکن صوبہ کے انتظامی معاملات میں اس کے احکامات کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ مغلانی بیگم کو ان کی یہ خود مختاری پسند نہیں تھی مگر اب وہ مالی سیاسی اور انتظامی طور پر پہلے جتنی مضبوط نہیں تھی۔ جاسوسی کا اس نے جو مربوط نظام قائم کر رکھا تھا۔ بابا خان ولی کے غائب ہو جانے سے وہ ابھی بحال نہیں ہو سکا تھا۔ جہان خان کے حملہ سے پہلے وہ لاہور سے فرار ہو گیا تھا۔ خواجہ عبداللہ خان کے نائب ناظم ہو جانے کے بعد اس کو اس کام پر لگانا ممکن نہیں تھا کیونکہ خواجہ اس کی حقیقت سے واقف تھا۔

خواجہ مرزا خان کی بغاوت کے بعد احمد شاہ ابدالی کو احساس ہو گیا تھا کہ پنجاب میں کسی مضبوط حکمران کی ضرورت ہے جو سکھوں کی شورش دبا کر امن بحال کر سکے اور صوبہ کے شاہجہان آباد کے ساتھ جانے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے

اس نے مہدی خان کو اپنا نمائندہ بنا کر لاہور میں متعین کر رکھا تھا مگر مغلانی بیگم کو جو اقتدار سے آشنائی حاصل کر چکی تھی۔ شیش محل میں قیام اور عزت و احترام والی حکمرانی پسند نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر فوج کو ساتھ ملانے کا نسخہ استعمال کرنا شروع کر دیا اور نائب بیگ کے ذریعے فوجی سرداروں سے خطابات، ترقیوں اور اعزازات کے وعدے کرنے لگی۔

مغلانی بیگم کے گھریلو ملازمین کو بھی خواجہ عبداللہ خان کی طاقت اور مغلانی بیگم کی کمزوری کا اندازہ ہو گیا تھا۔ طہماس خان نے جو پہلے بھکاری خان اور خواجہ مرزا خان کی خدمات انجام دے چکا تھا، ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور خواجہ عبداللہ خان کو مغلانی بیگم کے ارادوں اور ان کی کوششوں سے آگاہ کرنے لگا۔

خواجہ عبداللہ خان کے والد اور مغلانی بیگم کے نانا حاکم پنجاب نواب عبدالصمد خان نے قلعہ سے شالا مار باغ جانے والی سڑک کے کنارے بیگم کوٹ کے قریب ایک وسیع باغ لگوایا تھا۔ اس باغ کے درمیان میں ایک خوبصورت بارہ دری تھی۔ نواب کی بیوی شرف النساء بیگم دن کا زیادہ حصہ اسی بارہ دری میں قرآن خوانی میں گزارتی تھی۔ غروب آفتاب کے قریب وہ قرآن بند کر کے اس پر تلوار رکھ کر اپنے محل روانہ ہو جاتی اور اگلے روز آ کر وہیں سے قرآن پڑھنا شروع کر دیتی۔ نواب عبدالصمد خان کی وفات کے بعد بیگم نے اپنے تمام زیورات اور زر و جواہر بیچ کر شاہ چراغ کے مزار پر مسجد اور علماء کے لئے حجرے تعمیر کروا دیئے اور وصیت کی کہ جب وہ فوت ہو تو اسے نواب مرحوم کے باغ کی اسی بارہ دری میں دفن کیا جائے اور وہ قرآن اور تلوار بھی اس کے ساتھ ہی دفن کر دیئے جائیں۔ اس کے بیٹے نواب زکریا خان نے ماں کی قبر پر خوبصورت مقبرہ تعمیر کرا دیا تھا۔ ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو اس سرو والا مقبرہ پر قرآن خوانی ہوتی تھی اور مرحومہ کی اولاد میں سے جو کوئی لاہور میں موجود ہوتا اس محفل میں شرکت کرتا تھا۔

اس روز لاہور پر ساون کھل کر برسا بادل اور گلیاں اچھی طرح دھل گئے۔ جب مغلانی بیگم کا قافلہ سرو والا مقبرہ کے لئے روانہ ہوا تو اہل لاہور ٹولیوں کی صورت میں راوی کی طغیانی مزاجی کا نظارہ کرنے جا رہے تھے۔ اقتدار اور قلعہ میں واپسی کے بعد سے مغلانی بیگم پہلی بار اپنی نانی کے مزار پر قرآن خوانی کی مجلس میں شرکت کرنے جا رہی تھی۔ حاجت مندوں اور قرآن خوانوں کے لئے بیش قیمتی تحائف، مزار کے لئے سنہری غلاف اور پھولوں کی ٹوکریاں ساتھ تھیں جس کسی نے ان کے قافلہ کو دیکھا تبصرہ کیا۔ ”نواسی نانی کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل کرنے چلی ہے“۔ بیگم صاحب نے زندگی بھر نیکیاں کمائیں۔ موت کے بعد آل اولاد ثواب پہنچاتی ہے“۔ ”نیک ماں نیک اولاد“۔ ”حاکم پنجاب لوگوں پر اپنی دودھ پیتی نانی کی بزرگی کا رعب ڈالنے جا رہی ہے“۔ ”نانی کو بتانے جا رہی ہے کہ تمہارا نواسہ پنجاب کا حاکم تھا میں خود پنجاب پر حکومت کر رہی ہوں۔ تم مجھے مبارکباد دو اور دعا کرو“۔ ”اقتدار میں واپسی کے بعد اس پر قابض رہنے کے لئے اس نیک خاتون سے مدد حاصل کرنے چلی ہے“۔ ”نانی سے منت سماجت کرنے جا رہی ہے کہ اپنے بیٹے کو تم ہی کچھ سمجھاؤ“۔ زندہ دلان لاہور اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے رہے اور حاکم پنجاب کا قافلہ باغ کی طرف رواں دواں رہا۔

حفاظتی دستہ اور خدام باغ کی ڈیوڑھی میں رک گئے بیگم پالکی میں بیٹھ کر مزار تک پہنچی، باغ کے گرد فوجی دستہ متعین تھا۔ اندر قلعہ کے خدام اور کنیزیں بھی بیگم کے ساتھ رہیں۔ بیگم نے مزار کے سرہانے بیٹھ کر خود ایک پارہ تلاوت کیا۔ خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ نذرانے اور تحائف تقسیم کئے اور سنہری غلاف قبر کے تعویذ پر چڑھا دیا

گیا۔ واپسی سے قبل بیگم کتنی ہی دیر قبر کے سرہانے کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ اس کی چال اور چہرے سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بہت زیادہ افسردہ لوٹ رہی ہے۔ کہاروں نے پالکی میں سوار کر کے پردہ گرا دیا تو خدام آگے پیچھے چلنے لگے۔ ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر خواجہ سراؤں اور کنیزوں کی چیخیں سن کر بیگم نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو بندوقوں سے مسلح سوار دستے نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ بیگم نے بڑے اطمینان سے صورت حال کا جائزہ لیا اور حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ ''تم کون ہو اور تمہارا کمانڈار کون ہے؟''

ایک چاق و چوبند نوجوان نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' بیگم نے غصہ سے پوچھا۔

''ہم حضور کے خادم اور خواجہ عبداللہ خان کے ملازم ہیں''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''یہ کیسی خدمت ہے؟'' بیگم اور بھی غصہ میں آ گئی۔

''ہم اپنے آقا کے حکم کے پابند ہیں''۔ نوجوان نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''کیا حکم ہے تمہارے آقا کا؟'' بیگم نے پوچھا۔

''ہمیں حکم ہے کہ حضور کو عزت و احترام کے ساتھ حضور کی والدہ محترمہ کی حویلی پہنچا دیا جائے''۔ نوجوان نے بتایا۔

''اگر ہم نہ جانا چاہیں تو؟''

''ہم اپنے آقا کا حکم ماننے پر مجبور ہوں گے''۔ نوجوان نے اعتماد سے جواب دیا۔

مغلانی بیگم کے حفاظتی دستہ کا کوئی بھی سپاہی وہاں موجود نہ تھا۔ ان کے قافلہ کے ساتھ آنے والی سواریاں غائب تھیں۔ ان کے ساتھ صرف پالکی اٹھانے والی کنیزیں اور چند خادم رہ گئے تھے اور باغ کے باہر ڈیڑھ دو ہزار مسلح سواران کے منتظر کھڑے تھے۔ انہوں نے پالکی کو بردہ کرا دیا۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی اور سواروں نے جلوس کے ساتھ بیگم پورہ میں دوران بیگم کی حویلی پہنچا دیا۔ پالکی حویلی کے اندر چلی گئی تو اس کے ساتھ آنے والی فوج نے حویلی کے سامنے کیمپ لگا لیا۔ اسی شام شبینہ محل سے بیگم کے خدام خواجہ سرا اور کنیزیں بھی وہاں پہنچا دیے گئے۔ دوسرے روز طہماس خان نے اطلاع دی کہ خواجہ عبداللہ خان نے نادر بیگ اور سرفراز خان کی گرفتاری کا حکم دے دیا ہے۔

آزادی اور تخت حکمرانی کے تیرہ ہفتے گزارنے کے بعد ایک بار پھر مغلانی بیگم اپنی ماں کی حویلی میں نیم قیدی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی جہاں کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور چند ملازمین کے علاوہ کوئی حویلی سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری قید بندی پہلی کی نسبت زیادہ سخت اور دشوار تھی۔

مغلانی بیگم کو حویلی میں بند کرنے کے بعد مہدی خان اور خواجہ عبداللہ خان نے حکومت اور نظم پر گرفت مضبوط کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ سب سے بڑی مشکل ایسی فوج تیار کرنا تھی جو صوبے میں امن بحال کر سکے۔ اس میں ایک رکاوٹ روپے کی کمی تھی اور دوسری تجربہ کار فوجی سرداروں کا نہ ملنا۔ مغل اور ازبک سرداروں میں سے کچھ جہان خان اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا۔ کچھ بھکاری خان کے قتل اور اس کے حامی امرا کی تذلیل کے بعد تعاون پر آمادہ نہیں تھے۔ مرزا کریم بخش اور اس کی سپاہ پر خواجہ عبداللہ اعتماد کے لئے تیار نہ تھا اس کے فوجی بکھرنے لگے تو ایک شب کیمپ اٹھا کر وہ بھی چپکے سے روانہ ہو گیا تھا۔ ان ساری مشکلات کے باوجود خواجہ عبداللہ خان یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پنجاب پر حکومت کی اہلیت رکھتا ہے۔

(جاری ہے)

پنڈت نے اسے کہا تھا کہ لڑکی اب تم ناری نہیں ناگن بن چکی ہو تم اپنے کسی بھی دشمن کو جب چاہو ہلاک کر سکتی ہو۔

قسط:10 .... 0314-4652230, 0303-9801291 .... محمد افضل رحمانی

لڑکی نے دروازہ کھولا، جوگی اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی اندر آ گئے۔

"مہاراج! اس لڑکی کو سانپ نے ڈس لیا ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "اسے بچانے کی کوشش کرو"۔

"بالک کچھ نہیں ہوگا، ناگن کو ناگ نے ڈس لیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا"۔ جوگی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم بتاؤ جنگل میں وہ وغیرہ تو نہیں اور کیا بھوجن وقت پر مل جاتا ہے؟"

"مہاراج بھوجن وقت پر بھی اور میری من مرضی کا بھی"۔ میں نے کہا۔ "یہ لڑکی بہت اچھی ہے، اس نے میری بہت خدمت کی ہے لیکن کیا یہ واقعی ناگن ہے؟"

"ہاں، بالک! یہ واقعی ناگن ہے۔ اس نے کنکن دھن پلٹی ہوئی ہے۔ تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ سو سال بعد سانپ اپنی دھن پلٹ سکتا ہے"۔

"مہاراج یہ تو میں نے سنا ہوا ہے"۔

"تو بس، یہ سو سال کی ہو گئی ہے، اب اس نے دھن پلٹی ہوئی ہے اور اب یہ ایک سندر ناری کے روپ میں آ گئی ہے"۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور غور سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جو ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اور اس کے اوپری دانتوں کے خلا سے روشنی پھوٹتی پڑ رہی تھی۔

"میں جاتی دفعہ اسے منع کر گیا تھا کہ تمہیں ڈسنے کی کوشش نہ کرے"۔ جوگی نے مزید کہا۔ "ویسے جب تم مجھے ٹوٹی بنڈلی کے ساتھ ملے تھے تو اس وقت میں بہت خوش ہوا تھا کہ ناگن کو ڈسنے کا موقع مل گیا ہے لیکن تمہاری آپ بیتی سن کر میں نے ارادہ بدل لیا، تم جیسے سندر جوان کو زندہ رہنا چاہئے"۔

جوگی کی زبانی سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی یہ لڑکی نہیں، ناگن ہی ہے ویسے بھی اگر وہ لڑکی ہوتی تو اب تک مر چکی ہوتی۔ سانپ کے ڈسنے کے بعد اس کا زندہ رہنا کافی ثبوت تھا کہ وہ آدمی نہیں ناگن ہی ہے۔ اب مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ میرے قریب آئی تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بیاری ناگن میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم نے مجھے ڈسا نہیں"۔

"دیکھو جوان! میرے بجائے تمہیں جوگی مہاراج کا شکریہ ادا کرنا چاہئے"۔ اس نے کہا۔ "اگر وہ مجھے منع نہ کر گئے ہوتے تو ہو سکتا ہے میں تمہیں ڈس لیتی اور پھر تمہارے سارے شریر میں زہر دوڑتا پھرتا اور جلد ہی تمہارا کریا کرم ہو جاتا"۔

"لیکن تم ناگن ہو تو بھی اتنی سندر کیوں ہو؟"

"یہ سندرتا تو کچھ بھی نہیں"۔ اس نے کہا۔ "آدھے گھنٹے بعد دیکھنا میرے سندرتا میں مزید اضافہ ہو جائے گا"۔ اور پھر کچھ دیر بعد جب دوبارہ میرے کمرے میں آئی تو اس کے روپ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ پیازی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی، اس کا ایک لگا چولی ہوا تھا جس سے اس کا کندن رنگ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔ چوٹی سیاہ رنگ کی ناگن کی طرح اس کی کمر سے نیچے تک لہرا رہی تھی، آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر دنداسے کا رنگ، اوپری دانتوں کے خلا سے پھوٹنے والی روشنی، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسیت، وہ واقعی کسی ناگن کی طرح بل کھاتی، لہراتی ہوئی میری طرف بڑھی تو مجھ پر اس کے حسن کا طلسم طاری ہونے لگا۔

"دیکھو سندری!"

"سندری نہیں ناگن"۔ وہ جلدی سے بولی۔

"چلو ٹھیک ہے، سندری ناگن"۔

اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ "دیکھو جوان ناگن بھی کبھی سندری ہوئی ہے تم مجھے صرف ناگن کہو"۔

"لیکن تم نے مجھے سندری کہنے کی اجازت دی تھی"۔ میں نے اسے یاد دلایا۔

وہ زور سے ہنسی اور پھر یک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

''دیکھو جوان! اگر میں ناگن سے ناری بن گئی تو میں شیو جی مہاراج کی سوگند (قسم) کھا کر کہتی ہوں کہ تم سے ایسا پریم کروں گی کہ تیری آتما خوش ہو جائے گی لیکن جب تک میں ناری نہ بن جاؤں تم مجھے ناگن ہی کہو۔ تم کو معلوم نہیں کہ میں ایک دیوداسی ہوں جسے اجودھیا کے ایک مندر کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ میرا کام ناچنا گانا اور پنڈت پجاریوں کا دل بہلانا تھا۔ دیوتا وُں کا کرپا ہے جو انہوں نے مجھ ابھاگن کو اپنی سیوا کے لیے مخصوص کر لیا۔

''پھر تم جوگی مہاراج کے پاس کیا کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہیں تو کسی مندر میں ہونا چاہئے تھا''۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے اور میرے دھرم کا ایک راز بھی جو میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی''۔

''کیا تمہیں مجھ سے پریم نہیں ہے؟''

''کیوں، تمہیں میری بات پر یقین نہیں ہے؟''

''نہیں، تم مجھ سے کچھ چھپا رہی''۔

''ہاں، جوان! تم ٹھیک کہتے ہو پرنتو ابھی بتانے کا سمے نہیں آیا''۔

''اچھا یہ بتا کہ تیرے حسن کا راز کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''رات سے صبح کے وقت تو زیادہ حسین تھی اور اب صبح سے بھی زیادہ''۔

''یہ میرا نہیں ناگ دیوتا کا کمال ہے۔ جب ناگ دیوتا اپنا وِش میرے جسم میں منتقل کرتا ہے تو میرا سارا شریر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے اور اس پر مزید یہ کہ میں نے تمہارے درشن کے لئے اپنے آپ کو سنوارا سجایا بھی ہے''۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے جوگی کی آواز آئی، ''ناگن! ادھر باہر آؤ''۔

''اچھا جوان! جوگی مہاراج مجھے بلا رہے ہیں''۔

''ٹھیک ہے ناگن! تم جاؤ لیکن جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا''۔

وہ گھنٹوں دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ مجھے اپنے اکیلے پن کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ ناگن کی تن کی جدائی بھی میری حد برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ مزید ایک گھنٹہ اور گزر گیا ہو گا کہ جوگی اور دوسرا آدمی کمرے میں میرے پاس آئے۔ نو وارد نے مجھے سلام کیا میں سمجھ گیا کہ یہ مسلمان ہے۔ وہ چہرے سے ایک معزز اور بارعب آدمی نظر آ رہا تھا۔

''رکھشا! یہ تمہارا ہم مذہب آدمی ہے''۔ جوگی نے کہا۔ ''ان کا نام حکیم فیض اللہ ہے۔ بھگوان نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا رکھی ہے۔ میں نے تمہاری ٹوٹی ہوئی پنڈلی سے متعلق بھی انہیں بتایا ہے اور ان سے کچھ مزید مشورے لئے ہیں''۔

میں نے سعادت مندی سے ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے تسلی دلاسہ دینے لگے کہ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں خدا حافظ!''

''رکھشا! ابھی انہیں اوداع کہہ آؤں، میں ابھی آیا''۔ جوگی نے کہا۔

''ٹھیک ہے مہاراج! لیکن وہ ناگن کہاں چلی گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ابھی آ جاتی ہے، باہر میرے لئے بھوجن تیار کر رہی ہے''۔ ان کے باہر جانے ہی میں نے زور سے آواز لگائی۔ ''میری پیاری ناگن!

''بس جوان! تھوڑا سا اتیا (انتظار) کریں ابھی آئی''۔ اس نے باہر سے آواز لگائی۔ وہ جلد ہی میرے پاس آ گئی اور پھر کہنے لگی۔ سندر جوان! کس کا دھیان مجھے بڑا رہے ہو؟

"میں تمہارا درشن کرنا چاہتا ہوں۔"

"شاکرد جوان! میں ابھی ابھی رفت یہاں سے سدھار وہی ہوں"۔ اس نے کہا۔ "دیوتا سچ مچ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے کنیا کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور دیکھو تم مجھے نرنت بھولنے کی کوشش کرنا، ناگن سے پریم نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے تم میرے من میں ہمیشہ رہو گے جوان! تم دیوتا ہو دیوتا۔ اگر تمہارا کوئی آ گیا ہو تو تمہارے چرن چھو کر من میں آنے والی آخری خواہش کو پورا کرلوں"۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا وہ جھکی اور اپنا ماتھا میرے قدموں پر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر لال گلابی رخساروں پر ایسے ڈھلک رہے تھے جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کا قطرہ۔

ناگن کی حقیقت

ہندو جوگی جلد ہی واپس آ گیا، اس نے ناشتہ کیا اور میرا کھانا میرے سرہانے رکھا اور پھر کہنے لگا۔ دیکھو دکھنے! میں اس لڑکی کو ایک آدمی کے حوالے کرنے کے لئے لے جارہا ہوں، بھگوان کی کرپا ہوئی تو شام سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔

"لیکن مہاراج! تم اس لڑکی کو کسی کے حوالے کیوں کرنا چاہتے ہو؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کی ساری کتھا واپسی پر تمہیں سنا دوں گا"۔ جوگی نے کہا۔ "اب اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مکان میرا ذاتی نہیں ہے بلکہ اس کے مکین کہیں گئے ہوئے ہیں، کچھ دنوں تک وہ آنے ہی والے ہیں"۔ پھر اس نے ناگن کو آواز لگائی۔ "راج کور جلدی سے تیار ہو جاؤ"۔

"تیار ہوں مہاراج!" اس کی سریلی آواز سنائی دی اور پھر وہ مجھے نمسکار کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ دن ڈوبنے میں ابھی تھوڑی ہی دیر باقی تھی کہ ہندو جوگی واپس آ گیا۔

"مہاراج! تم نے کل مجھ سے کہا تھا کہ بھون اس دھرتی پر سب سے سندر چیز کا نام ہے"۔ میں نے اسے کہا۔ "اور اگر اس کی سندرتا میں کسی من پسند کنیا کا پریم بھی مل جائے تو منش کے لئے یہ دھرتی سوورگ سمان بن جاتی ہے"۔

"ہاں، میں اب بھی کہتا ہوں ناری کے بغیر تو منش کچھ بھی نہیں ہے"۔ جوگی نے کہا۔

"پھر تم نے اتنی خوبصورت ناری کو کسی اور کے حوالے کیوں کر دیا؟" میں نے کہا۔ "اس کے جانے کے بعد تو یہ گھر سونا سونا سا لگنے لگا ہے"۔

"دیکھو دکھنے! میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ وہ ناری نہیں ناگن ہے۔ اگر وہ ناری ہوتی تو میں کبھی بھی اس کو اپنے سے جدا نہ کرتا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اتنی سندر کنیا کو من کی مرضی سے جدا کیا ہے؟ مجھے پتہ ہے وہ تمہارا ہردے (دل) بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ تمہیں اسے بھلانے میں کافی سمے لگ جائے گا"۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مہاراج!" میں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"یہی حال میرا بھی ہے"۔ جوگی نے کہا۔ "لیکن ہم مرد ہیں، ہم کشٹوں کو جھیل جائیں گے لیکن وہ عورت جات ان کشٹوں کو برداشت نہیں کر سکے گی، وہ تو جنم جنم کی پیاسی ہے۔ مجھے اس ظالم کے شیطانی دماغ پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جس نے ناری کو ناگن بنانے کا گر ایجاد کیا"۔

"ناری کو ناگن بنانے کا گر!" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! مجھے اس گورکھ دھندے کی بالکل بھی کچھ نہیں آ رہی۔ کبھی تو تم کہتے ہو وہ ناری نہیں ناگن تھی، اب تم کہتے ہو اسے ناری سے ناگن بنایا گیا ہے۔ ناری سے ناگن کیسے بن سکتی ہے؟ کبھی تم کہتے ہو ناگن ہو

سال کی ہو جائے تو وہ انسانی روپ دھار سکتی ہے۔ تم میرے ساتھ صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھ رکھئے! سو سال بعد ناگن کا انسانی روپ بدل لینا تو محض ڈھکوسلہ ہے"۔ جوگی نے کہا۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ناگن ناگن ہوتی ہے اور منش منش۔ البتہ ناری سے ناگن بن جانا یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ کیا کوئی ناری زہریلے ناگ کے ڈس کو برداشت کر سکتی ہے؟"

"نہیں تو"۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن تم نے دیکھا کہ ناگ کے ڈسنے کے بعد نہ صرف وہ زندہ رہی بلکہ اس کے رنگ روپ اور سندرتا میں بھی اضافہ ہو گیا تھا"۔ جوگی نے کہا۔ "اور یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ جو خوراک وہ کھاتی ہے اگر تم کھاؤ تو تمہارا جیون نشٹ ہو جائے گا..... اچھا چھوڑو تو یہ بتا تمہارے زخم کا کیا حال ہے اور درد تو نہیں ہوتا؟"

"نہیں مہاراج!"

"دیوتاؤں کی کرپا سے تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے اور بھگوان نے چاہا تو کچھ دنوں کے بعد تم صحیح طریقے سے چل پھر بھی سکو گے"۔

"مہاراج! تمہیں یہ لڑکی کہاں سے ملی اور اب تم اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"یہ لڑکی مجھے اجودھیا کے مندر میں ملی تھی، یہ ایک دیوداسی ہے"۔

"دیوداسی کیا ہوتی ہے؟"

"دیکھئے! ہمارے دھرم میں دیوتاؤں کی آشیرباد حاصل کرنے کے لئے چھوٹی عمر میں خوبصورت لڑکیوں کو مندر کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں"۔ جوگی نے بتایا۔ "پھر والدین سے ان کا کوئی ناطہ نہیں رہتا۔ وہ وہاں ہی پلتی بڑھتی ہیں اور دھرم کی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور مندر میں ناچنا گانا اور سادھوؤں، پجاریوں کا دل بہلانا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ خصوصاً پوجا کے وقت بھجن گانا لیکن حقیقت میں وہ مظلوم ہوتی ہیں۔ دھرم کے پجاری مذہب کے نام پر ان کے جوان جسم سے محظوظ ہوتے ہیں اور جب وہ بوڑھی ہو جاتی ہیں تو کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ بظاہر تو وہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایک مقدس مذہبی فریضہ انجام دیتی ہیں لیکن حقیقت میں سادھوؤں، پجاریوں، پنڈتوں کی ہوس رانی کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہیں۔ دیکھو رکھئے! یوں تو ہر دھرم میں دھرم کے مداریوں نے مختلف مقدس حیلوں بہانوں سے عورت کی نسوانیت سے حظ اٹھانے کے لئے خودساختہ قوانین وضع کر رکھے ہیں لیکن ہندو دھرم میں ناری کا کچھ زیادہ ہی عمل دخل ہے۔ میرے علم میں صرف تمہارا دھرم ہی ایک ایسا دھرم ہے جس نے ناریوں کے متعلق نہایت دانشمندانہ رویہ اختیار کیا اور جنسی تقاضے کی فطری حیثیت کو تسلیم کیا اور چار عورتوں تک جائز قرار دیں۔ لونڈیوں سے تمتع کی گنجائش پیدا کی، طلاق کو آسان کر دیا لیکن ہمارے دھرم میں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ تمہارا دھرم تو جائز ذرائع سے کسی بھی ناری کی لاج (عزت) سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن ہمارے ہاں ایک بیاہ ایسا بھی ہے کہ سوئی ہوئی یا شراب پی کر بے ہوش ہوئی یا پاگل لڑکی سے ہم بستر ہونا پیشاچ بیاہ کہلاتا ہے"۔

"جوگی مہاراج! مجھے ان باتوں کی کوئی سمجھ نہیں آئی، مجھے اپنے دھرم کے بارے میں کوئی پتہ نہیں ہے"۔ میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔

"دیکھ مورکھ! تو نے جتو اور وتو سے جو کیا ہے وہ تمہارے دھرم میں پاپ ہے"۔

"لیکن اب تو وہ ہو چکا، اس کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ہاں، مورکھ! یہ تو ٹھیک ہے۔ بس ویسے میرے ذہن میں یہ باتیں آ گئی تھیں"۔

"مہاراج! ناگن تمہیں کہاں سے ملی؟" میرا من وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"دیکھ رکھئے! ہر منش کے دل میں بھگوان نے پریم کی آشا رکھی ہوئی ہے"۔ جوگی نے بتانا شروع کیا۔ "میں اجودھیا کے مندر میں گنیش دیوتا کی مورتی کے سامنے پوجا میں مصروف تھا، جب میں پوجا سے فارغ ہوا تو ایک سندر کنیا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ جوگی مہاراج! میں دیوداسی ہوں، تمہاری سیوا کر کے میرے من میں خوشی ہو گی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اگر میں یہ کہوں کہ اپنی ساری زندگی میں میں نے اس سے زیادہ حسین لڑکی نہیں دیکھی تو غلط نہ ہوگا۔ وہ میرے قریب آ کر رکی تو میں اس کی غزالی آنکھوں کے سحر میں کھو کر رہ گیا۔ وہ مجسم قیامت بنی میرے روبرو کھڑی مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے اسے تخلیق کرتے وقت حسن اور رعنائی کے تمام خزانے اس کے جسم میں سمو دیئے ہیں۔ وہ مختصر لباس میں ملبوس تھی۔ اس کی پیشانی پر دلکش بندیا عجب بہار دکھا رہی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر دلنواز مسکراہٹ تھی۔ میں جوگیانہ لباس میں تھا، میرے جسم پر صندل ملا ہوا تھا جس کی خوشبو میرے ذہن کو فرحت بخش رہی تھی۔ اس کا ایک ایک انداز ایسا تھا کہ ہزار جان سے اس پر نثار ہونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ میں سب کچھ بھول کر اس کے سراپے میں کھو گیا۔

"کیا تم میرے ساتھ اس کٹیا میں چلنے کے لئے تیار ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں، کیوں نہیں داسی کی کیا مجال ہے کہ انکار کرے"۔ اس نے کہا۔

پوجا پاٹ کرنے والے دوسرے لوگوں کو ہم سے کوئی سروکار نہیں تھا کیونکہ پجاری کا ایک داسی سے باتیں کرنا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اچانک ایک پجاری میرے قریب آیا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا، بدن پر بھبھوت گلے میں صندل لکڑی کے موٹے موٹے دانوں والی مالا لٹک رہی تھی۔ مجھے غور سے دیکھ کر کہنے لگا۔ پرنام جوگی مہاراج! اس ناگن سے بچ کر رہنا۔ اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا اور آگے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور داسی کو لے کر ایک کٹیا میں چلا آیا۔

"دیوی! تم بہت سندر ہو"۔

"شکریہ مہاراج!"

"مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے، تم میری آتما میں رچ بس گئی ہو"۔

"پرنتو ابھی آپ نے میری اصلیت نہیں جانی"۔

"مجھے تمہاری اصلیت سے کوئی غرض نہیں، تم بتاؤ کیا تم مجھ سے پریم کرو گی؟"

"ہاں، میں تمہاری آتما سے پریم کروں گی لیکن میرے شریر پر آپ کا ادھیکار حاصل نہیں ہوگا"۔

"اس کی وجہ؟"

"اس کی وجہ گنجے پجاری نے آپ کو بتا دی ہے"۔

"لیکن مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آئی"۔

"اس نے آپ کے کان میں کہا ہے کہ اس ناگن سے بچ کر رہنا"۔

"ہاں اس نے یہی کہا ہے"۔ پھر میرے ذہن میں تیزی سے ایک خیال آیا۔ میں نے داسی سے چند باتیں پوچھیں تو اس نے ان کی تصدیق کر دی۔ مجھے ازحد افسوس ہوا داسی کے مکھ پر ایک عجیب سی چمک نظر آنے لگی اور پھر وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"مہاراج! اس لئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں تمہاری آتما سے پیار کروں گی لیکن میرا شریر تمہارے قابل نہیں"۔

میری حالت ایسی ہو گئی جس طرح کسی پیاسے کے

ر کے ساتھ پانی کا پیالہ لگا کر اس کے گھونٹ بھرنے سے پہلے ہی جدا کر لیا جائے۔

"کیوں مہاراج! اس لڑکی میں کیا بات تھی جو تمہاری یہ حالت ہو گئی؟" میں نے جوگی سے سوال کیا۔

"رکھنے! اس کے شریر میں وش بھرا ہوا تھا۔ وہ لڑکی سرتاپا زہر تھی زہر۔"

"مہاراج مجھے سمجھ نہیں آ رہی آپ کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھو رکھنے! ہر دھرم والے اپنے دھرم کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کئی قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ جب ہماری پوتر دھرتی پر تمہارے دھرم کے سورماؤں نے ادھم مچایا تو جہاں ہمارے راجاؤں نے دیوتاؤں کی سرزمین کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھیں اور ہمارے سپوتوں نے دھرتی ماتا کے لیے خون بہایا۔ اسی طرح ہماری کنیاؤں نے بھی دھرم کے لیے بہت کچھ کیا ان میں یہ دیوداسیاں بھی شامل تھیں۔ انہیں چھوٹی عمر سے خاص مقدار میں زہر کھلایا جاتا عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زہر کی مقدار بھی بڑھتی جاتی پھر یہ زہریلی ناگنیں بن جاتیں۔ تمہارے دھرما چند ایک کے علاوہ خوبصورت کنیاؤں کے دلدادہ ہوتے تھے وہ بہت جلد اس جال میں پھنس جاتے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے لیکن یہ تو بہت پچھلے زمانے کی باتیں تھیں اب جبکہ یہ خطرہ باقی نہیں میں حیران تھا کہ راج کور کے ساتھ کس نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے راج کور سے کرید کرید کر پوچھا لیکن وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ شاید کوئی عیار پجاری محض تجربے کی خاطر اس کے ساتھ ایسا کرتا رہا بس وہ اتنا ہی بتا سکی کہ ایک پنڈت نے اسے کہا تھا کہ لڑکی اب تم ناری نہیں ناگن بن چکی ہو تم اپنے کسی بھی دشمن کو جب چاہو ہلاک کر سکتی ہو۔

"مجھے میرے بارے میں اس نے اچھی طرح سمجھا دیا"۔ راج کور نے بتایا۔ "لیکن میں نے آج تک کسی کو ڈسنے کی کوشش نہیں کی لیکن میرے من میں برہم کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ زہر میرے لیے آب حیات ہے۔ ایک دن بھی ناغہ کروں تو جسم مضمحل ہو جاتا ہے اور ٹوٹنے پھوٹنے لگتا ہے"۔

میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ راجی کیا تم میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو سکتی ہو؟

"کیوں، کس لیے؟" اس نے پوچھا۔ "میں تمہارے شریر سے زہر نکال دوں گا اور تم دوبارہ ناری کے روپ میں آ جاؤ گی"۔

"ہاں مہاراج! میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے یہی ڈر ہے کہ کہیں دیوتا مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں"۔

"دیوتاؤں کی مرضی یہ نہیں ہے تمہارے ساتھ ایسا کر کے کسی نے پاپ کیا ہے۔ کیا اس مندر میں کوئی اور داسی بھی تمہاری طرح کی ہے؟"

"نہیں"۔

"ٹھیک ہے! پھر تم تیار ہو جاؤ ہم کل یہاں سے روانہ ہو جائیں گے"۔

یاد رہے کہ جوگی ہندو مذہب میں ایک گروہ سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جوگ مہاتما بدھ سے شروع ہوا تھا جس کا زمانہ تقریباً 832ھ اور 890ھ کے درمیان ہے۔ مہا دیو کا چیلا جہندر ناتھ اور جہندر ناتھ کا مچھندر ناتھ اور مچھندر ناتھ کا گورکھ ناتھ اور گورکھ ناتھ کا بالناتھ۔ بالناتھ ضلع جہلم میں رہتا اس قلعہ کے پاس ایک ٹیلے پر بیٹھ کر زہد کیا کرتا تھا۔ اسی بالناتھ کے چیلے آج کل سادھوؤں کی شکل میں پھرتے نظر آتے ہیں یہ جڑی بوٹیوں کے خواص اور سانپوں کی قسموں کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے پاس سانپ کا من (منکا) ہوتا ہے جس سے

سانپ کا زہر مارگزیدہ کے جسم سے چوس لیا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے بلکہ محض تکبر کے فقیر ہوتے ہیں لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے یہ لوگ عموماً دیہاتی علاقوں میں آتے جاتے ہیں اور ان پڑھ دیہاتی مردوں اور عورتوں کو متاثر کر کے کچھ نہ کچھ بٹور لیتے ہیں لیکن اب اکثر دیہاتی علاقوں میں تعلیم کی روشنی پہنچنے کی وجہ سے عام لوگ ان پر اعتماد نہیں کرتے اور اس میں دیہاتی علاقوں کے نوجوانوں خطباء اور علماء کرام کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہندو جوگی نے راج کور کو اسی بھروسے پر مندر سے نکالا ہوگا کہ وہ کسی رشی یا جوگی سے مشورہ کر کے اس کے جسم سے زہریلے اثرات ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ رکھشا ہندو جوگی کی باتوں کے سحر میں کھو گیا تھا اور بے تابی سے پوچھا مہاراج پھر کیا ہوا؟

''رکھشے! اگلے دن منہ اندھیرے چڑیوں چونکی (صبح کی اذان سے پہلے ایک پرندہ اپنی مخصوص آواز میں بولتا ہے) تو ہم چپکے سے مندر سے نکل آئے اور دن چڑھنے تک کافی سفر طے کر لیا۔ داسی سے پیار پریم کی باتیں اور مستقبل کے منصوبے بناتے ہوئے ہمارا سفر نہایت خوشگوار اور خوش کن خیالات میں طے ہو رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس میں میرا ایک سیوک رہتا تھا، میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میرے ساتھ ایک سندر ناری دیکھ کر چند لمحے تو بالکل مبہوت و حیران کھڑا رہا اور جب بولا تو اس کی آواز میں حیرت و استعجاب اور بے یقینی کا ملا جلا عنصر موجود تھا۔

''مہاراج! آپ اور یہ حسن کی دیوی؟ ہائے بھگوان چاند کا ٹکڑا ہے باباجی''۔

''بھئی! ہمیں اندر تو آنے دو۔ بھوجن کا انتظام کرو ہم نے صبح سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے مہاراج!'' بھوجن تیار ہو گیا تو داسی نے حسب معمول اپنے بھوجن میں زہر ملایا اور کھانے کے بعد کہنے لگی۔ اس برتن کو علیحدہ رکھنا، جانے دفعہ ہم اسے ساتھ لے جائیں گے۔ اب یہ میرا توشہ دان ہو گا...... رکھشے! بات بڑی لمبی ہے مختصر یہ کہ میں نے اسے کئی مسہل دیئے اور وقتاً فوقتاً فصد بھی کھولتا رہا لیکن اس کے شریر سے زہر کا اثر نہ نکل سکا۔ دوسرا مسئلہ یہ بنا کہ اگر اسے مقررہ خوراک زہر کی نہ ملتی تو وہ قریب المرگ ہو جاتی۔ میں نے خود بھی کوشش کی اور بڑے بڑے استاد جوگیوں سے مشورے کیے لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر ویدوں اور حکیموں کی طرف رجوع کیا اور پھر مجھے اطلاع ملی کہ حکیم فیض اللہ خدمت رطب میں ید طولیٰ رکھتا ہے لیکن آج اس نے اچھی طرح سے معائنہ کر کے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ اس لڑکی کے جسم سے زہر کا دور کرنا ناممکن ہے لہٰذا آج میں نے اپنے ایک سیوک کے ساتھ اسے واپس اجودھیا بھیج دیا ہے''۔

قارئین! اس کے بعد میری گناہ آلود زندگی کا دور شروع ہوا جو آج تک چل رہا ہے (چونکہ اگلے تمام واقعات ناقابل یقین، انتہائی غیر اخلاقی اور ناقابل اشاعت ہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔ راقم) ہندو جوگی کے ساتھ میں نے پورے ہندوستان کی سیر کی۔ اس نے مجھے ہندو مذہب کے بارے کافی معلومات پڑھائیں سکھائیں، میرے کانوں میں بالیاں پہنا دیں، ابرو اور سر مونڈھ دیا، جوگیانہ لباس اور فقیروں کی طرح صدا لگا کر مانگنے کا فن سکھایا، ارتکاز توجہ (ہپناٹزم) مختلف سوانگ رچانے کے طریقے۔ ایک دفعہ ہم ہردوار (ہندوؤں کا مقدس مقام جیسے ہمارا مکہ معظمہ ہے) گئے۔ ہم جوالاپور سے چل کر ہردوار پہنچے تھے ان کے مشہور مذہبی رہنما سردن ناتھ جی سے ملاقات کی جب کہ بھی (ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق نجات کا وقت) کا وقت آیا تو میں

نے ہندو جوگی کی تقلید کرتے ہوئے دھوتی باندھی، قشقہ لگایا اور کمنڈل ہاتھ میں لے کر ہرکی پیڑی پر جا موجود ہوا میری حرکات سے ایک ہندو کو شک پڑ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تم کون ہو؟ مجھے چونکہ جوگی نے بتایا ہوا تھا کہ اگر کسی کو تمہارے مسلمان ہونے کا شک پڑ جائے تو یوں کہنا ہے۔ میں نے کہا میں برہمن ہوں۔

''کون برہمن؟'' ہندو نے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے کہا۔ میں نے جواب دیا۔ ''فتوجیے''۔ اس نے کہا اگر فتوجیے ہو تو پھر تمہاری چوٹی کیوں نہیں؟ میں نے کہا۔ جب سے سنیاس منوائی ہے چوٹی کٹوادی ہے۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا ہندو جوگی نے اسے مجھ سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ وہ ذرا ادھر ہوا ہم وہاں سے کھسک آئے۔ اگر میں پکڑا جاتا تو مجھے کسی دیوتا کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ اس کے بعد ہم عموماً مندروں میں جانے سے کتراتے تھے اگر کبھی ہندو جوگی کسی مندر میں جاتا تو مجھے باہر چھوڑ جاتا۔ جب ہم کسی ایسے گاؤں میں آتے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہوتی تو ہم فقیرانہ لباس پہن کر مسلمانوں کی سی وضع بنا لیتے۔ جوگی جب پھیری (ایک قسم کا قمیص) لگاتا تو بڑے ناز و انداز سے الجھا کرتا۔ صدا لگاتے وقت بڑے سریلے اور بھاری انداز سے جھنڈ کی لے کے ساتھ یوں کہتا۔

باغے دے وچہ کھوہا لوا دے
وچ لوا دے ڈول
دھیے، بھیناں جے کجھ نئیں سردا
مونہوں تے مٹھڑا بول

(مجھے باغ کے اندر کنواں لگوا دو اور اس سے پانی نکالنے کے لئے ایک ڈول بھی ہو۔ بیٹیو، بہنو! اگر کچھ دینا نہیں تو کم از کم بات تو میٹھے لہجے میں کر دو۔)

عورتیں مرد جمع ہو جاتے اور پھر گندم، آٹا، گھی کافی مقدار میں جمع ہو جاتا۔ کبھی وہ وید حکیم بن جاتا اور مختلف

حکمت کی باتیں

☆..... ظلم کی بنیاد جب دنیا میں رکھی گئی تو تھوڑا سا ہی تھا پھر جو بھی آیا اس میں اضافہ کرتا گیا اور اب ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اگر بادشاہ عوام کے باغ سے ایک سیب کھائے گا تو اس کے نوکر پورے باغ کو جڑوں سمیت اکھاڑ لیں گے۔ اگر بادشاہ پانچ انڈوں کا ظلم جائز سمجھے تو اس کے سپاہی ہزاروں مرغ سیخوں پر چڑھا دیں گے۔ حکمرانوں کی ذرا سی غفلت قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ (نوشیروان)

☆..... معمولی گناہ اس لئے نہیں کرنا چاہئے کہ معمولی ہے، اس سے کیا ہو گا؟ کیونکہ کبھی معمولی آگ سے پورا گھر جل سکتا ہے اور چھوٹی سی نیکی کو اس لئے نہ چھوڑ دینا چاہئے کہ یہ تو چھوٹی سی ہے اس سے کیا ہو گا؟ کیونکہ کبھی پانی کا ایک گھونٹ پیاس سے مرنے والے کی جان بچا لیتا ہے۔

بیماریوں کی دوا کے عوض بھاری قیمت پر لوگوں کو دیتا۔ کبھی کسی گاؤں میں رات ہو جاتی تو ہم کسی زمیندار کے ڈیرے پر ٹھہر جاتے لوگ جوگیوں کی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جوگیوں کے پاس ایسے ایسے نسخے ہوتے ہیں کہ جو بوڑھے آدمی کو جوان بنا دیتے ہیں اور بھی بہت ساری بے بنیاد باتیں جوگیوں کے بارے میں مشہور تھیں۔ ہندو جوگی کو ایک طویل کہانی ''طوطا وحوش وا'' یاد تھی وہ کہانی شروع کرتا تو ساری رات بیت جاتی لیکن کہانی ختم نہ ہوتی۔ مجھے بھی وہ کہانی یاد ہے۔

''دیکھئے! میں وہ کہانی کسی دن تم سے ضرور سنوں گا''۔ نذیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے نذیر! میں وہ کہانی تمہیں ضرور سناؤں گا۔ نذیر! وہ آدمی نہیں بھینسا تھا، بے پناہ طاقت کا مالک تھا۔ وہ شیطانی کھیل کھیلتا۔ دیوداسیوں سے اس کے ناجائز

تعلقات تھے، اپنے سینکڑوں کی نوجوان لڑکیوں سے بے حیائی سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ بنارس، بھوپال، لکھنؤ، لاہور کے بازار حسن میں داد عیش دیتا اور میں ان تمام بے حیائیوں میں اس کا شریک کار تھا۔ اگر کسی ایک علاقے میں ہماری دلبائی کا بھانڈہ پھوٹتا تو ہم کسی اور جگہ چلے جاتے ہندوستان ایک وسیع ملک تھا اور ہم ہوا کی طرح پھرنے کے ماہر ہم کسی کے قابو آنے والے نہیں تھے۔ ویسے بھی اس زمانے میں بھی آتشیں اسلحہ اتنی زیادہ تعداد میں نہیں تھا۔ اپنی حفاظت کا ذریعہ اپنا زور بازو ہی ہوا کرتا تھا۔ اچھی خوراک، آزادی اور ہر روز پیدل سفر نے ہمیں طاقتور بنا دیا تھا اور میرا جسم تو پھوپھا ماجے نے کسرت کے ذریعے لوہے کا بنا دیا تھا۔ دیکھنے میں ہم شریف آدمی بلکہ ایک قسم کے مذہبی لوگ تھے لیکن شیطان بھی ہم سے پناہ مانگتا تھا۔

حرفِ چند

دل تو چاہتا تھا کہ نذیر کی داستان کا یہ حصہ بھی دل کڑا کر کے سپرد قلم کر دیتا تاکہ عام لوگوں کو ان بہروپیوں کی اصلیت کا پتہ چل جاتا لیکن "حکایت" کے مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے۔ ویسے کافی کچھ لکھا بھی جا چکا ہے، عقلمند کے لئے اشارہ بھی کافی ہوتا ہے اور اس کی ضرورت بھی اس لئے پیش آئی کہ جاہل تو رہے جاہل پڑھے لکھے لوگ بھی ان جعلی پیروں، فقیروں، عاملوں، بابوں، درویشوں کے چکر میں آ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ دین کا نام استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے جہاں عوام الناس گمراہ ہو رہے ہیں وہاں دین بھی بدنام ہو رہا ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے ہندو مسلم مخلوط معاشرہ قائم تھا جس میں ہندو آبادی اکثریت میں تھی اور زیادہ تر مالی وسائل پر بھی انہی کا کنٹرول تھا لہٰذا مسلمان ایک قسم کی غلامانہ زندگی گزار رہے تھے اور اکثر مسلمان ہندوؤں کی رسم و رواج جو ان کے دھرم کا ایک جزو تھے، اپنا چکے تھے۔ میلے، ٹھیلے، دیوالی، لوہڑی، مندروں میں پوجا پاٹ، جوگی، سادھو، پجاری وغیرہ ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی کئی غیر شرعی چیزیں بطور ایمان و عقیدہ وضع ہو گئیں جن میں سے بعض ابھی تک موجود ہے۔

ہندو تو ہندو رہے کئی مسلمان روشن خیال اب بھی ہندوانہ ثقافت ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ہمارے بعض فنکار، نام نہاد ادیب اور دانشور سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اب اکثر رائٹر حضرات کی تحریروں میں پڑھتے ہوں گے کہ "نیند کی دیوی مہربان ہو گئی" یا اس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں تمہیں ضرور پا لوں گا وغیرہ۔ حالانکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اگلا جنم تو صرف روز قیامت کو ہو گا جب تمام مخلوق کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور حساب کتاب ہو گا اور نیند تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے جو ایک قسم کی عارضی موت ہے نہ اس کی کوئی دیوی ہے نہ دیوتا۔ ہندو عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد روحیں سومنات میں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے انہیں کسی دوسرے قالب میں داخل کر دیا جاتا ہے اور ہمارے مذہب میں روح نکلنے کے بعد عالم برزخ میں ٹھہرائی جاتی ہیں۔ عقائد کے انہی اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں نے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ گائے ہندوؤں کی گاؤ ماتا ہے جبکہ ہم اس کا دودھ پیتے اور گوشت کھاتے ہیں۔ غرضیکہ مذہب اور ثقافت کے زبردست اختلاف کی وجہ ہمارے لئے ایک علیحدہ وطن کی بنیاد ٹھہری، ہندو اور مسلم کبھی بھی، کسی بھی وقت، کسی بھی مقام پر ایک دوسرے کے قریب تر نہ آ سکتے ہیں۔ ہاں، بطور ایک ہمسایہ کے ہم ان سے اچھے تعلقات کے خواہش مند ہیں۔

اب آئیں صرف چند لائنوں میں دیکھتے کہ ہندو رسم و رواج کے اثرات ہمارے دین پر کس طرح پڑے۔ ہندوؤں نے مندروں میں غیر اللہ کی پوجا پاٹ کی تو بعض

مسلمانوں نے قبروں کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ انہوں نے بھجن گائے، انہوں نے قوالی شروع کر دی۔ ان کے سادھوؤں، جوگیوں، پجاریوں کے مقابلے میں ہمارے ہاں کئی قسم کے فقیر، ملنگ، عامل وجود میں آ گئے اور قبروں کا کاروبار اتنے وسیع پیمانے پر رواج پا گیا کہ ہر علاقے بلکہ ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی قبر لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن چکی ہے جہاں ایسے ایسے غنڈے، مغرور، جاہل، شرابی، بھنگی، زانی، بہروپئے بیٹھے لوگوں کی عزتوں سے کھیلنے اور اموال پر ڈاکے ڈالتے ہیں اور نام دین کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ قبروں کے معاملے میں اتنی اندھیر نگری مچی ہوئی ہے کہ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔

محمد اکرام صاحب رود کوثر کے صفحہ 151 پر لکھتے ہیں۔ دارالملک بی بی کوئی تو جی گجرات کے کھاواڑ میں مر گیا۔ آج دکن میں ان کی کئی بیبیاں قبریں ہیں اور ہر جگہ معتقدین کا ہجوم ہوتا ہے۔ اسی فقیری کے بہانے منجھے ہوئے بدمعاش فقیری کے کپڑے یا ریشم پہنے، سونے کی انگوٹھیاں استعمال کرتے، داڑھیاں چوٹیاں رکھتے، سنکھ پھونکتے، بھنگ پیتے، چرس کے دم لگاتے گلیوں میں مست سانڈوں کی طرح دندناتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کی نام نہاد فقیری، درویشی میں ہندو دھرم اس قدر خلط ملط ہو گیا کہ پہچان کرنی مشکل ہو گئی کہ ہندو کون ہے اور مسلم کون، ضلع ایٹہ کے قصبہ مار ہرہ میں مولا نور داس مہاراج ایک بزرگ تھے۔ (نام سے اندازہ لگائیں) جو قادری کہلاتے تھے۔ ستار بجاتے تھے مثنوی مولوی رومی، دیوان حافظ، تلسی اور کبیر کے اشعار گاتے وجد میں آتے تھے انہیں ہندو اور مسلمان شیو کا اوتار مانتے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں زندہ تھے۔ انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو "قادری" کی اصطلاح میں مرید کیا۔ ایک مشہور شخصیت نے ہندوؤں کو ہمنوا بنانے کے لئے ایک نعرہ کہا تھا۔

برہما — حضرت محمدؐ ہیں

علیؓ — وشنو ہیں

مہیش — حضرت آدمؑ ہیں

شکتی — حضرت حوا ہیں

اور کلجگ کا اتھروید قرآن ہے اور جگت گرو حضرت محمدؐ ہیں۔

سورت میں سنگ خارا کا ایک مندر ہے جس کا مہنت رنگی لال ایک ہندو تھا۔ ان کے مندر میں قلزم سروپ نامی کتاب کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ لوگ پرنامی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کرشن مہاراج اور محمدؐ ایک ہی ہیں۔ پہلے کرشن کے روپ میں جلوہ گر ہوئے، اب محمدؐ کے روپ میں عرب میں نمودار ہوئے۔ اس مذہب کا ایک راجہ اورنگ زیب سے لڑا تھا۔ قلزم سروپ نامی کتاب میں 1875 شعر بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر عربی کے الفاظ ہیں جام نگر میں ہر سال ان لوگوں کا میلہ ہوتا ہے ان کے نام آج تک ہندوانہ ہیں۔ سکھ لال داس، رجنی داس وغیرہ قسم کے ناموں کے لوگوں کی نشستیں چلتی آ رہی ہیں مگر ان لوگوں کا ہندوؤں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں نہ یہ خود ہندو کہلاتے ہیں۔ پیر مشائخ 1060ھ میں بمنزال علاقہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ہندو کافی تعداد میں ان کے مرید تھے ان کی تصنیفات میں ہے، خطبہ مبارک، نور نامہ، ایمان مفصل جنگ نامہ، طرز کشی، وفات نامہ وغیرہ ہیں۔ یہ ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ پیر تھے۔

اسی طرح امام شاہی فقیروں کا ایک گروہ ہے جن کے سر پاؤں کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ نرم مسلمان فقیروں درویشوں نے بہت کچھ ہندو جوگیوں، سادھوؤں، پنڈتوں سے حاصل کر کے دین کو خلط ملط کر دیا۔ اب بھی ہمارے جاہل فقیروں میں ہندوانہ طور طریقے کثرت سے ملتے ہیں اور جاہل عوام ان سے بہت

جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ غیر یہ جعلی پیر اور عامل تو کسی کھاتے میں شمار کرنے کے قابل نہیں ہیں افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب صحیح اولیاء اللہ کے مزاروں پر اس قسم کی خرافات کی جاتی ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالک کے الفاظ میں۔ ابتدائی مذاہب سے جنس کا تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ مذہب اور جنسی جذبات ہی کی تسکین کا ذریعہ بنا۔ یونان کے اپیکورس، بھارت کے بھگت سوامی اور رام مارگی کے لوگوں نے ابتداً جنس ہی کو شکر تہذیب اور عبادت قرار دیا اور جب مذہب میں تصوف کا عنصر شامل ہوا تو اس کا تعلق "جنس" کے ساتھ اور بھی زیادہ واضح ہو گیا اور "ہمہ اوست" کے پردے میں خدا جانے جنس کی کیا کیا صورتیں جواز حاصل کر گئیں۔ اسلام نے دیوداسیوں کا ادارہ تو پیدا نہ ہونے دیا لیکن حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ، حضرت صابر کلیریؒ، شاہ بری لطیفؒ اور دوسرے صوفیاء کے مزاروں پر طوائفوں کا رقص و سرود اسلام کے اخلاق عالیہ کے باوجود اب تک جاری ہے۔

اُس بازار میں (صفحہ 18)

مولانا کا یہ کہنا کہ "اسلام نے دیوداسیوں کا ادارہ تو پیدا نہ ہونے دیا" لیکن میرے خیال میں یہ بحیثیت مجموعی ہے انفرادی طور پر "داتا کی ملنگنی" کا وجود ضرور موجود ہے گو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں لیکن ملنگنی کا وجود میں آپ کو ضرور دکھا سکتا ہوں اور کنیزوں کو مزاروں کی نذر کرنا تو ثقہ لوگوں کی کتابوں سے جس کا جی چاہے میں دکھا سکتا ہوں۔ جو قاری چاہے مجھ سے رابطہ کرے حوالہ کتاب کا نام بمعہ صفحہ حاضر خدمت کر دوں گا (راقم)۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ ایسا شاذ ہے کیونکہ اسلام کا مزاج اس بے حیائی کو پنپنے کا موقع فراہم نہیں کرتا لہٰذا کسی کو سرِ عام یہ جرأت نہ ہو سکی لیکن خفیہ طریقے پر اس کی بعض لوگوں نے کوشش ضرور کی۔ قبل از اسلام تو بابل کے لوگ اپنی عورتوں کو افرادیتہ دیوی کے مندر میں مردوں سے اختلاط کے لئے بھیج دیتے تھے۔ ان عورتوں کی چوٹی میں پھول گندھے ہوئے تھے۔ یہ غیر مردوں کی راہ تکتیں، جب کوئی عورت کسی مرد کو پسند آ جاتی تو وہ اس کی جھولی میں چاندی کا سکہ پھینک دیتا۔ وہ چارو ناچار اس سکہ کو قبول کر لیتی اور ساتھ ہو جاتی۔ گھر لوٹتی تو اس کو فخر کی چیز سمجھا جاتا لیکن اسلام نے عورت کو ایک سچے موتی کی طرح پیش کیا بعض ایسے کام جو نیکی کے کام ہیں، ان سے بھی عورتوں کو استثناء حاصل ہو گیا۔ مثلاً عورت اذان نہیں دے سکتی، امامت نہیں کر سکتی، جمعہ عورت پر واجب نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبوت کے عہدے پر بھی فائز نہیں کیا۔ حالت نماز میں امام کے بھولنے پر لقمہ نہیں دے سکتی۔ دو خاوند نہیں کر سکتی اگر خدانخواستہ عورت کو ایک سے زائد خاوند کی اجازت ہوتی تو یہ صنف نازک اور قابل رحم مخلوق گدھوں سے بھی بدتر بن جاتی۔

دیوداسی مندر میں گا سکتی ہے، ناچ سکتی ہے اور کئی مذاہب میں عورت شو پیس کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ یونان میں ملکوا بلیاریوی کا میلہ آٹھ دن کے لئے لگتا ہے اور ان آٹھ دنوں میں زائرین کے لئے روم کی لڑکیاں سامان عیش مہیا کرتی تھیں۔ یورپ میں کئی مسیحی فرمانرواؤں نے عورتوں کو کسبیہ بنایا اور ان کی آمدنی سے اپنا خزانہ بڑھاتے رہے۔ کوریال نے رینس کے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ستر ہویں صدی کے آغاز میں بیس ہزار کے قریب کسبیاں ایسی تھیں جن سے حکومت کو اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ اس سے ایک درجن جنگی جہازوں کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ غرضیکہ مذاہب عالم میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو نصف کائنات سے تعبیر کیا۔ اس کے حقوق تسلیم کئے، جنس کی مخالفت کی، گو اس کی کوئی بھی شکل ہو زنا کو حرام قرار دیا اور بازار حسن کے تصور کو ہی محو کر دیا لیکن جب مسلمانوں نے اسلام کو پس پشت ڈال

دیا اور ان کے دل و دماغ اسلامیت کے تصور سے خالی ہو گئے تو سبھی بند ٹوٹ گئے اور یہ بات میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ عورت فحش کی جس منزل سے بھی گزری ہے اس کے ذمہ دار مرد ہیں اور صرف مرد۔ مرد نے عورت کو کھلونا سمجھا، چنانچہ مرد کی نفسی خواہشوں کے غلبہ کا نام ہی فحاشی ہے۔ کوئی عورت فاحشہ ہونا پسند نہیں کرتی حتیٰ کہ ایک طوائف بھی نسوانی حیا سے تہی نہیں ہوتی ماسوا ان عورتوں کے جن کی عادت پختہ ہو کر فطرت بن جاتی ہے۔

فحش کے ذمہ دار مرد ہیں، صرف ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

(1) ایک معلمہ ناجائز بچہ جننے کے جرم میں معطل کر دی گئی۔ اس کو فرانس کی وزارت تعلیم نے اس بناء پر بحال کیا کہ نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ ہے۔

(2) فرانس ہی کے 127 ویں ڈویژن کے کمانڈر نے دوران جنگ میں ایک حکم نامہ جاری کیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں میں بند و قچیوں کے ہجوم اور اجارہ کی وجہ سے سوار اور پیادہ سپاہیوں کو شکایت ہے۔ ہائی کمانڈ عورتوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا بند و قچیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ دیر اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے عجلت سے کام لیں۔

یعنی جب تک مزید عورتوں کا انتظام نہیں ہوتا باہر کی عورتوں سے کام چلا لیں۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہی وہ تہذیب ہے جو ہمارے سروں پر تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں۔

کمہار نے ایک خوبصورت آب خورہ بنایا لوگوں نے اسے جام صہبا بنا لیا۔ کمہار نے ایک جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اس کو آب خورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا تو پھر کیا اس سے مٹی کی حقیقت بدل گئی۔ پیالہ میں چاہے شراب بھر دو چاہے زمزم۔ عورت کو بھی بنا دو یا گھر کی ملکہ، جو چاہے بنا دو لیکن ہر حال میں وہ عورت ہی ہے۔

اسلام عورت کے آب خورے میں زمزم بھرنا چاہتا ہے مغربی تہذیب شراب۔ اب یہ عورت کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ ان دونوں میں کون سی چیز پسند کرتی ہے۔

ناقابل فراموش

نذیر نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ قاری صاحب! میں نے رکھے سے پوچھا کہ کیا تمہیں کبھی اپنے کئے پر ندامت اور شرم بھی محسوس ہوئی یا کوئی ایسی بات کہ تمہارے ضمیر نے تمہیں جھنجھوڑا ہو اور کوئی بات تمہارے ذہن میں جم گئی ہو؟

''ہاں، نذیر! انسان خواہ کتنا بڑا گنہگار ہی کیوں نہ ہو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہی رہتا ہے تاوقتیکہ ضمیر بالکل ہی مردہ نہ ہو جائے۔ رکھے نے کہا۔ ''یوں تو میری زندگی میں کئی واقعات ایسے ہیں لیکن کچھ واقعات ایسے ہیں جو مجھے شاید کبھی نہ بھولیں جن میں ایک واقعہ تو ابھی حال ہی میں پیش آیا اور اس واقعے کا تمہیں بھی علم ہے۔ جب غلطی سے میں نے جنت کے ساتھ بے حیائی کی تھی۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں نے شدید غصے کے عالم میں اس دن تمہیں پہلی بار مارا تھا اور جنت کو رخصت کرنے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ ہاں رکھے مجھے اچھی طرح یاد ہے''۔ رکھے کی آواز بھرا گئی شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ذرا سنبھل کر کہنے لگا۔ ''پھوپھا ماں کی عزت میرے ہاتھوں سے لٹے گی، میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی جب کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں پھوپھا

سوائے دکھ کے اور کچھ بھی نہیں دے سکا تھا اور پھر اس کی موت کے بعد اس کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ نذیر! یاد رکھ اگر تو نے عمداً جنت کے ساتھ بے حیائی کی ہوتی تو میں تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑتا لیکن تو بھی میری طرح بے خبر تھا۔ میں نے سینے پر پتھر کی سل رکھ لی جب میں اپنے آپ کو کوئی سزا نہ دے سکا تو تمہیں کون سی سزا دیتا۔ اس واقعے کو میرا کبھی خیال میں زندگی میں بھی نہیں بھول پاؤں گا۔" رکھا چپ ہو گیا۔

قارئین صاحب! جنت کے ذکر کے ساتھ ہی میرے سینے میں ایک کسک سی اٹھی اور میری روح میرے جسم کی مقدس گہرائیوں میں کہیں سمٹ کر رہ گئی۔ رکھا میری اندرونی کیفیت سے بالکل بے خبر تھا۔

رکھے نے ایک سرد آہ کھینچی اور پھر سے درد بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

اف ربا نے ہم نے آواں جیسے سو زور لگا بنے
نماں جنھوں جو پل تکو جاوے کیوں کر چھاں والا بنے

آگے چل کر رکھے نے بتانا شروع کیا۔ ہندو جوگی کو ایک دودھ پیتے بچے کی ضرورت تھی جسے وہ اپنے کسی عمل کے لئے اپنے کسی دیوتا کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بچے اغوا کر چکا تھا اس دن میں اسی کام سے نکلا ہوا تھا کہ دوپہر کے وقت ایک نوجوان عورت مجھے نظر پڑی میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں جب اس کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک انتہائی خوبصورت ابھی بالکل جوان لڑکی تھی، میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور ایک قریبی درخت کے سائے میں لے گیا۔ میرے رعب سے وہ بہت زیادہ سہم گئی تھی۔ اس کی گود میں تین چار ماہ کا خوبصورت لڑکا تھا۔ شکار کو سامنے دیکھ کر میری شیطنت پوری طرح سے بیدار ہو گئی۔ میں نے لڑکا اس کی گود سے چھین کر دور پھینک دیا اور پھر اس سے بدفعلی کی اور پھر لڑکے کے منہ میں اپنے مخصوص انداز سے کپڑا ٹھونسا اور اسے کپڑے کے بنے ہوئے تھیلا نما کشکول میں ڈالا اور اپنے کندھے پر لٹکا لیا اور تیزی سے ایک طرف کو چلنے لگا۔

اچانک وہ لڑکی بجلی کی تیزی سے اٹھی اور شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو گئی لیکن ایک عورت ذات میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اس نے میرے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ میں سمجھا کہ یہ کمزور عورت کیا کر سکتی ہے لیکن اس کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ میں حیرانی کے ساتھ ساتھ پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ پتہ نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے کافی زور آزمائی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے اپنی طاقت پر جو گھمنڈ تھا وہ کافور ہو گیا۔ ساتھ ساتھ رو رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی میرا بچہ مجھے واپس کر دے، اس کے بغیر میں مر جاؤں گی۔ مجھے جلدی بھی تھی کہ کہیں کوئی راہگیر نہ آ جائے۔ جب میں نے دیکھا کہ عورت کے جیتے جی میں بچے کو نہیں لے جا سکوں گا تو میں نے اپنی جیب سے تیز دھار چاقو نکالا اور عورت کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس کی زبردست چیخ نکلی اور پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ میں تیزی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جوگی کے پاس پہنچ کر بچے کو تھیلے سے باہر نکالا تو یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ لڑکا مر چکا تھا۔

نذیر! جنس ہندو جوگی کی کمزوری تھی اس کا ذہن ہر وقت شیطانی منصوبے بناتا رہتا تھا اور مجھ پر تو عورت سوار ہو چکی تھی۔ میں ایک بہکا ہوا انتہائی طاقتور جوان تھا۔ ہم ہر وقت عورت کے بارے میں ہی سوچتے تھے۔ ایک دن ہندو جوگی مجھے کہنے لگا رکھے کہیں سے سات آٹھ سال کی خوبصورت لڑکی اغوا کر کے لا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ استاد اس کا کیا کرے گا؟ کہنے لگا رکھے تمہیں پتہ نہیں لڑکیاں بارہ تیرہ سال کی عمر میں جوان ہو جاتی ہیں۔

میں اسے اپنے کسی سیوک کے پاس چھوڑ دوں گا اور جب وہ جوانی کی سرحد میں پہنچے گی تو میں تمہیں عورت کے بارے میں ایک ایسا راز بتاؤں گا کہ تو اس کو پہلے نہیں جانتا ہوگا۔ میں نے جوگی سے اس راز کے متعلق پوچھا تو کچھ پس و پیش کے بعد اس نے بتا دیا (مصلحتاً میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھا رہا... راقم)

مجھے جوگی کے انکشاف کے بعد بذات خود اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ میں کوئی بھی بالغ لڑکی اغوا کر سکتا تھا لیکن وہ راز کسی نابالغ لڑکی کو اپنی نگرانی میں جوان کرنے سے ہی کھل سکتا تھا۔ لہٰذا میں گداگری کرنے کے بہانے کسی خوبصورت لڑکی کی تاک میں رہنے لگا۔ آخر ایک گاؤں میں مطلوبہ لڑکی مجھے نظر آ گئی۔ میں نے اچھی طرح سے گھر کا نقشہ ذہن نشین کر لیا اور مناسب وقت پر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سوچنے لگا۔ جب میں گاؤں سے باہر نکلا تو ایک اور فقیر میرے ساتھ مل گیا جو اسی گاؤں سے بھیک مانگ کر واپس اپنے ٹھکانے پر جا رہا تھا۔ ان جیسے فقیروں کو مقامی زبان میں تردل کہتے تھے یا شاید ان کی کوئی ذات وغیرہ ہوگی۔ یہ لوگ مقامی لوگوں کے حسب نسب اور ان کی خاندانی عادات و روایات سے واقف ہوتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں میراثی لوگ ہوتے ہیں۔

میں نے اس سے باتوں باتوں میں اس گھر کے متعلق پوچھا جس میں میں نے اپنی مطلوبہ لڑکی دیکھی تھی۔ تو اس نے جو انکشاف کیا وہ چونکا دینے والا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم نے اس گھر میں ایک سات آٹھ سال کی بچی دیکھی ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں نے کہا ہاں، میں نے دیکھی ہے اسی لڑکی نے مجھے ایک بڑی تھالی میں گندم خیرات میں دی تھی۔ کہنے لگا اس لڑکی کی والدہ کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور وہ لڑکی مقتولہ کے پیٹ میں تھی بعد میں حکیم کے مشورے سے جراح نے مقتولہ عورت کا پیٹ چاک کر کے بچی کو نکال لیا تھا۔

"اچھا لیکن پولیس نے کوئی اعتراض نہ کیا؟"

"پولیس نے اعتراض کیا کرنا تھا بھلا ایک مردہ عورت کا پیٹ چاک کر کے ایک جان کو بچا لینے میں پولیس کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ گاؤں کے مولوی صاحب نے بھی اجازت دے دی تھی پھر گاؤں کے بااثر لوگوں نے سمجھانے سے معاملہ رفع دفع ہو گیا"۔

"اس عورت کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟"

"اللہ لوکو! وہ عورت اس لڑکی کے باپ کے ساتھ بھاگ آئی تھی اور پھر کسی طرح اس کے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ وہ فلاں گاؤں میں ہے۔ اس عورت کا گاؤں یہاں سے تھوڑا بھی ہوا تو سو کوس سے کسی طرح کم نہیں ہوگا۔ انہیں کسی طرح اطلاع مل گئی وہ آئے اور رات و رات عورت کو قتل کر کے فرار ہو گئے اور خود مدعی بن گئے کہ ہماری لڑکی کو اغوا کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔ پولیس نے دس آدمی کو پکڑ لیا۔ اس نے اغوا کا اقرار کر لیا لیکن قتل سے انکار کرتا رہا۔ آخر پولیس تشدد سے تنگ آ کر اس نے قتل کا اقرار کر لیا لیکن عدالت نے ناکافی ثبوت ہونے کی وجہ سے اسے بری کر دیا بعد میں وہ بھی نامعلوم افراد نے قتل کر دیا"۔

"وہ آدمی کون تھے جنہوں نے لڑکی کو قتل کیا؟"

"اللہ لوکو! تم جان کر کیا کرو گے؟"

"بس میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"۔

"وہ اپنے علاقے کے بہت بڑے چوہدری تھے اور ان کا خاندان پہلوانی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ آج کل بھا پہلوان بہت مشہور ہے۔ وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے"۔

اور جب میرے پوچھنے پر اس نے گاؤں کا نام بتایا تو حیرت سے میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

(یہ پُراسرار اور سنسنی خیز داستان جاری ہے)

غزل

نازیہ لیاقت

اگر میں غیر کے عیب و ہنر کو دیکھتی ہوں
تو اس سے پہلے میں اپنی نظر کو دیکھتی ہوں

قیاس کے لئے اب کیا رہی ہے گنجائش
خبر کو سنتی ہوں خبر کو دیکھتی ہوں

بنائے جاتے ہیں کس طرح خواب مٹی سے
دیکھنے کو میں اس کوزہ گر کو دیکھتی ہوں

کوئی اثر نہیں آتا نظر دعاؤں میں
تو پھر دعاؤں سے خالی اثر کو دیکھتی ہوں

یہ سربلندی ترے عاشقوں کی یونہی نہیں
جبیں پہ آج بھی میں خاک در کو دیکھتی ہوں

بہت غرور تھا اس کو وطن پرستی پر
کہیں پڑا ہوا اب اپنے سر کو دیکھتی ہوں

نازیہ دشت میں دیوار و در نہیں ہیں تو کیا
یہاں بھی سبزۂ دیوار و در کو دیکھتی ہوں

میں نے تو تمہیں شروع میں ہی معاف کر دیا اور وعدہ معاف بنایا تھا۔ تم نے
اللہ کی مقدس کتاب پر حلف لے کر جھوٹ بولا۔ خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔

سلطانی گواہ

چوہدری ظہور الحق (ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر)

جوانی کے ابتدائی دور میں ہر شخص کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان موجزن ہوتا ہے۔ اس دور میں آدمی بہت حساس ہوتا ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جذبات سے لبریز خیالات کو رات سونے سے پہلے ایک ڈائری کے صفحات پر منتقل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دن میں پیش آنے والے اہم واقعات اور اپنے مشاہدات ڈائری میں درج کرتے ہیں۔ ڈائری لکھنا بڑے بڑے بادشاہوں کا بھی معمول رہا ہے۔ تزک بابری اور تزک جہانگیری میں ان بادشاہوں نے جو واقعات قلمبند کئے وہ آج تاریخ کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔

میری جوانی تحریک پاکستان میں حصہ لیتے، قائداعظم اور پاکستان کے نعرے لگاتے گزری۔ اس دور کے نوجوان جذباتی کم اور سیاسی شعور زیادہ رکھتے تھے۔ یہ ہنگامہ خیز دور تھا۔ میں نے جوانی کے اس دور میں کبھی ڈائری نہ لکھی تھی لیکن اب روزانہ پیش آنے والے واقعات اور اپنی مصروفیت کو ڈائری میں لکھنا میرا فرض منصبی تھا جو سرکار کی جانب سے ایک پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے مجھ پر عائد تھا۔ میری مراد پولیس افسر کی ''ڈائری'' سے ہے۔ اسے عرف عام میں ''ضمنی'' بھی کہتے ہیں۔ کسی مقدمہ کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر پر لازم ہے کہ سارے دن کی روئداد اور تفتیش کی تفصیلات روزانہ ضمنی میں لکھے۔

غالباً یہ سال 1962ء کی بات ہے۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ دن کو آفتاب خوب چمکتا اور رات ہوتے ہی موسم خوشگوار ہو جاتا۔ میں اغوا کے ایک کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ اس رات اپنے کمرے میں بیٹھا میں دیر تک اس کیس کی ضمنیاں مکمل کرتا رہا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں کام مکمل کر کے کمرے سے نکلا اور تھانے کے وسیع و عریض صحن میں سے گزرتا ہوا مین گیٹ کی جانب محرر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ سیاہ کالی رات تاریک آسمان، پورے تھانے پر سکوت طاری تھا۔ یہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ میں نے محرر کو بتایا کہ میں گھر سونے جا رہا ہوں۔ سارے دن کا تھکا ہوا ہوں، بلاضرورت مجھے مت بلانا...... پھر اُس کو چند ضروری ہدایات دیں اور گھر جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ سارے دن کی تھکاوٹ، تھوڑی ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔

میری رہائش ایک سرکاری کوارٹر میں تھی جو تھانے کے ساتھ ہی تھا۔ تھانے کے اندر سے بھی میرے گھر کی جانب ایک راستہ تھا۔ قریب چار بجے رات میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے نیند کے عالم میں ہی پوچھا۔ ''کون ہے اس وقت؟'' میری آواز میں غصہ اور ناراضی تھی۔ باہر کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں ایک بار پھر غصے سے دھاڑا۔

''جناب قتل کی واردات ہو گئی ہے''۔ یہ تھانہ محرر کی آواز آئی۔

عام حالات میں محرر میرے اردلی کو رپورٹ دیا کرتا تھا اور اردلی فیصلہ کرتا کہ مجھے اطلاع دینی ہے یا نہیں۔ مگر یہ قتل کی واردات تھی اس لئے وہ خود اطلاع دینے آیا تھا۔ میں تہبند اور بنیان پہن کر سویا تھا۔ فوراً اسی حالت میں تھانے آ گیا۔ دو آدمی محرر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ایک کو میں جانتا تھا۔ اس کا نام شرف الدین خان تھا۔ تھانے کے سامنے سڑک کے پار والی بستی کا رہنے والا تھا۔ دوسرا آدمی کوٹ شاہسوار خان کا چوکیدار تھا۔

''میری چچی اور بھاوج کوٹ شاہسوار خان میں قتل ہو گئی ہیں''۔ شرف الدین خان نے گھبراہٹ اور خوف سے بھرپور لہجے میں بتایا۔

''کیسے ہوا ان کا قتل؟'' میں نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر پوچھا۔

"چوکیدار سے پوچھ لیں، میں اپنے گھر سو رہا تھا کہ اس نے آ کر یہ منحوس خبر سنا دی"۔

چوکیدار نے بتایا کہ وہ کوٹ شاہسوار خان میں معمول کے پہرے پر تھا کہ پٹھانوں کے گھر کی طرف سے ان کی تیرہ چودہ سالہ نوکرانی کی چیخ و پکار سن کر وہ چند دوسرے لوگوں کے ہمراہ جو شور سن کر جاگ اٹھے تھے، ان کے گھر کی جانب دوڑا۔ دو آدمیوں کو پٹھانوں کے گھر سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اندھیرا تھا اس لئے وہ انہیں پہچان نہ سکا۔

میں نے شرف الدین خان اور چوکیدار سے کہا کہ کوئی دشمن یا کسی پر شک ہو تو بتاؤ مگر دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ واقعہ کی تفصیل جاننے کے سلسلے میں نے چوکیدار کو مزید کریدا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ شور سن کر جب وہ دوسرے افراد کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوا تو وہاں دو لاشیں پڑی تھیں۔ گھر میں کوئی مرد نہیں رہتا۔ صرف دو عورتیں جو ماں بیٹی ہیں اور ایک تیرہ چودہ سالہ نوکرانی رہتی ہے۔ قتل کی تفصیل وہ لڑکی بتا سکتی ہے۔

نہ کسی سے دشمنی نہ قاتلوں کا حلیہ نہ ہی واقعہ کی تفصیل، میرے لئے ایف آئی آر ایک مشکل مرحلہ بن گیا۔ عام طور پر تھانیدار جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے اور گواہوں سے تفصیل جاننے کے بعد پرچہ درج کیا کرتے ہیں تاکہ مقدمے کا چالان مکمل کرنے میں آسانی رہے۔ ادھوری اور کمزور ایف آئی آر پر بننے والے کیس سے ملزم کا وکیل فائدہ اٹھا کر اپنے مؤکل کو بری کروا لیتا ہے۔ کوٹ شاہسوار خان تھانہ سے آٹھ میل دور شمال کی جانب واقع تھا اور سارا راستہ کچا پکا تھا۔ موقع ملاحظہ کرنے کے بعد ایف آئی آر تحریر کرنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ آنے جانے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔

پاکستان کو معرض وجود میں آئے تیرہ چودہ سال ہوئے تھے۔ اس وقت وہ سارے ہی افسر زندہ تھے جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ سروس کی تھی۔ ان میں فرض کی وہ لگن موجود تھی جو انگریزوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انگریز کے دور میں قتل اور ڈاکہ زنی بڑے سنگین جرائم تھے۔ قتل یا ڈکیتی کی اطلاع فوراً درج کرنی پڑتی تھی۔ تھانہ انچارج کے لئے لازمی تھا کہ ایسی واردات کی تفتیش فوراً شروع کرے اور پرچے کی نقل ڈی ایس پی اور ایس پی کو جلد از جلد ارسال کرے۔ ایسی وارداتوں کو ہم سپیشل رپورٹ کیس کہتے ہیں۔ فوراً پوری مشینری حرکت میں آ جاتی۔ انگریز ڈی ایس پی اور ایس پی خود موقع واردات پر پہنچ جاتے تھے۔

میں نے چوکیدار کی فراہم کردہ معلومات پر اکتفا کرتے ہوئے پرچہ درج کر لیا اور آخر میں لکھا کہ مزید تفصیل نوکرانی بتا سکتی ہے۔ میں نے محرر کو واردات کی اطلاع اعلیٰ افسران کو بھجوانے کا حکم دیا اور خود ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کا ہمراہ بار دوسری موقعہ واردات پر روانہ ہوا۔

کوٹ شاہسوار خان پہنچنے تک سورج کی سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ میں چوکیدار اور شرف الدین خان کے ہمراہ محل گاہ میں داخل ہوا۔ یہ پختہ اینٹوں سے تعمیر شدہ ایک وسیع مکان تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی تھی جس پر چھت تھی۔ کچے صحن میں گوبر کی لپائی بڑی نفاست سے کی گئی تھی۔ بائیں جانب سیڑھیاں تھیں جو ڈیوڑھی کی چھت تک جاتی تھیں۔ صحن کے آگے دالان تھا اور پھر ایک بڑا کمرہ تھا۔ صحن میں دو چارپائیاں بستر سمیت پڑی تھیں۔ ایک پر ایک عورت کی خون آلود لاش پڑی تھی جس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ ڈیوڑھی کی چھت پر جانے والی سیڑھیوں کے شروع میں ایک چالیس بیالیس سالہ عورت کی لاش پڑی تھی جس کے آس پاس وافر مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔ عورت نظر کی عینک لگاتی تھی۔ اس کے جسم پر تقریباً تیس کے قریب چاقو کے

ضربات تھیں۔ بوڑھی عورت کو صرف چار وار چاقو کے لگے تھے جن میں تین وار سینے میں تھے، دوسری عورت پر زیادہ وار پیٹ اور پشت پر کئے گئے تھے۔

میں نے صحن کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں ایک گٹھری نما گٹھری گن کا کارتوس پڑا ملا۔ یہ شاید فائر نہ ہوسکا اور مس ہو گیا تھا۔ صحن کی لپائی کی جاتی تھی اس لئے وہاں کوئی قابل ذکر کھرا نہ ملا۔ صحن کے بائیں جانب پچھلے کمرے کے ساتھ سات فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس دیوار کے پاس گوبر کے جلے ہوئے اپلوں کی راکھ پڑی تھی جس پر واضح پاؤں کا ایک کھرا بڑا صاف تھا۔ میرے خیال میں ملزم تعداد میں تین تھے۔ دو دروازے کے راستے بھاگے اور تیسرا دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا۔ دیوار پر چڑھنے کے نشانات واضح تھے۔ پاؤں کا یہ نشان جسے ہم کھرا کہتے ہیں فلیٹ شوز کا تھا اور تازہ تھا۔

میں نے کھوجی کو بلا کر کھرا دکھایا اور دو کانسٹیبلوں کے ہمراہ اسے کھرے کے پیچھے روانہ کر دیا۔ محترم احمد یار خان صاحب کی کہانیوں میں آپ کھرے اور کھوجی کے بارے میں کافی تفصیلات پڑھ چکے ہیں۔ میں نے اس کھرے کا مولڈ بھی تیار کر لیا۔ پاؤں کے نشانات جو ذرا گہرے ہوں ان میں پلاسٹر آف پیرس کا محلول ڈال کر تھوڑی دیر بعد دیکھیں تو محلول جم کر سخت ہو جاتا اور کھرے کے سانچے میں پورا ڈھل چکا ہوتا ہے۔ ملزم کی شناخت کرنے میں یہ مولڈ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ میں نے ابھی تک قتل کے محرکات کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ کی تھی۔ میں سب سے پہلے موقعۂ واردات پر ملزموں کے چھوڑے ہوئے سراغ باریک بینی سے جمع کر لینا ضروری سمجھتا تھا۔

ڈیوڑھی، صحن اور دالان کا جائزہ لیتا ہوا میں سامنے کے بڑے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کے ایک چارپائی تھی جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسری طرف چند چھوٹے بڑے صندوق لوہے کی بڑی پیٹی پر رکھے تھے۔ میں نے صندوقوں کا باری باری معائنہ کیا۔ یہ تعداد میں پانچ تھے۔ در پر قفل پڑے تھے۔ ہر چیز ٹھیک حالت میں تھی۔ قاتلوں نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ چوری یا ڈاکے کی واردات نہیں بلکہ ملزموں کا مقصد صرف ان عورتوں کو قتل کرنا تھا۔

کمرے کے معائنے کے بعد میں صحن میں لاشوں کی "مرگ رپورٹ" (Inquest Report) تیار کر رہا تھا کہ کھوجی اور ان کے ہمراہ جانے والے کانسٹیبل واپس آ گئے انہوں نے بتایا کہ گاؤں کے بالکل ساتھ راجباہ (چھوٹی نہر) ہے۔ یہاں سے راجباہ تک کھرا ملا ہے۔ راجباہ کے دوسرے کنارے پر اونچی گھاس ہے جس میں کھرا ملنا مشکل ہے۔ جہاں گھاس ختم ہوتی ہے وہاں سے زرعی والی زمین شروع ہوتی ہے۔ کھوجی کھرا تلاش کرتا راجباہ کے دوسرے کنارے پر پہنچا لیکن زرم مٹی پر بے شمار ڈھور ڈنگر چرتے رہے تھے۔ کھوجی نے بھی کہا کہ ملزم تعداد میں تین تھے۔ کھوجی نے اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق یہ بھی بتایا کہ تیسرا ملزم جس کا کھرا اپلوں کی راکھ پر ملا تھا وہ دیوار پھلانگ کر پہلے کھیتوں میں بھاگتا رہا پھر راجباہ میں اترا اور دوسری طرف اس کا کھرا بالکل غائب تھا۔ باقی دو کھرے بھی فلیٹ شوز کے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ ملزموں نے راجباہ سے نکلتے وقت دھوکہ دینے کے لئے فلیٹ شوز اتار کر دوسرے جوتے پہن لئے ہوں گے۔

میں نے گاؤں کے نمبردار سے کہا کہ اس گھر کی نوکرانی کو لے آئے۔ واردات سے اب تک نوکرانی نمبردار کے گھر میں تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا بلکہ دہشت کی وجہ سے تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ تیرہ سال کی تو وہ لڑکی تھی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں نوکرانی کے

نارمل حالت میں آنے کا انتظار کرتا۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا اور اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کی محنت کے بعد وہ پوری طرح نارمل تو نہ ہوئی لیکن میں نے اُسے اس قابل کر لیا تھا کہ واردات کے بارے میں بیان دے سکے۔

اس نوکرانی نے بتایا کہ صحن میں دو اور بوڑھی عورت (رحمت بی بی) ساتھ ساتھ چارپائی بچھائے سو رہی تھیں۔ ڈیوڑھی کی چھت پر رحمت بی بی کی بیٹی شمیم سو رہی تھی۔ برآمدے میں لالٹین جل رہی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ تین آدمی دیوار پھاند کر اندر آئے۔ انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ نوکرانی نے بتایا کہ دو آدمی جن کے ہاتھوں میں چاقو تھے، رحمت بی بی کی چارپائی کی طرف بڑھے۔ ایک آدمی سرہانے اور دوسرا پائینتی کی طرف کھڑا ہو گیا۔ تیسرا آدمی جس کے ہاتھ میں سونٹا تھا تھوڑی دور ایک سائیڈ پر کھڑا رہا۔ آہٹ سن کر رحمت بی بی جاگ اٹھی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر ان سے منت سماجت کی کہ جو کچھ لے جانا چاہتے ہو اندر کمرے میں صندوق پڑے ہیں لے جاؤ۔ سرہانے والی سائیڈ پر کھڑے آدمی نے چاقو کے دو تین وار رحمت بی بی پر کئے۔ رحمت بی بی کی چیخ نکلی۔ ماں کی آواز سن کر چھت پر سوئی ہوئی شمیم نے آواز دے کر پوچھا، ماں کیا بات ہے؟ سرہانے والے آدمی نے اس دوران ایک اور چاقو رحمت بی بی کو مارا۔

دوسری چیخ سن کر شمیم ماں کو آوازیں دیتی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ دونوں آدمی لپک کر سیڑھیوں کی دونوں سائیڈوں پر ہو گئے۔ جونہی شمیم نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا دونوں نے اُس پر حملہ کر دیا اور چاقوؤں کے کئی وار کئے۔ شمیم کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چاقو لگنے کے باوجود وہ ایک آدمی سے گتھم گتھا ہو گئی۔ دونوں نے شمیم کو زمین پر گرا لیا اور مسلسل چاقو مارتے رہے۔ لڑکی نے بتایا کہ جب وہ رحمت بی بی کو مار رہے تھے تو وہ دم سادھے بے حس و حرکت پڑی رہی لیکن انہوں نے شمیم پر حملہ کیا تو وہ ہمت کر کے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ ان میں سے ایک آدمی نے دوڑ کر لڑکی کو پکڑ لیا اور گردن سے اٹھا کر زمین پر دے پٹخا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی۔ قاتل سامنے والے کمرے میں چلے گئے۔ لڑکی کو ذرا سا ہوش آیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر کو بھاگی اور زور زور سے چیخنے چلانے لگی۔ شور سن کر وہ قاتل گھبرا کر کھلے دروازے سے باہر کو بھاگے۔ اتنی دیر میں چوکیدار اور دوسرے لوگ لڑکی کا شور سن کر اِدھر آ گئے۔ ایک مجرم ابھی اندر تھا۔ اُس کے پاس بندوق تھی۔ لوگوں کو دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر اُس نے اس سمت فائر کیا جو مس ہو گیا۔ اس دوران وہ دیوار پھلانگ کر بھاگ گیا۔

میں نے لڑکی کے بیان میں یہ بات دانستہ چھوڑ دی کہ قاتلوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ مجھے چوکیدار نے تھانے میں یہ بات بتائی تھی لیکن میں نے جان بوجھ کر ایف آئی آر میں یہ بات نہیں لکھی تھی۔

یہ ایک اندھا قتل تھا جسے آپ Blind Murder بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کے کیس پولیس کے لئے نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں جہاں قاتلوں کو نہ تو کسی نے پہچانا ہو، نہ حلیہ بتایا ہو اور نہ ہی کوئی دوسرا ثبوت میسر ہو۔

مجھے یقین تھا کہ میں قاتلوں تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ میرا تجربہ ہے کہ مجرم کتنا ہی ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو موقعۂ واردات پر کوئی نہ کوئی سراغ یا نشانی ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ آج کل کے تھانیدار جو سفارش کے بل بوتے پر محکمہ پولیس میں بھرتی ہو رہے ہیں اور اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کی بجائے ان کی تمام تر توجہ رشوت اور حرام خوری پر ہوتی ہے۔ پولیس اکیڈمی میں ان کی تربیت کا معیار ناقص ہوتا ہے۔ انہیں آسان ترین کیس تفتیش کے لئے دیا جائے تو یہ مجرموں کا سراغ لگانے کی

بجائے ساری توجہ ایسے شواہد اکٹھے کرنے پر رکھتے ہیں جس سے یہ ثابت کر سکیں کہ وقوعہ ہوا ہی نہیں اور مدعی کا جھوٹا پرچہ خارج کیا جاتا ہے۔ یا پھر مدعی کو کہا جاتا ہے کہ اپنے ملزموں کی نشاندہی خود ہی کرے۔

قارئین کو کچھ عرصہ قبل لاہور کے گنجان آباد علاقے اسلام پورہ میں ہونے والے قتل کا واقعہ یاد ہوگا جس میں دن دیہاڑے ایک ہی گھر کے نو افراد کو بے دردی سے ذبح کر دیا گیا تھا۔ ایسی ہی واردات شیخوپورہ میں بھی ہوئی تھی۔ ہماری پولیس جدید ترین سہولتوں کے باوجود آج تک اس واقعہ کے مجرموں کا سراغ نہیں لگا سکی۔ میرا یقین ہے کہ ایمانداری سے تفتیش کی جائے تو مجرم کسی صورت میں قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔

میں نے نوکرانی کے بیان میں لکھا کہ میں قاتلوں کو شناخت کر سکتی ہوں۔ میں نے قاتلوں کا حلیہ بھی عام سے لکھا۔ یہ بھی لکھا کہ انہوں نے کندھوں سے بیگ لٹکائے ہوئے تھے۔ ملزموں کے چہرے کے خدوخال اور رنگ میں نہ لکھ سکا۔ بیانات سے فارغ ہو کر میں نے لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیں۔ میرے ڈی ایس پی صاحب بھی وہاں آ چکے تھے۔ انہوں نے ساری کارروائی مجھ سے سنی، موقع ملاحظہ کیا۔

"چوہدری ظہور!" انہوں نے کہا۔ "یہ کیس تمہارے لئے ایک چیلنج ہے۔ دیکھتے ہیں تم اس میں کیا کرتے ہو"۔

میں نے قاتلوں کا سراغ لگانے تک وہیں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ نمبردار نے میرے لئے عارضی رہائش کا انتظام کر دیا۔ میں ساری رات کا جاگا ہوا تھا، میں نے غسل کیا پھر ناشتہ کیا۔ اسی دوران تھانے سے میرا اے ایس آئی آ گیا۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ میں سونے لگا ہوں۔ دو گھنٹے بعد مجھے جگا دے اور اس دوران جو کام میں نے اس کے ذمے لگایا ہے وہ کر دے۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ جب میں سو کر اٹھوں تو مقتولوں کے قریبی عزیز یہاں موجود ہوں۔

میں سو کر اٹھا تو اے ایس آئی نے رپورٹ دی کہ تیسرا قاتل جو دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا اسے دیوار کی دوسری جانب سوئے ہوئے مردوں اور عورتوں نے دیکھا تھا مگر وہ بھی اس کا حلیہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں۔ میں نے مقتولوں کے قریبی رشتہ داروں سے تفتیش کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے شرف الدین خان کو بلایا۔ یہ شخص میرے پاس ایک بار اپنے ٹرک کے چوری ہونے کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔ یہ کمزور اور بزدل شخص تھا۔

"رحمت بی بی میری چچی تھی"۔ شرف الدین خان نے بتایا۔ "اور بیوہ تھی۔ شبنم اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ شبنم کی شادی میرے بھائی قطب الدین خان سے ہوئی جو وہ ترادھا گن میں رہتا ہے۔ شادی کے کئی سال تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو پتہ چلا کہ شبنم میں قدرتی نقص ہے اور وہ کبھی اولاد پیدا نہ کر سکے گی۔ شبنم کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ اس کے پیٹ میں کئی رسولیاں تھیں۔ ڈاکٹروں نے اس کی جان کو خطرے کے پیش نظر اس کے پیٹ سے نسوانی اعضاء ہی نکال دیئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد قطب الدین خان نے دوسری شادی کر لی اس لئے شبنم شوہر سے علیحدہ ہو کر اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی"۔

قتل کی خبر سن کر ان کے دوسرے رشتہ دار بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ میں وہ مختصراً آپ کو سنا دیتا ہوں۔ انگریزوں کی افغانستان کے حکمرانوں سے جنگ کے دوران چند ٹھیکیداروں نے انگریزی فوج کو اسلحہ اور راشن سپلائی کیا تھا۔ اس جنگ کے خاتمہ کے بعد ان ٹھیکیداروں کو نوازنے کے لئے انگریز سرکار نے ان کو

پیشکش کی کہ وہ معمولی عوضانے پر زمین الاٹ کروا لیں۔ ان ٹھیکیداروں میں ایک ماجھی خان بھی تھا۔ ماجھی خان نے اس موقع پر اپنے ایک پرانے دوست شاہسوار خان کو جو پولیس سب انسپکٹر تھا، ترغیب دی کہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ شاہسوار خان سب انسپکٹر نے ماجھی خان کی سفارش سے چند مربع زمین الاٹ کروا لی اور اس طرح یہ جگہ کوٹ شاہسوار خان کہلانے لگی۔

بعد میں شاہسوار خان کے دوسرے رشتے دار میانی افغاناں ضلع ہوشیارپور سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ رحمت بی بی اور شمیم شاہسوار خان کی وراثت میں حصہ دار تھیں۔ رحمت بی بی کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی۔ ماں بیٹی کی موت کی صورت میں ان کے حصے کی جائیداد نور الدین خان اور اس کے بھائی قطب الدین خان کو مل جانی تھی۔ یہ قتل کا ایک قوی محرک تھا۔ میں نے دونوں بھائیوں کو مشتبہ ٹھہرا لیا اور ان کی خفیہ نگرانی شروع کروا دی۔ اگلے روز مقتولوں کے قل تھے۔ ان کے رشتہ دار دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ لوگ تاسف کا اظہار کر رہے، جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی عقل کے مطابق قتل کا شبہ کسی نہ کسی پر کر رہا تھا۔ میں نے قرآن خوانی کے دوران اپنے مخبر ادھر ادھر پھیلا دیے تھے۔ ایس پی صاحب بھی قل خوانی کے موقع پر آئے۔ انہوں نے بذات خود واردات میں دلچسپی لی اور مختلف سوالات مجھ سے کیے۔ میں نے ایس پی صاحب کو یقین دہانی کرائی کہ میں یہاں سے کچھ حاصل کر کے ہی اٹھوں گا۔ انگریز کے دور میں جہاں قتل کی واردات ہو جاتی علاقہ تھانیدار موقع پر ہی ڈیرہ جما لیتا اور جب تک مجرموں کا سراغ نہ ملتا وہاں موجود رہتا تھا۔

رسم قل ختم ہو گئی۔ مہمان واپس جانا شروع ہو گئے۔ مقتولین کا ایک رشتہ دار جس کا نام معراج دین تھا، مجھ سے ملا اور قاتلوں کی گرفتاری کے لئے مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس شخص نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ وہ گوجرانوالہ میں آڑھتی ہے اور بڑے بڑے افسران سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے رحمت بی بی کے داماد قطب الدین خان کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ اس شخص سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ مہمانوں کی رخصتی کے بعد میں نے اپنے مخبروں اور کانسٹیبلوں کو اکٹھا کیا اور سرزنش کے انداز میں کہا کہ اب تک بہت خاطر تواضع کروا چکے ہو، اب کچھ کر کے بھی دکھاؤ اور گرد و نواح کے علاقے میں پھیل جاؤ اور اپنا کام کرو۔

دوسرے دن شام کو میرا ایک کانسٹیبل بڑی اہم خبر لایا۔ اس سپاہی کا نام برخوردار تھا اور میرے پاس بطور ڈی ٹیکو کانسٹیبل کے کام کرتا تھا۔ ایسے سپاہی ہر تھانے میں ہوتے ہیں۔ یہ وردی نہیں پہنتے سارا دن علاقے میں گھومتے ہیں اور جرائم کی خبریں تھانے میں رپورٹ کرتے ہیں۔ عام لوگ انہیں ڈائری والا سپاہی کہتے ہیں۔ (برخوردار چند سال پیشتر ایف آئی اے میں سب انسپکٹر تھا) اس نے بتایا کہ مقتولوں کے رشتے دار دو نوجوان قل کے روز قریبی گاؤں میں طفیل عرف طیفا نامی لڑکے کے گھر آئے تھے۔ قتل سے آٹھ دس دن قبل بھی ان کو طفیل عرف طیفا کے گھر دیکھا گیا تھا۔ برخوردار نے مزید بتایا کہ یہ لڑکے طفیل کے پرائمری سکول کے ساتھی ہیں اور بچپن میں اس گاؤں میں رہتے تھے۔

میں نے دو کانسٹیبلوں کو بھیج کر طیفے کو تھانے بلوا لیا۔ کانسٹیبلوں نے طیفے کو بتا دیا تھا کہ اسے قتل کے سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ طیفے کے باپ کو پتہ چلا تو وہ بھی بیٹے کے ہمراہ آ گیا۔ شور و غوغا کرنے لگا۔ میں نے نرمی طرح ڈانٹ کر اسے تھانے سے نکال دیا اور طفیل کو تھانے کے عقب میں اس خاص کمرے میں لے گیا جسے ہم نے تفتیشی سیل کا نام دے رکھا تھا۔ اس کمرے میں آنے والے ملزم اور مشتبہ کو نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کا سارا

سامان موجود تھا۔ میں نے طیفے سے وقوعہ کی رات اس کے پاس ان لڑکوں کی آمد کا پوچھا۔

"جناب مجھے تو کچھ معلوم نہیں نہ میں ان لڑکوں کو جانتا ہوں"۔ اُس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "میرے پاس تو کوئی نہیں آیا"۔

اس کمرے میں میرے اور طیفے کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا جو طیفے کے پیچھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ طیفے کا منہ میری طرف تھا۔ میں طیفے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہا تھا اور وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"دیکھو طیفے!" میں نے اسے کہا۔ "سب کچھ اگل دو تمہاری بہتری اسی میں ہے"۔

"جناب آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم......" پیچھے سے ایک زناٹے دار تھپڑ طیفے کے کان اور رخسار پر اس قوت سے پڑا کہ بات اُس کے ہونٹوں پر ہی رہ گئی اور وہ کرسی سمیت فرش پر جا پڑا۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔ کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس کو کان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

"طیفے! میں تمہارے ساتھ رعایت کرنا چاہتا تھا"۔ میں نے کہا۔ "لیکن تم نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی...... میری بات توجہ سے سنو۔ قتل کی رات دو پٹھان لڑکے تمہارے گھر آئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے تمہیں بھی ساتھ لیا۔ تم نے ان کے ساتھ مل کر دونوں کو قتل کیا ہے اور میں تم کو دوہرے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں"۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ "اسے ہتھکڑی لگا کر حوالات میں بند کر دو اور کسی سے اس کی ملاقات نہ کروانا۔ میں دوسرے ملزموں کو گرفتار کرنے ریڈ پر جا رہا ہوں۔ اعظم اے ایس آئی سے کہنا کہ صبح عدالت سے اس کا بارہ روز کا جسمانی ریمانڈ لے آئے۔ واپسی پر میں خود اس سے انٹیروگیشن کروں گا"۔

ہیڈ کانسٹیبل میرا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ کوئی دو گھنٹے بعد طیفے کے باپ کو ہیڈ کانسٹیبل نے بتا دیا کہ طیفا دوہرے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ایک طرف طیفے کی حوالات میں رو رو کر بُرا حال تھا دوسری طرف اُس کا باپ ہیڈ کانسٹیبل کی منت سماجت کر رہا تھا کہ ایک بار اُس کی بیٹے سے ملاقات کروا دے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے حیل و حجت کے بعد باپ بیٹے کی ملاقات کروا دی اور ان دونوں کو خبردار کیا کہ چوہدری صاحب کو بالکل نہ بتانا ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔

اگلے دن اسی ہیڈ کانسٹیبل نے باپ بیٹے کی گفتگو مجھے سنا دی اور کہا کہ طیفے کا بوڑھا باپ رات بھر سے تھانے کے باہر ہی بیٹھا ہے اور آپ کا منتظر ہے۔ طیفے کے باپ نے پگڑی اتار کر میرے پاؤں پر رکھ دی اور گڑگڑانے لگا کہ سرکار میرا بیٹا بے گناہ ہے۔ وہ آپ کو اصل حقیقت بتانا چاہتا ہے۔ آپ اُس کی بات سن لیں......

طیفا جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ میں ہیڈ کانسٹیبل کی زبانی سن چکا تھا۔ طیفے کے باپ کو میں قتل کی سازش کے جرم میں گواہ رکھنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اُس پر بازو ڈالنا شروع کر دیا۔

"میں تمہارے بیٹے کی کاغذوں میں گرفتاری ڈال چکا ہوں"۔ میں نے اُسے کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اور جو نہیں کہنا چاہتا، جسمانی ریمانڈ کے بعد میں یہ سب اس سے نکلواؤں گا"۔

ہیڈ کانسٹیبل نے طیفے کے باپ سے کہا کہ اگر تم بھی قتل کی سازش کے گواہ بن جاؤ تو میں چوہدری صاحب سے تمہارے بیٹے کی رہائی کی بات کر سکتا ہوں۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ میں نے طفیل اور اس کے باپ کو گواہ کے طور پر رکھا اور ان کے بیانات زیر دفعہ 161 ضابطہ فوجداری ریکارڈ کر لئے۔ طفیل نے جو بیان دیا وہ مختصراً اس طرح ہے۔

''پٹھانوں کے دو لڑکے۔ منیر اور اشرف عرف اچھی، میرے ساتھ اس گاؤں کے پرائمری سکول میں پڑھتے تھے۔ یہ لوگ 1947ء میں ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تھے۔ شرف الدین خان کی بیوی کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے کافی عرصہ اس کے گھر میں مقیم رہے۔ بعد میں منیر کے والدین لائلپور (فیصل آباد) چلے گئے اور اچھی کا باپ گوجرانوالہ میں آباد ہو گیا۔ آج کل منیرا لائلپور اور اچھی گوجرانوالہ کسی کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ آپس میں کزن ہیں۔''

''وقوعہ سے آٹھ دس روز قبل دونوں میرے گھر آئے اور بتایا کہ وہ رحمت بی بی اور شبیر کو قتل کرنا چاہتے ہیں جوان کی دشمن ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے ان کی خوب خدمت کی اور مشورہ دیا کہ چاندنی رات میں باہر نکلو گے تو پہچانے جاؤ گے۔ واردات کے لئے مناسب ہے کہ اندھیری راتوں میں کی جائے۔ رات کا کھانا کھا کر وہ چلے گئے۔ وقوعہ کی رات دوپہر کے وقت میرے پاس دوبارہ آئے۔ ان کے ساتھ اس مرتبہ بھائی شبیرو کا جیرا ذوگر بھی تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے واردات میں شریک ہونے کے لئے کہا۔ میں نے بہانے سے ٹال دیا کہ آج ہماری پانی کی باری ہے اگر رات کو تمہارے ساتھ گھر سے نکلا تو باپ سے کیا بہانہ کروں گا۔ تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ کوئی ہتھیار ہو تو دو۔ میں نے ایک برچھی کی انی ڈیرے پر سرکنڈوں کی چھت میں چھپا رکھی تھی۔ میں نے برچھی کا دستہ انہیں دے کر کہا کہ ڈیرے سے برچھی کی انی نکال لو اور دستہ اس میں فٹ کر لینا مغرب کے بعد کھانا کھا کر یہ تینوں میرے گھر سے رخصت ہو گئے۔ اگلے روز میں نے سنا کہ پٹھانوں کی دو عورتیں قتل ہو گئی ہیں۔''

طفیل اور اس کے باپ کا بیان مکمل کرنے کے بعد میں نے اس علاقے کے نمبردار کو تھانے بلا کر کہا کہ جیرا ذوگر کا پتہ کرو اور مجھے ابھی اطلاع دو۔ نمبردار کے ساتھ میں نے سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل بھی روانہ کر دیا۔ واپس آ کر نمبردار نے بتایا کہ جیرا ذوگر قتل کی رات سے غائب ہے۔ اس کی ماں نے بتایا ہے کہ وہ نوکا ذوگیا ہوا ہے۔ میں نے نمبردار سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے جیرا ذوگر ہر حال میں چاہئے اگر تم اسے پیش کروا دو تو ٹھیک ہے ورنہ میرے پاس بہت سے طریقے موجود ہیں۔

میں نے پولیس کی ایک پارٹی منیرا کی گرفتاری کے لئے لائلپور اور دوسری پارٹی اچھی کی گرفتاری کے لئے گوجرانوالہ روانہ کر دی۔ ان دوران مقتولوں کا ایک عزیز جو میرا کو لیگ تھا اور ہم پولیس لائن میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، میرے پاس آیا اور شرف الدین اور اس کے بھائی کی گرفتاری پر زور دینے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ دونوں میرے اس کیس میں مشتبہ ہیں۔ ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل جائے میں کسی بے گناہ کو مقدمے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔

ملزموں کی گرفتاری کے لئے جانے والی دونوں پارٹیاں ناکام لوٹ آئی تھیں۔ ملزم گھروں سے غائب تھے۔ نمبردار نے تین چار دنوں بعد جیرا ذوگر کو پیش کر دیا۔ میں نے جیرا ذوگر سے کوئی بات چیت نہ کی اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ میں نے اس کے ساتھ اپنا ایک مخبر بھی حوالات میں بند کر دیا تھا۔ جیرا ذوگر کا حوصلہ بلند تھا۔ وہ روزانہ کسی نہ کسی سفارش کا منتظر رہتا۔

سات دن گزر گئے۔ جیرا ذوگر کو اب یقین ہو چکا تھا کہ اس کے پیچھے یا تو کوئی آیا ہی نہیں یا پھر کسی کی سفارش کارگر نہیں ہو سکی۔ اس کے اعصاب اب کمزور پڑنے لگے تھے۔ حوالات میں وہ زیادہ دیر خاموش رہنے لگا۔ کبھی کبھار وہ جھنجھلاہٹ میں اول فول بکنے لگتا۔ مجھے ان علامات کی اطلاع ملی تو میں نے اسے حوالات سے

نکال کر تفتیشی سیل میں پہنچایا اور پوچھ گچھ کا آغاز کرایا۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ جیرا ڈوگر جیسے مضبوط آدمی کو میں نے کس طرح توڑ پھوڑ دیا کہ اس نے سب کچھ اگل دیا۔ مختصر الفاظ میں اس کی بیان کردہ کہانی آپ کو سناتا ہوں۔

رحمت بی بی اور شبنم کو شاہسوار خان کی وراثت میں زمین اور حویلی کے علاوہ بہت کچھ نقد بھی حصے میں آیا تھا۔ رحمت بی بی اولاد نرینہ سے محروم تھی۔ ان کے مرنے کی صورت میں اس جائیداد کا کثیر حصہ شرف الدین خان کو مل جاتا تھا۔ شرف الدین کی بیوی اس انتظار میں بے چین تھی کہ کب یہ دونوں ختم ہوں اور ان کو جائیداد ملے۔ منیرے اور اچھی کا بچپن شرف الدین کے گھر گزرا تھا۔ ایک عرصے بعد دونوں لڑکے میٹرک کا امتحان دے کر شرف الدین کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ شرف الدین کی بیوی نے ان لڑکوں کی خوب خدمت کی۔ اس نے کئی مرتبہ ان کے سامنے کہا کہ کب یہ رحمت بی بی مرے اور ان کو کچھ مل سکے۔

شرف الدین کی بیوی نے آہستہ آہستہ دونوں لڑکوں کے دماغ پر قبضہ کر لیا اور دونوں کو ترغیب دی کہ بڑھیا کو قتل کر دیں۔ میں یہاں یہ ظاہر نہیں کروں گا کہ اس نے لڑکوں کو کیا لالچ دیا تھا۔ دونوں لڑکے اس جرم کے لئے رضامند ہو گئے۔ وقوعہ سے دس روز قبل یہ لڑکے قتل کا پروگرام بنا کر آئے مگر طفیل عرف طیلے کے کہنے پر کہ چاندنی راتوں میں واردات مناسب نہیں، واپس چلے گئے۔ جیرا ڈوگر شرف الدین کے گھر ملازم تھا اور اس کے مویشیوں کو چارہ ڈالتا اور کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ اس دوران شرف الدین کی بیوی نے جیرا ڈوگر کو بھی خاص لالچ دے کر اس واردات میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا۔

وقوعہ سے ایک دن پہلے دونوں لڑکے شرف الدین کے گھر پہنچ گئے اور رات وہاں قیام کیا۔ واردات کی منصوبہ بندی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اچھی اپنے ساتھ تھری ناٹ تھری کا پستول دیسی ساخت کا ہمراہ لایا تھا۔ یہ 303 رائفل نہیں تھی بلکہ رائفل کی نالی کاٹ کر اسی بور کے پستول بنائے گئے تھے۔ دیہاتی زبان میں اسے پکا پستول کہتے تھے۔ اس میں 303 رائفل والا راؤنڈ استعمال ہوتا تھا۔

شرف الدین کی بیوی نے جیرا ڈوگر کو بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکے ابھی نوجوان ہیں، ان کے ساتھ پکی عمر کا کوئی مضبوط آدمی بھی ہونا چاہئے۔ وقوعہ کی شام تینوں افراد طفیل عرف طیلے کے گھر آئے مگر اس نے کسی بہانے سے انہیں ٹال دیا، البتہ برچھی کا دستہ دے دیا۔ جیرا ڈوگر نے بتایا کہ انہوں نے دستہ ساتھ رکھ لیا مگر برچھی نہ نکالی۔ جس وقت یہ طفیل کے گھر سے نکلے، رات کا پہلا پہر تھا۔ ابھی واردات کے لئے وقت مناسب نہ تھا۔ گاؤں میں کسی بزرگ کے مزار پر عرس تھا۔ ملزموں نے فیصلہ کیا کہ وقت گزارنے کے لئے عرس پر قوالی سنتے ہیں۔ نصف شب کے بعد یہ سب رحمت بی بی کی حویلی کو روانہ ہوئے۔ منیرا اور اچھی کے پاس چاقو تھے۔ جیرا ڈوگر کے پاس لاٹھی تھی۔ اس نے اور اچھی نے کندھوں پر کپڑوں کے تھیلے لٹکا رکھے تھے۔

واردات کے وقت جیرا ڈوگر لاٹھی لئے ایک طرف کھڑا رہا۔ منیرا اور اچھی نے رحمت بی بی پر چاقو کے وار کئے۔ شبنم چھت سے اتری تو دونوں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ نوکرانی کے شور مچانے پر منیرا اور جیرا ڈوگر دروازے کے راستے بھاگ نکلے۔ اچھی نے دروازے کی جانب فائر کیا تاکہ اندر آنے والے ڈر کر رک جائیں۔ فائر مس ہو گیا یعنی گولی نہ چلی تو وہ عقب میں دیوار پھلانگ کر بھاگ گیا اور کھیتوں سے چکر لگا کر ان سے آن ملا۔ راجباہ پار کرنے کے بعد انہوں نے فلیٹ شوز اتار کر

تھیلوں میں ڈالے اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے شرف الدین کے گھر پہنچے جہاں شرف الدین کی بیوی پہلے سے ان کی منتظر تھی۔ ملزموں نے یہاں خون آلود کپڑے تبدیل کر کے غسل کیا اور علی الصبح مختلف سمتوں میں بسوں کے ذریعے فرار ہو گئے۔ شرف الدین کی بیوی نے فلیٹ شوز، خون آلود کپڑے اور برچھی کا دستہ سب جلا ڈالا۔

میں نے جیرا ڈوگر سے شرف الدین کے اس واردات میں ملوث ہونے کے بارے میں تفصیلاً چھان بین کی۔ شرف الدین کا اس قتل سے براہ راست کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکا۔ یہ سارا پلان اس کی بیوی کا تھا۔ البتہ جب وہ چوکیدار کے ہمراہ تھانے میں قتل کی اطلاع دینے آیا، اسے واردات کا علم ہو چکا تھا کہ قاتل اس کے گھر میں ہی ہیں۔

جیرا ڈوگر نے قتل کا اقبال کر لیا تھا۔ میں نے فی الحال اسے کاغذی کارروائی میں گرفتار نہ کیا۔ وہ میری تحویل میں تھا۔ اسے آپ ناجائز حراست بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں دوسرے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے خود روانہ ہوا۔ پہلے لاکھو پر چھاپہ مارا مگر ملزم نہ مل سکا۔ میں جب لاکھو روانہ ہوا تھا تو میری بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ واپس آیا تو اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ میں اس کی تیمارداری اور علاج کی وجہ سے دو دن تک گوجرانوالہ چھاپہ مارنے نہ جا سکا۔ میں نے ایک پولیس پارٹی گوجرانوالہ روانہ کی جو ناکام واپس آ گئی۔ میں اب خود جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک میرا عزیز دوست جمشید تھانے آ گیا۔

''چوہدری ظہور!'' اس نے کہا۔ ''اگر تم گوجرانوالہ ریڈ کرنے جا رہے ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میں اس ملزم کو گرفتار کروا سکتا ہوں''۔

اس نے مجھے دعوت دی کہ اتوار کے دن اس کے گھر دوپہر کا کھانا کھاؤں۔ وہاں ملزم اچھی کو اس کا والد لے کر آ جائے گا۔ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اچھرہ نہر کے کنارے جمشید کی کوٹھی میں چلا گیا۔ دوپہر دو بجے کا وقت مقرر تھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ میں نے جمشید سے کہا کہ اب وہ لوگ نہیں آئیں گے، تم میرا لنچ خراب نہ کرواؤ، کھانا لگواؤ۔

ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ جمشید کے چہرے پر شرمندگی اور خجالت کے تاثرات تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم اِدھر اُدھر کی گپ شپ کر رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی کی آواز آئی۔ جمشید باہر گیا۔ واپس لوٹا تو اس کے ہمراہ گوجرانوالہ کا آڑھتی معراج دین تھا۔ مقتولوں کی قل خوانی کے موقع پر یہ شخص مجھے بڑے بڑے افسران سے اپنے تعلقات جتا کر مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور قاتلوں کی جلد گرفتاری پر زور دے رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے معراج دین سے اس کے بیٹے کے متعلق پوچھا۔

''چوہدری صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''اچھی میرے ساتھ گوجرانوالہ سے روانہ ہوا تھا۔ ہم لاری اڈے سے اور پیدل ہی شاہی قلعے کے ساتھ والی سڑک سے ہوتے ہوئے محلہ بارود خانہ سے گزر کر رنگ محل پہنچے۔ وہاں ڈبی کی ڈبہ سے اچھی مجھ سے الگ ہو گیا۔ میں اپنے ساتھ بیس ہزار روپیہ لایا ہوں۔ رقم آپ رکھ لیں، میں لڑکا بھی پیش کر دوں گا''۔

جمشید نے معراج دین کے کہنے پر مجھے بیس ہزار روپے کی آفر کی۔ میں نے کہا کہ ملزم کو پیش کر دو تو رقم بھی رکھ لوں گا۔ معراج دین کی چال تھی کہ تھانیدار کو پہلے رقم پہنچ جائے پھر لڑکے کے بارے میں مزید سودے بازی کر لیں گے۔ میں اپنی چال پر تھا کہ کسی طرح ملزم کو گرفتار کر لوں اس لیے میں نے جمشید اور معراج دین کو صاف صاف بتا دیا کہ میں ان کی چال میں نہیں آؤں گا۔۔ میں غصے سے آگ بگولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"خان صاحب!" میں نے معراج دین سے کہا۔ "تم اپنے لڑکے کو ساتھ لائے ہی نہیں۔ وہ تو اس وقت تحصیل نارووال کے گاؤں روڑے افغاناں کے قبرستان میں سائیں کے پاس روپوش ہے۔ تم اس وقت گوجرانوالہ کی بجائے نارووال سے آ رہے ہو۔ اب تم لڑکے کو کالے پانی بھی چھپا دو تو میں اُسے نکال لاؤں گا...... اب میرے ساتھ سودے بازی کی کوشش نہ کرنا"۔

میں واپس تھانے آ گیا۔ اے ایس آئی اعظم جس کو میں نے رات ہی نارووال ملزم کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیا تھا، ناکام واپس آ چکا تھا۔ اعظم کی ناکامی کا علم مجھے معراج دین کو جمشید کے گھر دیکھ کر ہو گیا تھا۔ مجھے مخبر نے اچھی کی موجودگی کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ معراج دین بیٹے کو خرچہ دینے وہاں آئے گا۔ اگر ہماری پولیس پارٹی کا چھاپہ کامیاب ہوتا تو معراج دین جمشید کے گھر پہنچنے کی بجائے حوالات پہنچ چکا ہوتا۔

ضروری کارروائی کر کے میں نے دو ڈاکوؤں کو عدالت سے اشتہاری مجرم قرار دلوا دیا۔ جیرا ڈوگر بدستور میری تحویل میں تھا۔ میں نے نمبردار کو بلا کر کہا کہ میں جیرا ڈوگر کو وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ نمبردار نے مجھے آفر کی جیرا ڈوگر کی ملکیت میں چار ایکڑ اراضی ہے۔ آپ حکم دیں تو وہ بکوا دی جائے۔ نمبردار کی اس آفر پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کی ضرورت نہیں"۔ میں نے کہا۔ "میں اسے ویسے ہی وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں"۔

ڈاکوؤں کے لواحقین نے ایک چال اور چلی۔ انہوں نے میرے علاقے کے ایک بااثر زمیندار کو میرے پاس بھیجا۔ (یہ زمیندار صاحب بعد میں بزرگ سیاسی شخصیت کے طور پر مشہور ہوئے اور نواز شریف کابینہ میں وزیر بھی رہے)۔ ان صاحب نے مجھے مشورے کے انداز میں کہا کہ جیرا ڈوگر ایک کچی آدمی ہے۔ کل کو اگر منحرف ہو گیا تو آپ کا سارا کیس خراب کر دے گا اس لئے کسی دوسرے مجرم کو وعدہ معاف بنا لیں۔ کچھ رقم بھی آپ کو مل جائے گی۔ میں نے اس شخصیت کو جواب دیا کہ جیرا ڈوگر منحرف بھی ہو گیا تو کوئی بات نہیں۔ میں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں۔ میرے پاس شہادت مکمل ہے۔

لاکھو پور میں ایک بار خود ریڈ کر چکا تھا۔ اب گوجرانوالہ بھی میں بذاتِ خود چلا گیا اور اپنی کارروائی مکمل کر کے آ گیا۔ اسی دن شام کو میرے گھر علاقے کا محکمہ جنگلات کا بلاک افسر آیا۔ اُس نے تولیے میں ساڑھے سات ہزار روپے لپیٹ رکھے تھے۔ اُس نے کہا کہ وہ یہ رقم شرف الدین کی بیوی کی جانب سے لے کر آیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ بھی ساتھ آئی ہے، اور ذرا ہٹ کر ادھر کھڑی ہے۔ میں نے شرف الدین کی بیوی کو بلا کر وہی کچھ کہا جو جمشید کے گھر معراج دین کو کہا تھا کہ رقم میں ضرور لوں گا مگر اس کے ساتھ ملزم بھی پیش کرو۔ وہ بھی مایوس اور ناکام لوٹ گئی۔

ڈاکوؤں نے اب آخری پتا پھینکا۔ انہوں نے دو مختلف تھانوں کے افسروں سے رابطہ کیا۔ ایک ملزم ایک تھانے میں اور دوسرا ملزم دوسرے تھانے میں ان کے تھانیداروں کے حوالے کر دیا۔ ہر تھانیدار نے اپنی الگ الگ کارروائی ڈالی کہ انہوں نے ملزم کو بڑے ڈرامائی انداز میں مخبری ہونے پر فلاں جگہ گھیرا ڈال کر گرفتار کیا ہے۔ ان میں سے ایک تھانیدار مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس نے مجھے رقعہ بھیجا کہ وہ ملزم کو فلاں وقت پر فلاں سٹیشن سے لے کر جیل چھوڑنے جا رہا ہے لہٰذا میں مقدمے کے ضروری گواہان کو لے کر اس جگہ پہنچ جاؤں اور ملزم کی شکل و صورت دکھا دوں تاکہ یہی گواہ بعد میں شناخت پریڈ میں اسے شناخت کر لیں کہ ان ملزموں کو انہوں نے واردات کے وقت موقع پر دیکھا تھا۔ میں

نے وہ رقعہ ان تھانیدار صاحب کو ان الفاظ کے واپس بھجوا دیا۔

"شاہ جی! اس مہربانی کا شکریہ۔ آپ نے اپنا کام کرلیا، میں اپنا کام کرلوں گا۔ مجھے گواہوں کو ملزم کی شکل دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

جب دونوں ملزم جیل چلے گئے تو میں نے جیرا ڈار کی گرفتاری کا غذوں میں ڈال دی۔ دو یوم بعد میں نے نوکرانی کو لے کر ملزموں کی شناخت پریڈ کروانے جیل میں گیا۔ وہاں پر جناب ایس اے حکیم صاحب تحصیلدار جو بعد میں ڈپٹی کمشنر سرگودھا بھی رہے، موجود تھے۔ شناخت پریڈ سے پہلے میری ان سے علیک سلیک ہوئی۔

"کیوں بھئی چوہدری کیا پوزیشن ہے؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"سب اچھا ہے سر"۔ میں نے مسکرا کر روایتی سا جواب دیا۔

شناخت پریڈ شروع ہوگئی۔ پوزیشن بدل کر تین بار ملزموں کو مختلف انداز میں کھڑا کیا۔ نوکرانی نے ہر بار دونوں قاتلوں کو بالکل درست طور پر شناخت کیا۔

میں نے ملزموں کا ریمانڈ واپس لیا اور اب ملزم میرے قبضے میں تھے۔ اسی روز میں نے شرف الدین کی بیوی کو بھی گرفتار کرلیا کیونکہ وہ اب یہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر رہی تھی کہ میرے مخبر نے جو اس کی نگرانی پر مامور تھا، تھانہ اطلاع کردی۔

میں شناخت پریڈ کے بارے میں آپ کی حیرانگی دور کرنا چاہتا ہوں۔ رات کا وقت تھا اور ملزموں کے چہرے ڈھاٹوں میں پوشیدہ تھے پھر اتنی کمسن لڑکی پر دہشت بھی طاری تھی۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ لڑکی ملزموں کو شناخت کرے گی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ قاتلوں کی گرفتاری کے لئے میں خود ایک بار لالہ موسیٰ اور گوجرانوالہ گیا تھا۔ میں خود وہاں کے نزدیکی پولیس سٹیشن کی مدد سے کئی مقامات پر ملزموں کی تلاش میں ریڈ کیا۔ منیرا اور اچھی کے کالج بھی گیا تھا اور ان کے پرنسپل سے ملاقات کی تھی۔ میں نے کالج کے ریکارڈ سے ان کی تصویر حاصل کرلی تھیں۔ منیرا کی پاسپورٹ سائز تصویر کے علاوہ ایک گروپ فوٹو بھی میرے ہاتھ آئی تھی۔ شناخت پریڈ سے پہلے میں نے یہ تصاویر کئی بار نوکرانی کو دکھائیں اور ملزموں کا حلیہ اُسے ازبر کرا دیا تھا۔ میرا ذاتی طور پر ملزموں کے گھروں میں ریڈ کرنے کا مقصد اصل میں ان کی تصاویر کا حصول تھا۔ رازداری کے پیش نظر میں نے یہ کام خود ہی کیا تھا۔

قاعدے قانون کو دیکھیں تو ایسا نہیں کیا جاتا لیکن یقین ہو جائے کہ ملزم یہی ہیں تو انہیں سزا دلوانے کے لئے کہیں کہیں ڈنڈی مارنی پڑتی ہے۔

ریمانڈ کے دوران قاتلوں نے موقعۂ واردات پر جا کر سب گاؤں والوں کے سامنے واردات کی تصدیق کی اور بتایا کہ وہ کس طرح اندر داخل ہوئے اور کہاں کھڑے ہو کر کس کو چاقو مارے۔ اب مسئلہ آلاتِ قتل کی برآمدگی کا تھا جس کے بغیر مجرموں پر جرم ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ اچھی نے بتایا کہ اس نے پستول اس وقت دریائے راوی میں پھینک دی تھی جب وہ بس میں گوجرانوالہ فرار ہو کر جا رہا تھا۔ باقی سارا سامان جو واردات میں استعمال ہوا، شرف الدین کی بیوی نے جلا دیا تھا۔

میں نے اپنے واقف کار ایک دو بدمعاشوں سے کہہ کر ایک پستول منگوایا۔ بند کارتوس جو پہلے سے پانی میں بھگو کر رکھے ہوئے تھے اس سے فائر کئے حتیٰ کہ جب ایک کارتوس مس ہوگیا تو اسے پستول سمیت Balistic Expert کے پاس تجزیہ کے لئے بھجوا دیا۔ بازار سے نئے فلیٹ شوز خریدے، ایک لاٹھی بھی منگوا کر اس پر تازہ خون کے چھینٹے مارے۔ یہ خون بالکل انسانی تھا۔ میرے پاس لڑائی جھگڑوں کا کوئی کیس آیا۔ مضروب کا خون بہہ

رہا تھا میں نے اس خون کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ لیبارٹری سے تجزیہ کرایا کہ ان اشیاء پر انسانی خون کے داغ موجود ہیں۔

اس کے بعد میں نے وعدہ معاف گواہ کا عدالت میں بیان کروانا تھا۔ میں نے اس کی ماں کو اور نمبردار کو بلا کر کہا کہ میں نے ہزاروں روپے کی رشوت ٹھکرا کر جیرا ذوگر کو وعدہ معاف گواہ بنایا ہے۔ اب اسے بھی چاہئے کہ سچ اور صحیح بیان دے۔ میں جیرا ذوگر، اس کی ماں اور نمبردار کو مسجد میں لے گیا۔ وہاں جیرا ذوگر نے قرآن پاک پر قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ صحیح بیان دے گا۔ لاہور میں چوبرجی چوک میں آج کل ایک عظیم الشان خیراتی ہسپتال بن رہا ہے۔ یہ ہسپتال شیخ عظیم وقف ٹرسٹ ہسپتال کے نام سے منسوب ہے محترم مدثر عظیم صاحب ان دنوں لاہور میں مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے جیرا ذوگر کا بیان قلمبند کیا جو اس نے بالکل درست دیا تھا۔

تمام قاتلوں کو جیل بھجوا کر میں نے مقدمے کا چالان مکمل کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ جب سیشن کورٹ میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی اور میں گواہی دینے گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ جیرا ذوگر وعدہ معاف گواہی سے منحرف ہو رہا ہے۔ میں نے جیرا ذوگر کو یاد دلایا کہ تم نے قرآن پاک پر حلف اٹھایا تھا، اللہ سے ڈرو مگر وہ منحرف ہو گیا۔ اس کے باوجود باقی ملزموں کے خلاف میں نے بڑے ٹھوس ثبوت مقدمے میں لگائے تھے۔ ان کو سزا ہو گئیں۔

جیرا ذوگر کا میں نے پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ وعدہ معاف اگر منحرف ہو جائے تو اس کی وعدہ معافی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ملزم بن جاتا ہے۔ تفتیشی افسر نے عام طور پر مقدمے میں وعدہ معاف کے خلاف کوئی محنت نہیں کی ہوتی۔ اس لئے وہ سزا سے بچ جاتا ہے۔ میں نے جیرا ذوگر کے خلاف سب سے پہلے شہادت جمع کی تھی اور اس کی بدبختی کا مناسب انتظام کر رکھا تھا۔ جیرا ذوگر کے خلاف بعد میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی اور اس کے خلاف ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر اس کو بھی سزا ہو گئی۔ میں اس کے خلاف مقدمے میں عدالت کے طلب کرنے پر گواہی کے لئے گیا تو جیرا ذوگر مجھے کہنے لگا۔ ”چوہدری صاحب! غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دیں۔“

میں نے اسے جواب دیا کہ میں نے تو تمہیں شروع میں ہی معاف کر دیا اور وعدہ معاف بنایا تھا۔ تم نے اللہ کی مقدس کتاب پر حلف لے کر جھوٹ بولا۔ خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ نتیجے کے طور پر جیرا ذوگر جسے باہر کی دنیا میں آزاد پھرنا چاہئے تھا جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔

عام طور پر جب ملزم اقبال جرم کر لیتا اور مجسٹریٹ کی عدالت میں بیان قلمبند بھی کرا دیتا ہے تو تھانیدار صاحب خوش ہو جاتے ہیں اور چالان عدالت میں پیش کر دیتے ہیں۔ ملزم اگر اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے تو اسے سزا دلانا ممکن نہیں ہوتا۔ عقلمند تھانیدار اقبال جرم کے ساتھ پوری شہادت اور ثبوت تیار رکھتے ہیں جس سے اس کا جرم ثابت ہو جاتا ہے۔ اکثر کیسوں میں مکمل شہادت نہیں مل سکتی۔ یہ خالی خانے جھوٹے گواہوں سے اور جعلی اگزبٹ رکھ کر پُر کئے جاتے ہیں جسے پولیس کی زبان میں پیڈنگ کہتے تھے۔ یہ پیڈنگ اسی صورت میں کی جاتی ہے جب یقین ہو جاتا ہے کہ اس واردات میں مجرم یہی شخص یا اشخاص ہیں۔ اگر پولیس پیڈنگ نہ کرے تو مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا ناممکن ہو جائے۔ میں نے جیرا ذوگر کے منحرف ہو جانے کی صورت میں پیڈنگ کا نہایت اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔

ایک حقیقت ایک افسانہ

برستی بارش میں سڑک کنارے ایک پری وش بھیگے لباس میں کھڑی مجھے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ ستم رسیدہ لگ رہا تھا۔۔۔ میں نے گاڑی روک لی۔

ڈاکٹر مبشر حسین ملک ---- 0345-6875404

"کریم! میری جان، آج تم تاخیر سے آئے ہو۔ تمہی بتاؤ تب بھی اندازہ ہے کہ صنف نازک کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ تم نے کسی کو فریب دیا ہوگا یا خود کسی دھوکے میں آئے ہو گے"۔ جونہی کریم نمودار ہوا زبیر نے اس کی خبر لے لی۔ بات کرتے ہوئے اس نے دوست کے اترے ہوئے چہرے کا بھی لحاظ نہ کیا۔ دوستوں کا جتھا حسب معمول ایک انڈر گراؤنڈ کلب میں جمع ہو چکا تھا، جو شہر میں منفی سرگرمیوں کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

بارش اس دم ذرّوں پر نہ تھی بلکہ طوفانی روپ دھار چکی تھی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکے بڑی بڑی کھلی کھڑکیوں کے واسطے وسیع و عریض ہال میں گھل رہے تھے، جن کے روشن پر برکھا کے زیر اثر سے عمارت کے اندر تک بکھر جاتے تھے۔ پانی اور ہوا کی آمیزش سبزے کی مہک میں رچ بس گئی تھی جو ساون کے عروج کا پتہ دے رہی تھی۔ بادہ خواروں کی بھی زیر عمارت میں ہجوم کی بڑی وجہ تھی۔ کشادہ کرسیوں کے بیچ میزیں ترتیب میں قرینے کو چکی تھیں بلکہ ان پر آویزاں اشیاء بھی حسن سلیقہ سے مبرا دکھائی دیتی تھیں۔ جام و سبو سے وابستہ تلاطم فہم سے بے نیاز میں جوئے کے لوازمات بھی الجھے پڑے تھے۔ ماحول میں الجھاؤ موجود انسانوں کی بے ربط خیالی کی عکاسی کرتا تھا۔ وہاں سکون کی مصنوعی کاوشیں بے سکونی کی جھلک غالب نظر آتی تھی۔

کلب میں رسم بادہ و خم رات گئے تک جاری رہتی تھی جس کی گہماگہمی میں سٹے بازی اور جوئے کے باعث کہیں یاس و خفت بھری مات ہوتی تو کہیں آلودہ جیت کا غرور۔ گہری شام رونقیں اور بھی پنپنے لگتیں، جب یہاں کلب میں منڈلایا کرتی تھیں۔

دستور خم خانہ میں شناسا چہرے ہنگاموں کی جان ہوا کرتے تھے۔ ان جمگھٹ میں کریم کی نشست کم ہی خالی نظر آیا کرتی تھی۔ وہ کلب میں مقبول سمجھا جاتا تھا، خصوصاً خواتین میں اس کی مسکان انتہائی جانی جاتی تھی۔ پھر اس کی حاضر جوابی اور ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت بھی زبان زد عام رہتی تھی۔ وہ گفتگو میں رنگ پاشی کا دھنی تھا مگر اس روز بھی کچھ خلاف معمول تھا اور افسردگی اس کے شخصی ذہن پر پرچھائیوں کی صورت طاری ہو چکی تھی جس کا کرب و جبر ادراک اس کے رفقاء کر چکے تھے۔

"مزاج دشمناں میں گرانی کیوں؟" زبیر نے مخصوص انداز میں بات کی۔ نگاہیں نووارد پر جمی ہوئی تھیں۔

جواباً کریم نے ایک تیکھی نظر دوستوں پر ڈالی اور اچاٹ لہجے میں بڑبڑایا۔ "طوفانی موسم کبھی نصیبوں پر بھی چھا سکتے ہیں"۔ اس نے ناگواری سے کہا اور آخر ہجوم میں پاؤں کی ٹھوکر سے خالی کرسی پیچھے کو سرکائی۔ پھر اسے بانہہ کے سہارے سے کسی زاویے پر تھام لیا۔ اگلے لمحے وہ اس بے نشست کے دبیز گدوں پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

اسی دم سٹیج پر رقص و موسیقی کا آغاز ہوا۔ بے ہنگم شور شرابے میں ٹھہراؤ سا آ گیا پھر برکھا کے صوتی پس منظر میں گھمبیر تان ہر ارتعاش میں بکھر گئی۔ فن کار رقص خیال اور دلکشی میں یکتا دکھائی دیتی تھی۔ کریم بھی لمحوں کی زیبائش میں کھو سا گیا۔

"یوں بغور نہ دیکھو یار! میلی ہو جائے گی"۔ زبیر نے شغلاً کریم کو مخاطب کیا مگر فوراً اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس کی کاوش دوست کے دل زاویہ پر گراں گزری تھی۔ غصہ دکھلا کہ کریم کی کچھ کھلی نگاہیں فنکارہ پر مرکوز بے خیالی میں جمی ہوئی تھیں۔ اسے اپنی ہمدمی دوستی پر قدغن غیر مناسب لگی۔ اسے اعتراض ہوا کہ کیسے کے پھیلاؤ میں فقط اسی کو کیوں پھانسا گیا۔ اس پر وہ جزبز ہوا تو معاملہ الجھنے لگا۔ کمپیر نے بیچ بچاؤ کی رسم نبھائی اور بدمزگی کی متوقع طوالت میں خلل ہوا۔

"یار! آخر آج تم نے غصہ یوں ناک پر کیوں دھر لیا ہے؟" اس نے آزمائے ہوئے لہجے میں ہمدردی کی

بے چینی سے یوں لگا جیسے وہ کسی منفی عمل میں بڑی پونجی ہار آیا تھا۔

”کسی نے آج مجھے زندگی کا کاری سبق پڑھا دیا“۔ کریم نے جملہ یوں سنایا جیسے ہاری ہوئی مایا ادا کر رہا تھا۔

برکھا نے انگڑائی لی، چھلکتے ہوئے جام بادہ خواروں کے ہاتھوں میں تھرانے لگے۔ مے کے چند گھونٹ کریم کے حلق میں بھی اتر گئے۔ شراب کی گرمی ذہنی حالات میں مدغم ہوئی تو اس کے چہرے پر سکون کی رمق بکھر گئی۔

”دوست! یہ بتاؤ کہ کیسی بلا حضور نے کرامت تو نہیں جان نکلنے؟ ہماں تو نہیں کر دی؟ تمہیں کس نے مار سے؟“ اعظم بھی اپنی تشویش زبان پر لے آیا۔

دوستوں کے بیچ فکرمندانہ اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جان لینا چاہتے تھے کہ ان کے گہرے دوست کو ان کی بازی مات ہوئی اور کیسے؟ اور وہ کون ساشہ زور تھا جس نے کریم جیسے سورما کو اپنے جال میں جکڑ لیا۔ عقدہ کھلنا شروع ہو چکا تھا۔ جذبوں کو سدھار دیتے ہوئے کریم معاملہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دوستو!“ اس نے بہی خواہوں کو مخاطب کیا۔ ”تم رفقاء سے ملنے کا مقصد دکھتے دل و ذہن کو تسلی دینا بھی تھا۔ صبح ہی سے طبیعت اکارت رہی تھی۔ بدشگونیاں تواتر سے سرزد ہوتی رہیں۔ جی چاہا کہ شام کہیں اور غارت کر دوں۔ بارش موسلادھار برس رہی تھی۔ دل منداہو تو رُتیں بھی اداسی دکھتی ہیں“۔ کریم نے آہ بھری، پریشان لہجے میں مدھم بولتا رہا۔ ”پھر خیال آیا کہ اسودہ روزگار میں تعطل مناسب نہیں۔ فیکٹری کے چند معاملات حل طلب تھے، سوچا انہیں سلجھا کر تم سب رفقاء سے ملوں گا۔ مل کر ہم ضیافت اڑائیں گے، موسم کا لطف بھی اٹھائیں گے۔ ماحول بدل جائے تو رویے بھی سلجھ جاتے ہیں“۔ اس نے قصہ آگے بڑھایا۔ اس کے وجود میں اب وہی اضطراب دکھائی دے رہا تھا جو اس کے دست گرفتہ شیشے میں نظر آ تا تھا۔ وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بیچ بچھڑ گیا ہوا۔

”گھر سے نکلا تو بارش زوروں پر شروع ہو گئی۔ یہ کہیں کہ بھاری بوندیں تیز ہوا کے موتی گردابوں میں رچنے لگیں۔ بوچھاڑ کے باعث مجھے گاڑی چلانے میں خاصی دقت ہونے لگی۔ سوچا، واپس گھر لوٹ چلوں۔ سڑک پر ویرانی نے اکتاہٹ بھی دو چند کر دی تھی مگر اگلے لمحے میں اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا“۔ وہ رکا، پھر بولا۔ ”ایک انسانی ہیولہ میری توجہ کا مرکز بن گیا“۔ یہ کہتے ہوئے کریم کے چہرے پر تغیر میں طوفان سا برپا ہوا اور اس نے کانپ مستقل چند گھونٹوں میں خالی کر دیا۔ پھر لمبی سی آہ بھری جیسے سسکی سی لی ہو اور خالی پیالے کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اسے الٹ پلٹ کرتا رہا حتیٰ کہ اس کے متغیر نقوش ٹھہراؤ کے تو زان پر منجمد ہونے لگے۔

”سڑک کے کنارے ایک پری وش کھڑی تھی۔ نازک اندام گرشیم بدن۔ بظاہر ستم رسیدہ۔ مجھے اس نے چونکا دیا“۔ کریم نے انکشاف کیا۔ ساتھ ہی دوستوں کے ہاتھوں میں ساغر چھلکنے لگے۔

”تنہا چھوکری اور وہ بھی برستے پانیوں میں؟“ زبیر حیرت کے مارے چیخ پڑا۔ شراب اس کے لبوں سے ٹپکنے لگی۔

”ہاں“۔ کریم نے جواب دیا۔ ”وہ مدد کی متلاشی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک پر گاڑی پا کر اس کی آنکھیں کھل اٹھیں۔ پھر شرما کر اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں نے گاڑی روک لی“۔ کریم نے کہا۔ زبیر اس صورت حال پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا مگر لفظ اس کے دانتوں میں اٹک گئے۔ اگلے لمحے جام ان لبوں کی زینت بن گیا۔ اعظم کا حلق بھی مائع سے سیراب ہو رہا تھا۔

”برستی ہوئی برکھا میں تنہا پری چہرہ“۔ میر نے ترنم اور شراب کا سرور گنگناہٹ میں بہا دیا، پھر معنی خیز نظروں

سے کریم کی طرف دیکھنے لگا۔

"منہ زور بارش نے تنزیلہ کو بری طرح بھگو ڈالا تھا۔ لباس تر ہو جانے کے باعث اس کے بدن کا ہر ایک انگ خدوخال بناوٹ کی عکاسی کر رہا تھا"۔ کریم نے کہا۔ "مجھے قریب پا کر اس نے تن سنبھالنے کی کوشش کی مگر پہناوے میں چناؤ کی کوتاہی اس کے آڑے آ گئی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا"۔ اس نے بتایا۔ معاملہ جان کر دوست ششدر رہ گئے۔

"واہ رے"۔ اعظم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وام اللہ ھائے کیا"۔ زبیر نے لفظوں کے قالب سے رومانیت اچک لی۔ وہ کریم کی باتوں پر غیر یقینی میں مبتلا نظر آیا۔

"تمہارے تو وارے نیارے ہو گئے ہوں گے؟" سمیر نے اپنے انداز میں برجستہ تبصرہ کیا۔

"اور باچھیں کانوں تک کھل اٹھی ہوں گی"۔ کریم کو اعظم بھی گفتگو میں شامل رہا۔

"بارش ترس والی بات سمجھ میں نہیں آئی"۔ سوچتے ہوئے زبیر نے اپنی رائے ٹھونکی، پھر شوخی سے کریم کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیوں بھلا! اندھیرے گھپ موسموں میں رحم نہیں ہوتا؟" سمیر نے کریم کے دل پر چرکا لگایا جس کی گہرائی کریم کے چہرے پر عود کر آئی۔ زبیر اور اعظم اپنے اپنے انداز میں ہنسنے لگے۔

"شٹ اپ!" کریم نے دوستوں کو ڈانٹ پلائی۔

کبابوں سے بھری ڈش میز پر آ چکی تھی جس کے ساتھ لوازمات بھی آراستہ تھے۔ جام و سبو میں بھی کمی نہ تھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی سوندھی مہک تر ہوا میں رچنے لگی۔ ویٹرز لڑکیاں جا بجا مصروف کار تھیں۔ نظریں انہیں دور دور نگاہوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ برکھا برس رہی تھی، تمنائیں مچل رہی تھیں، ساون رت کے پجاریوں نے ماتھوں کو گرما رہا تھا۔

"میں نے [illegible] سمجھایا۔ بارش اس قدر تیز تھی کہ اس کا وجود بھی تر ہو گیا"۔ کریم نے گفتگو آگے بڑھائی۔ "فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی ہم سفر کی تمنائیں بے قابو ہونے لگیں۔ اس کی یہ جرأت مجھ پر بھی دیر اثر انداز ہوئی۔ میں نے لڑکی اور اس کے انداز پرکھا، پھر خیال کیا کہ سفر رنگینی میں کٹ جائے گا۔ دوستی بڑھی تو اسے ذاتی اور روزمرہ کی معمولات میں بھی شامل کروں گا"۔ کریم نے اپنی شخصی کمزوری کو ہمدردی کا لبادہ پہنانے کی کوشش کی مگر یکدم بے قراری کی بے قابو لہر اس کے ذہنی افکار میں موجزن ہوئی۔ اس نے پھر خالی جام میں انڈیل لی۔ ساتھ ہی اپنے مرغوب سگار کو بھی آتش دکھا دی۔ پھر وہ نشست پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ خیالوں میں غلطاں وہ دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ باہر اندھیرا بہت گہرا تھا۔ برکھا پوری شدت سے برس رہی تھی۔ شاہراہ کے کنارے ایستادہ روشنی لیمپ مدھم دیوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سڑکوں پر حیات معدوم تھی۔ یک دم تیز بوچھاڑ نے پھر اس کا بدن بھگو دیا۔ پانی اس کے چہرے پر بھی پھیل گیا۔ شراب کی کڑواہٹ میں سگار کے دھوئیں کی آمیزش ہوئی تو کریم کے لہو میں ابال اٹھنے لگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی جانب واپس لوٹا تو وہ اس کی آمد سے بے نیاز چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ نشے کی بڑھتی ہوئی کیفیت میں کریم کا ذہن اجنبی لڑکی پر مرکوز ہو چکا تھا۔ وہ اس بوالہوسی کے طلسم میں نسوانی حسن کے گیت گا رہا تھا۔

"وہ رت بھری تھی، بکھری کرن کی طرح دمکتی تھی۔ اس کی مسکان موسم کا تر و تازہ گہرا تھی اور لرزیدہ لب یاقوت رنگ۔ اس کی خودکلامی میں بھی کلیاں جھڑ رہی تھیں"۔ وہ بولا۔

"خودکلامی؟" زبیر یک دم چونک پڑا۔

"شعلہ بار شمع ہائے بزم کی پھلجھڑیاں پروانوں سے

لئے پھندا ہوتی ہیں"۔ سمیر نے اندازہ کیا۔ کریم اپنی دھن میں بولتا رہا۔

"بھی تو وہ مدھ بھری اور شاداب لیکن نگاہیں اس کی بڑی پیاسی تھیں۔ مجھے لڑکی کا روپ آگ بجھے چونے کی طرح دکھائی دیا جسے بجھانے کے لئے باراں کا بحر بھی تہی دست دکھتا تھا"۔ کریم نے کہا۔

وہ اور بھی کچھ بولتا مگر گرد چہروں پر ابھرنے والے سوالیہ تاثر نے اس کے جملوں میں فل سٹاپ لگا دیا۔

"اپنی فاش غلطیوں پر تم بھونڈی توجیہہ باندھ رہے ہو"۔ زبیر نے تلخ اور تیز لہجے میں افسردگی سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ چوروں کو مور پڑ گئے ہوں گے"۔ سمیر بھی بول پڑا جبکہ اعظم کی گفتگو لمبی سی معنی خیز "ہوں" پر سمٹ کر رہ گئی۔ کریم نے جواباً کچھ بڑبڑانے کی کوشش کی مگر فقط ممیا کر رہ گیا۔ وہ الجھاؤ کے باعث زچ نظر آنے لگا تھا۔

کھانے کے دوران کچھ وقت بغیر بات کئے گزر گیا۔ خاموشی شاید لازم بھی تھی۔ دوسروں کی توجہ شراب اور کباب کی طرف مبذول رہی۔ وقت کے ساتھ رت میں تیز ہواؤں کے جھونکے بڑھ گئے تھے۔ سردی اجسام حیات میں مچلنے لگی تھی۔ اس ہال کے سٹیج پر چہل پہل بھی زیادہ تھی۔ لوگوں کا رقص حد ہی چھو رہا تھا۔ ہر سو گہما گہمی دکھائی دیتی تھی۔ اجنبی لڑکی بدستور کریم کے ذہن میں بسی ہوئی تھی۔ مے اس کے حواس پر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔ کچھ بہک بھی رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"وہ خود نمائی میں بھی یکتا نظر آئی تھی۔ لباس سمٹا لینے کے سلیقے میں برکھا کے ہمرکاب رہی۔ اس کا بدن سفید مرمر کی طرح اجلا تھا، دمکتا ہوا۔ گردن صراحی دار تھی اس کے بازو مجھے دعا کرنے کا سبب دامن تھمانے دیتے، جبکہ اس کی مسکان میں رخساروں کے گڑھے جو گہرے اور بھنور تھے دعوت ازدحام دیتے تھے۔ ایسے میں اس کی آنکھوں کے الاؤ بجز کے تو میرا وجود جھلسنے لگے۔ اس کے لبوں کے جام مجھے ترسانے لگے۔ اس کے سانسوں کی حدت میرا وجود گرمانے لگی۔ سچ تو یہ ہے دوستو کہ اس کے سحر نے مجھے مدہوش کر دیا تھا"۔

لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ بدستور اپنی رو میں بہتا رہا۔

"وہ بلاشبہ بھی بلا کی بلا تھی۔ اس کی زلفوں کی طوالت مجھے فقط بھی شعروں میں دکھی تھی۔ جنہیں میری اکائی نے جب اوڑھا تو میں اس دنیا سے اوجھل ہو گیا، نشیلی گھٹاؤں میں کھو گیا"۔ کریم نے کہا۔ ساتھ ہی یخ ٹکڑوں پر مائع کی نشیلی صورت ہواؤں میں بکھرنے لگی۔

"میں تو تمہیں بڑا جینئس سمجھا کرتا تھا"۔ سمیر نے دوست کو مخمور نگاہوں سے تکتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "مگر یہاں تو لڑکی نے تمہارے ہوش اڑا دیئے"۔ اس نے گویا مایوسی کا اظہار کیا مگر کریم بدستور بولتا رہا۔ ارادے سے بے نیاز اپنی دھن میں۔

"لڑکی سبک ہوا سی لطیف بدلیوں کی طرح نظر آئی تھی مگر برکھا تو بے حد طوفانی تھی۔ دوستو! اس کے رویوں سے کوئی بھی گھائل ہو سکتا تھا۔ اس کی بے تکلفی مجھے برستی برکھا کے سیلابی ریلوں کی طرح دکھائی دینے لگی جو زمین دھرتی پر برسیں تو دھاروں کی صورت راہوں کے بیچ ڈیرہ اپنا لیتے ہیں"۔ کریم اب اپنے نتھنوں پر بکھری گزری مائع چاٹ رہا تھا۔

دوست بھی جذبوں کی اکھاڑ پچھاڑ جام و سبو میں ڈبوتے رہے۔ کریم کے چہرے پر الم اور پریشانی کے سبب کچھ پچھتاوے کے آثار عیاں نظر آنے لگے تھے۔

"شہر فریب تھا"۔ اس نے کہا پھر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور الفاظ حلق میں اٹکنے لگے۔ بولا۔ "لڑکی نے یک دم اپنے تیور بدل لئے ساون کے موسم کی طرح۔ ابر سمت جائیں تو شمس کا عذاب تمازت برسانے لگتا ہے۔

بھی ہوا۔ لڑکی کے گلابی گال یک لخت طاری کردہ طیش میں تمتمانے لگے۔ اس کے منظم نظر طوفان میرے ذہنی پردوں پر ٹکرانے لگے، پھر یہ طوفان اس کم بخت کے شخصی عکس پر بکھرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا قیمتی لباس تار تار کر دیا اور سر کے بال نوچ ڈالے، پھر اپنے لمبے ناخنوں سے نازک جلد پر خراشیں کندہ کر ڈالیں۔ اب اس کی آنکھوں سے عیاری برس رہی تھی، وحشت بھری مکاری"۔ کریم نے بتایا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی بھنچ گیا تھا۔ دوست محو حیرت تھے اور حیرت کدے میں گم۔

"میری روح فنا ہو گئی، مجھے اس آفت کی بڑ با کا دبدبہ سمجھ میں آنے لگا"۔ کریم نے بے چینی کے عالم میں پہلو بدلا پھر بولا۔ "وہ لڑکی گاڑی کی [illegible] برہمان ہو گئی۔ کہنے لگی کہ تم بہت بڑے مجرم ہو بلکہ مجرموں کے سرغنہ۔ تم نے مجھے کسی پروا کے اسپرے سے بے ہوش کیا، پھر زبردستی اپنی گاڑی میں ڈالا۔ تم نے میرے ساتھ زیادتی کی، جب میں نیم بے ہوش تھی۔ شکر ہے کہ میں اب ہوش میں آ چکی ہوں، ورنہ تم مجھے کسی ویران جگہ پر پھینک دیتے اور فرار ہو جاتے۔ مجھے جنگلی درندے کھا جاتے۔ اس لڑکی نے اپنے اوپر بپا کی مظلومیت طاری کر لی"۔ کریم نے منکشف کیا پھر نشے میں ہچکی لی۔ اب وہ کسی طاقتی کا شکار دکھائی دینے لگا۔

"گاڑی فوراً روک لو، ورنہ میں [illegible] سامنے چیخ [illegible] ورنہ بچاؤ بول دوں گی"۔ لڑکی نے دھمکی دی۔ "یاد رکھو! [illegible] شواہد تمہیں عدالت میں مجرم ثابت کر رہا ہے۔ [illegible] سے ہمدردی کرے گا۔ میں اس کے خطرناک ارادے جان کر سنسنی دبنج میں پڑ گیا"۔ کریم نے خوف [illegible] ہوئے کہا۔ پھر جام لبوں کی طرف بڑھایا تو ہاتھوں کی لرزش پر قابو نہ رکھ سکا۔

"تو گویا تم نے گاڑی روک لی؟" اعظم نے حیرت سے [illegible] ہوئے پوچھا

"میں کیا گاڑی روکتا، مجھے مجبوراً روکنا پڑا"۔ کریم نے انکشاف کیا۔ "لڑکی نے اپنے لباس سے مضبوط ڈوری علیحدہ کر لی اور عقب سے میری گردن کے گرد ڈال دی، پھر اس جان لیوا پھندے میں مجھے جکڑ لیا۔ میری سانس رکنے لگی۔ میں نے بمشکل گاڑی پر قابو برقرار رکھا"۔ کریم نے کہا۔ "میں بری طرح گھبرا گیا تھا"۔ اس نے اعتراف کیا۔ "احساس تھا کہ لڑکی کے ساتھی بھی اردگرد ہوں گے"۔ اس نے بتایا۔ "میں تمہیں تھانے کچہری کی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ لڑکی نے کھردرے انداز میں بات کی۔ بہتر ہو گا تم یہیں معاملہ طے کر لو۔ اپنے کردہ جرم کے عوض مجھے رقم ادا کر دو، تب میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو کسی خوشگوار سفر کی طرح بھول جائیں گے۔ لڑکی نے پیشکش کی اور اگر میں نہ مانوں تو؟ میں نے اس سے پوچھا۔ اگلے ہی لمحے ایک پستول میری کنپٹی پر تنا ہوا تھا"۔ کریم نے ماجرا سنایا اور زخمی گردن کو سہلاتے ہوئے [illegible] بوجھل سا دکھائی دیا۔

"تو گویا اس چھوکری نے تمہیں لوٹ لیا؟" سوال کرتے ہوئے نمبر چار بے قابو سا ہوا اور مدہوشی میں اپنا ہاتھ لرزتی میز پر دے مارا پھر اپنی انگلیاں سہلانے لگا۔ [illegible] سے ظاہر ہو رہا تھا کہ [illegible] دشمنوں کی حرکات پر حاوی ہو رہا تھا۔

"ہاں، اس آفت نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا"۔ کریم نے کف افسوس ملتے ہوئے بتایا۔ "پہلے اس نے میرا پرس نکلوایا، پھر گھڑی اتروائی اور بعد ازاں میرا سیل فون بھی ہتھیا لیا"۔ اس نے افسردگی میں الفاظ چبائے۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ سیل فون میرے تجارتی معاملات میں کس قدر اہم تھا"۔ کریم بے بسی میں اپنے خالی ہاتھ دیکھنے لگا۔ "یہی نہیں، اس کم بخت کی نگاہیں میری طلائی انگوٹھی پر بھی پڑ گئیں۔ اس نے وہ بھی اتروالی۔ کہنے لگی کہ میں اسے بڑی چاہت سے اپنے پاس رکھوں گی، امانت

انحصار ہاتھا۔ وہی بی، پورٹ کذب کا مجموعہ ہوتی جبکہ میری رپورٹ بھی مستند شدہ حقائق پر مبنی تھی"۔ کریم نے سچ بیانی کی۔

"پولیس کو کوئی تو سراغ ملا ہوگا؟" سمیر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ وہ بدستور پی رہا تھا اب کسی قدر زیادہ شاید گھونٹ۔

"ہاں"۔ کریم نے کہا۔ "پولیس کو میری گاڑی کی عقبی نشست سے مخصوص انگلش فرنٹ میں ہلکے بھورے بالوں کا گچھا سا ملا تھا، جو انہیں میرے بیان کے بارے میں شکوک میں مبتلا کر رہا تھا۔ شراب کی دو بوتلیں بھی میری گاڑی سے برآمد ہوئی تھیں۔ پولیس کو وہاں سے ایک سگریٹ بھی ملا تھا جس میں غالباً چرس بھری ہوئی تھی۔ ماہرین اس سگریٹ پر ثبت انگلیوں کے نشانوں کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ سگریٹ اسی لڑکی کا تھا جو تھوڑا سا استعمال کر کے چھوڑ رہا گیا تھا"۔ اس نے بتایا اور وہاں سے کے لئے دوستوں کی طرف دیکھا۔

"نقصان آپ کے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوا ہے۔ یار لوگوں کی مدد مل جائے تو بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ سوچتا ہوں والد صاحب کو یہ سب کچھ کیسے بتاؤں گا؟ وہ تمام احوال جان کر جیتے جی مر جائیں گے"۔ کریم نے نشہ زیادہ ہونے معاملہ سمجھایا۔

اعظم لڑکی کی شان میں بھاری بھاری گالیاں بک رہا تھا۔ اب وہ حواس میں بے قابو اور گفتگو میں آپے سے باہر ہو چکا تھا۔

کریم نے سر کرسی کے اونچے عقبی حصے پر ٹکا دیا اور الم کی کیفیت میں آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر میں اس کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اس نے سمیر کو مخاطب کیا تو اسے خود اپنی آواز اجنبی سنائی دی اور باتیں بے ربط محسوس ہوئیں۔ واقعات اس کے ذہن میں منتشر ہو چکے تھے... بچا کچھ حصے بھول چکا تھا۔ اس کے خیالوں میں تسلسل کے

بجائے ٹوٹنے لگے تھے۔ نتیجتاً شعور میں ابہام جنم لے رہا تھا۔ وہ سمیر سے مزید شراب مانگ رہا تھا جس نے اسے بتایا کہ تمام بوتلیں خالی ہو چکی تھیں۔ اس پر کریم کو بے حد غصہ آیا۔ اس نے ساغر اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔

"تم حواس کی مدہوشی میں ڈوب چکے ہو"۔ سمیر نے اسے سمجھایا۔

اچانک کریم بری طرح رونے لگا۔ وہ اپنے نقصان پر بھونڈے انداز میں بین کر رہا تھا۔ اعظم نے یہ دیکھا تو اسے کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کی الٹی سیدھی حرکات پر سمیر بری طرح ہنسنے لگا۔ نشے کے ساتھ یہ منظر طوالت اختیار کر گیا۔ کریم رو رہا تھا اور مسلسل اول فول بک رہا تھا۔ سمیر اس کے ہر جملے پر بدستور ہنس رہا تھا۔ جبکہ اعظم اناپ شناپ ڈانس کر رہا تھا۔ چند نوش ان کے گرد جمع ہو گئے اور کھڑے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ باہر برکھا موسلا دھار برس رہی تھی جبکہ اندر ہر طرف ساغر چھلک رہے تھے۔

دور کسی اور جگہ کریم کا والد مصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹے کے پاس اس روز بھاری رقم موجود تھی اور وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ماں کی حالت زیادہ خراب تھی۔ مال و اسباب سے بے نیاز وہ بیٹے کی عافیت کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی اور منتیں مان رہی تھی۔ دونوں کبھی کٹھن موسم کو کوسنے لگتے، بار بار ان کی نگاہیں نیم وا دروازوں کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ اپنا لخت جگر نہ پا کر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتے۔

"بارش کی اس بوچھاڑ میں کہاں جا رہے ہو؟" کریم کی والدہ نے اپنے بوڑھے خاوند سے دریافت کیا۔

"اکلوتا بیٹا ہے، جوان مگر نا سمجھ۔ ظاہر ہے مجھے ہی اب اس کی تلاش میں نکلنا پڑے گا"۔ خاوند نے کہا۔ تھوڑی دیر تاریکی میں گھورتا رہا، پھر تند و تیز موسم میں باہر نکل گیا۔

☆☆

اس بدقسمت قوم کو آج تک نہیں معلوم کہ پاکستان کو دولخت کرنے کا اصل ذمہ دار کون تھا؟ قوم کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں کہ ملکی سالمیت پر جانیں قربان کرنے والے "توپوں کا چارہ" کہلائے اور سالمیت توڑنے والے شہید بن گئے۔

تلخ حقائق سے پردہ اٹھتا ہے

☆ balochsk@yahoo.com سکندر خان بلوچ

ماہِ دسمبر 2014ء کے حکایت میں مندرجہ بالا عنوان پر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا مضمون نظر سے گزرا۔ حقائق سے پردہ اٹھانا لازمی معلوم ہوتا ہے تفصیل حسب ذیل ہے۔

کہتے ہیں مستقبل کی جڑیں ہمیشہ ماضی میں ہوتی ہیں اور جو قوم اپنے ماضی سے نہیں سیکھتی وہ مستقبل کی تعمیر بھی نہیں کر سکتی۔ آج ہمیں ایک دفعہ پھر 1971 والے حالات کا سامنا ہے۔ آئیں نظر ڈالتے ہیں کہ ہم نے اس سانحے سے کیا سیکھا؟

سانحہ مشرقی پاکستان ہماری تاریخ کا بھیانک ترین واقعہ تھا اور جب تک ہماری تاریخ زندہ رہے گی یہ واقعہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہر واقعے کے پیچھے کچھ کردار ہوتے ہیں جو اس واقعے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس واقعے کے بھی کچھ کردار تھے جو ہماری تاریخ کا سیاہ باب رقم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جسے نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ فراموش۔ اس وقت کی حکومت کا یہ فرض تھا کہ اس واقعے کی غیر جانبدارانہ انکوائری ہوتی۔ واقعہ کی تہہ تک پہنچا جاتا اور اس واقعہ کے پس پردہ گھناؤنا کھیل کھیلنے والے کرداروں کو عبرتناک سزا دی جاتی تاکہ آئندہ کسی کو ملک و قوم کی قسمت سے کھیلنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک برائے نام سی انکوائری ضرور ہوئی لیکن اس کا مقصد اہم کرداروں کو تحفظ دینا تھا نہ کہ اصل سازشیوں کو بے نقاب کرنا۔

اس سانحے کے نتیجے میں ہماری تاریخ کے متنازعہ رہنما جناب ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے۔ ڈھاکہ کٹ چکا تھا۔ فوج ذلت آمیز طریقے سے اپنے ازلی دشمن بھارت سے شکست کھا کر ہتھیار ڈال چکی تھی یا سازش سے

تحریر رو نواد یے گئے تھے۔ قوم سخت مایوسی کا شکار تھی۔ بھٹو طلسماتی شخصیت کے انسان تھے۔ ان سے بجا طور پر یہ امید تھی کہ وہ قوم کو اس مایوسی کی دلدل سے نکال لیں گے جو انہوں نے کیا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ بھٹو بذات خود اس سانحے کے اہم کردار تھے۔ اگر اس وقت کے قومی اور بین الاقوامی تجزیوں پر نظر ڈالی جائے تو بھٹو کا یہ کردار زیادہ مثبت نظر نہیں آتا۔ یہاں یہ یاد رہنا چاہیے کہ تمام بنگالیوں اور بہت سے مغربی پاکستانیوں کی نظر میں یہ بھٹو ہی تھے جنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہ ملنے دیا کیونکہ ایسی حالت میں انہیں اپوزیشن میں بیٹھنا پڑتا تھا اور یہ کردار انہیں قطعاً منظور نہ تھا۔ یہ بھٹو صاحب ہی تھے جنہوں نے اس وقت نعرہ لگایا تھا "اُدھر تم اِدھر ہم۔ ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی" وغیرہ۔ یہ بھٹو صاحب ہی تھے جن کے بیانات کی وجہ سے اسمبلی اجلاس ملتوی ہوا۔

بنگالیوں کی نظر میں یہ سراسر غیر جمہوری رویہ تھا جو بالآخر علیحدگی کا موجب بنا۔ بنگالیوں کا یہ بھی اعتراض تھا کہ حکومت پاکستان غیر جمہوری انداز میں بھٹو صاحب کی امداد کرنے پر تلی تھی اور بھٹو صاحب انہیں حق سے محروم کرنے پر تلے تھے۔ جس روز یہ اجلاس ملتوی ہوا مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام اخباروں نے اسی موضوع پر اپنے اداریے لکھے جن کا لب لباب یہی تھا کہ "بھٹو کبھی بھی اقتدار مشرقی پاکستان نہیں آنے دے گا" اس احساسِ محرومیت کو مزید شدت "را" کے ایجنٹوں نے دی۔

سقوط ڈھاکہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ قوم سازشیوں کے سر ہو گئی تھی۔ مغربی پاکستان میں فوجی افسران نے یحییٰ خان اور اس کے ٹولے کو نہ صرف دیکھنے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں کھلم کھلا غدار قرار دیا۔ کچھ سینئر افسران نے حکومتی احکامات ماننے سے بھی انکار کیا۔ فوج کے اندر بغاوت کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس وقت کے فوجی افسران ہی تھے جن کے رویے نے یحییٰ خان ٹولے کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا اور جناب بھٹو صاحب اقتدار میں آئے۔ فوج کے ساتھ ساتھ عوام بھی بہت زیادہ مشتعل تھے اور اس سانحے کے اصل حقائق جاننے کے لئے بیقرار تھے۔ پوری قوم اور خصوصاً فوج کے نوجوان آفیسرز حالات کی غیر جانبدارانہ انکوائری چاہتے تھے۔ جب انکوائری کے لئے عوام کا دباؤ بڑھا تو جناب بھٹو صاحب نے 26 دسمبر 1971ء کو ایک کمیشن قائم کیا جس کی صدارت پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن کو سونپی گئی۔ ان کے ساتھ ممبران کے طور پر چاروں صوبوں کے چیف جسٹس صاحبان نامزد کئے گئے۔ فوجی معاملات کے لئے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر مقرر ہوئے اور ان کی مدد کیلئے تینوں افواج کے نمائندے تھے۔ ایئر فورس کی طرف سے ائیر کموڈور ظفر محمود، فوج کی طرف سے کرنل سابر حسین قریشی اور نیوی کی طرف سے کیپٹن ولی اللہ مقرر ہوئے۔

کمیشن کو یہ ٹاسک دیا گیا کہ وہ ان حالات کا جائزہ لے جن کے تحت "مشرقی پاکستان میں فوج نے ہتھیار ڈالے اور مغربی پاکستان کی سرحد پر بھارتی وزیراعظم نے یکطرفہ جنگ بندی کا عمل اختیار کیا"۔ لیکن اس بات کا کہیں ذکر نہ کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کی بالآخر علیحدگی کے اسباب کیا تھے اور اس سانحہ میں سیاسی لوگوں کا کیا کردار تھا؟ وہی اصل مسئلہ تھا جسے خوبصورتی یا چالاکی سے نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ادھر کسی کی توجہ ہی نہ جانے دی گئی۔ سیاستدانوں کا گھناؤنا کھیل ہی تو فوجی کارروائی اور بعد میں جنگ کا موجب بنا۔ فوج سے ہتھیار ڈلوانے کی کارروائی کے پس پردہ بھی سیاسی عزائم تھے جنہیں شاطرانہ انداز میں چھپا لیا گیا۔ کمیشن نے اپنے کام کا آغاز یکم جنوری 1972ء کو کیا۔ حکومت کی طرف سے پاکستان کے اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار اور ان کی مدد سے

لئے رفیق رت صاحب مقرر ہوئے۔ کمیشن نے کل تقریباً 300 گواہان کے بیانات قلم بند کیے جن میں تینوں افواج سے ناظر سروس اور ریٹائرڈ حضرات شامل تھے۔ ان لوگوں کے بیانات بھی لئے گئے جو مشرقی پاکستان سے کسی نہ کسی طرح واپس آگئے تھے۔

اس انکوائری کے سب سے بڑے کردار یحییٰ خان اور ان کے ماتحت کمروں میں نظر بند کر دیئے گئے اور مشرقی پاکستان کے تمام کردار بمعہ جنرل نیازی بھارت کی قید میں تھے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان میں موجود لوگوں کے بیانات لے کر انکوائری مکمل کی جائے اور جنگی قیدیوں کے آنے پر اس انکوائری کا دوسرا حصہ مکمل کیا جائے۔ جب انکوائری مکمل ہوئی تو اس کے پانچ حصے تھے۔ پہلے حصے میں تو وہ حالات تھے جن کی وجہ سے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ دوسرے حصے میں 1947ء سے لے کر 1971ء تک پاکستان کا سرسری سا سیاسی پس منظر تھا لیکن سیاسی کرداروں کی گھناؤنی سازشوں کو بحث میں شامل نہ کیا گیا۔ تیسرے حصے میں پاکستان کے حوالے سے بین الاقوامی سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی۔ چوتھے حصے میں فوجی حالات زیر بحث لائے گئے۔ آخری اور پانچویں حصے میں انکوائری کے نتائج اور سفارشات دی گئیں۔ جنگی قیدیوں کی واپسی کے بعد مارچ 1974ء میں دوبارہ انکوائری شروع ہوئی۔ بھارت سے واپس آنے والے سول اور فوجی افسران کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ اس میں لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی اور میجر جنرل راؤ فرمان علی خان سے بہت تفصیل میں انٹرویو کیا گیا۔ جنرل نیازی پر 15 الزامات عائد کئے گئے اور باقی سینئر افسران پر ان کی کارکردگی کے مطابق الزامات کی تعداد کم تھی۔

اس وقت کی عام رائے کے مطابق اس انکوائری کی بنیاد نیک نیتی یا قومی مفاد پر نہ تھی بلکہ اس کے مقاصد ذاتی مفاد کا حصول تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے ڈرامہ کی پردہ پوشی کہا۔ عوام چونکہ اس وقت بہت زیادہ مشتعل تھے اور غداروں کا سر مانگتے تھے۔ لہٰذا اس انکوائری کا پہلا مقصد عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد اس سانحے کا تمام تر الزام فوج پر لگا کر اسے عوام کے سامنے بے وقعت کرنا تھا تاکہ وہ بھٹو صاحب کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ اس لئے تمام الزام فوجی جرنیلوں کے سر تھوپ دیا گیا اور انہیں غدار کا لقب دے کر عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا گیا تاکہ یہ لوگ بھٹو صاحب کے کردار سے متعلق کچھ نہ کہہ سکیں۔ بہت سوچ سمجھ کر جنرل یحییٰ خان کو تمام سیاسی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور جنرل نیازی کو فوجی ناکامیوں کا۔ یاد رہے کہ ان دونوں کو انصاف کے تقاضے پورے کئے بغیر قربانی کے بکرے بنایا گیا۔ ایک سینئر فوجی آفیسر نے بہت مایوسی سے کہا تھا۔ بھٹو صاحب جو کچھ 1965ء میں حاصل نہ کر سکے وہ انہوں نے 1971ء میں حاصل کر لیا۔ انکوائری محض ایک چشم پوشی تھی کیونکہ اس میں کئی ایک سقم تھے۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی پہلی خامی یہ تھی کہ کمیشن کی صدارت اس وقت کے چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن کو سونپی گئی جو ایک بنگالی تھے۔ گو وہ ایک شریف آدمی تھا لیکن اس کے عزیز رشتہ دار سب مشرقی پاکستان میں تھے۔ وہاں جو کچھ ہوا وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تمام بنگالیوں کی نظر میں پاکستانی فوج ظالم، بے رحم اور تمام قتل و غارت اور خواتین کی بے حرمتی کی ذمہ دار تھی۔ اس غصے کا خاص نشانہ جنرل نیازی اور جنرل ٹکا تھے۔ اس لئے حمود الرحمٰن صاحب کی ذاتی شرافت اور ایمانداری ایک طرف، ان کا فوج کے لئے غیر جانبدار رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر ممبر جج صاحبان کا یہ پینل وہاں کے سیاسی اور فوجی حالات سے بھی باخبر نہیں تھا اور نہ ہی ان میں وہاں کے سیاسی اور عسکری حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت تھی۔

اس کی دوسری خامی یہ تھی کہ خونی معاملات کیلئے ... لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر اور ان کے ساتھ تینوں سروسز کے نمائندے کرنل اور بریگیڈیئر رینک کے لوگ تھے۔ جنرل الطاف قادر ایک اوسط درجے کا افسر گنا جاتا تھا۔ وہ کوئی اتنا بڑا عسکری تجزیہ نگار نہیں تھا۔ کچھ حوالوں کے مطابق وہ خود اور اس کے ساتھ کام کرنے والے فوجی ممبران میں سے کسی نے مشرقی پاکستان میں سروس نہیں کی تھی۔ کمیشن کا انکوائری کے لئے تجزیئے اور رائے کا تمام دارومدار ان لوگوں کی ذاتی سوچ پر منحصر تھا اور بہت سے لوگوں کے خیال میں ان کی رائے زیادہ قابل اعتماد تھی۔ اس پر مزید بدقسمتی یہ کہ جنرل الطاف قادر کا یحییٰ خان سے ذاتی عناد تھا جس سے محترم بھٹو صاحب بخوبی واقف تھے۔ اس لئے اس شخص نے یحییٰ خان اور باقی فوج کو دل کھول کر رگیدا۔ ان لوگوں کا نام بہت سوچ سمجھ کر کمیشن ٹیم میں ڈالا گیا تھا جس کا تمام تر فائدہ جناب بھٹو صاحب کو ہوا۔

اس انکوائری کی تیسری بڑی خامی اس کا دائرہ اختیار تھا جو کہ مشرقی پاکستان میں فوج کے ہتھیار ڈالنے تک محدود تھا۔ یہ ہدف بھی بہت سوچ سمجھ کر دیا گیا۔ اس ہدف کے پیش نظر سیاسی پارٹیوں اور سیاستدانوں کا کردار زیر بحث نہیں لایا جا سکتا تھا جبکہ اصل مسئلہ ہی وہی تھا۔ اس طرح بھٹو مرحوم نے اپنی ذات سمیت اپنے تمام سیاسی ساتھیوں کو تمام الزامات سے بری کرا لیا۔ اس لئے کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی لیڈر پر کوئی الزام نہ لگا۔

انکوائری کی کارروائی بھی غیر جانبدار نہ تھی کیونکہ کمیشن میں خلاف قانون بھٹو صاحب نے اپنا ایک نمائندہ بٹھا رکھا تھا جو تمام کارروائی کی شام کو بھٹو صاحب کو رپورٹ پیش کرتا۔ اس نمائندے کا کام تھا کہ تمام گواہان کو دباؤ میں رکھے تاکہ کوئی گواہ بھٹو صاحب کے خلاف بات نہ کرے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی بھی تو فوراً کٹوا دی جاتی۔ یہی کام بھٹو صاحب کے وکیل جناب یحییٰ بختیار نے کیا۔ مثلاً یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں کو گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ جناب بھٹو نے ان تمام حضرات پر بہت زیادہ دباؤ رکھا۔ انہیں بتایا گیا کہ اگر انہوں نے بھٹو صاحب کے خلاف کوئی بیان دیا تو وہ انہیں عوام کے حوالے کر دیں گے جو ان کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ یحییٰ خان اور باقی حضرات نے بہت ڈر ڈر کر بیان ریکارڈ کروائے، پھر بھی جہاں کہیں بھٹو صاحب کے خلاف ذرہ برابر بھی بات ہوئی یحییٰ بختیار نے کٹوا دی۔ یحییٰ خان کو اپنے دفاع کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ اس نے بارہا کھلے مقدمے کا مطالبہ کیا لیکن اسے نہ کیا گیا۔ یہی کچھ جنرل نیازی کے ساتھ بھی ہوا۔ اسے جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس نے بھی اپنے لئے کورٹ مارشل کی استدعا کی لیکن قبول نہ ہوئی۔ ان لوگوں کو گواہوں پر جرح کی اجازت بھی نہ تھی۔ جناب بھٹو نے ان بزرگ جرنیلوں کو قربانی کا بکرا بنا کر تمام الزامات سے سرخرو ہو کر تمام ملبہ ان پر ڈالا اور عوام کا رخ ان کی طرف موڑ دیا۔ یہ قانونی انکوائری اس انداز میں کی گئی کہ مجرم فوج ہی خصوصاً دو جرنیل۔ فوج کی دل بھر کر توہین کی گئی اور بھٹو صاحب پاکستان کے نجات دہندہ اور ہیرو بن کر ابھرے۔ معلوم نہیں کیوں بھٹو صاحب فوج کی توہین کر کے خوش ہوتے تھے۔ ملک کے صدر ہونے کے باوجود چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن کر دنیا میں فوجی جمہوریت کی واحد مثال قائم کی۔ پھر ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے والی فلم خصوصی طور پر منگوائی اور ٹی وی پر چلوائی۔

یہ عجیب انصاف تھا کہ سیاستدانوں کو تو شروع سے اس انکوائری میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سے مجرم جرنیلوں کو بھی نہ صرف بخشا گیا بلکہ نوازا گیا۔ مشرقی پاکستان میں سروس کرنے والے کچھ افسران پر مختلف نوعیت کے جرائم کا الزام لگا تھا۔ حق تو یہ تھا کہ ان جرائم کی انکوائری ہوتی اور جرم کے مطابق انہیں سزا دی

جانی با باعزت بری کیا جاتا لیکن نہ جانے کیوں سزا کی بجائے وہ سب نوازے گئے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کردار ادا کرنے والے حضرات حکومت کی پسندیدہ شخصیات ٹھہرے۔ مثلاً جنرل رحیم خان پر مشرقی پاکستان کے میدان جنگ سے بھاگ آنے کا الزام تھا۔ آتے وقت انہیں سی ایم ایچ کی نرسز اور لیڈی ڈاکٹرز کو ہیلی کاپٹر میں ساتھ لانا تھا لیکن الزام کے مطابق انہوں نے ان خواتین کے آنے کا انتظار نہ کیا اور ہیلی کاپٹر لے کر برما چلا گیا۔ اسے یہاں چیف آف جنرل سٹاف بنا دیا گیا اور بعد میں ڈیفنس سیکرٹری۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان مشرقی پاکستان میں ناکام ہوا۔ اسے وہاں سے ہٹا کر یحییٰ حکومت نے میجر جنرل بنا دیا تھا۔ اس کے خلاف کورٹ مارشل کا سوچا جا رہا تھا لیکن بھٹو صاحب نے اسے دوبارہ لیفٹیننٹ جنرل بنا کر اعلیٰ عہدوں سے نوازا۔ بریگیڈیئر ارباب جہانزیب پر بینک لوٹنے کا الزام تھا وہ یہاں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا اور بعد میں سفیر۔ جنرل راؤ فرمان علی مشرقی پاکستان میں مارشل لاء اور سیاسی سیل کا انچارج تھا۔ بنگالیوں کی نظر میں سیاسی ناکامی اور بنگالی دانشوروں کے قتل کا وہ ذمہ دار تھا بلکہ ایک الزام یہ بھی تھا کہ جنگ کے آخری دنوں میں وہ بھارتی فوج سے رابطے میں تھا اور "سرنڈر" والے معاہدے کا اہم کردار تھا۔ وہ بھی یہاں پہنچ کر نوازا گیا۔ اسے فوجی فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ جنرل گل حسن جو یحییٰ ٹولے کا اہم ممبر تھا کو آرمی چیف بنا دیا گیا۔ جنرل ٹکا خان جسے بنگالی اور بین الاقوامی میڈیا نے "قصائی" کا لقب دیا تھا کو پہلے آرمی چیف اور بعد میں ڈیفنس منسٹر بنایا تو یہ تھی انگوائری اور یہ تھا انصاف۔ کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی صرف یحییٰ خان اور جنرل نیازی قربانی کے بکرے بنے۔ شاید وہ اتنے مجرم نہ تھے جتنے کچھ اور لوگ تھے جو نوازے گئے۔ ایک

...ٹ گیا لیکن بعد میں یہ باتیں محض پروپیگنڈا ثابت ہوئے۔

بھٹو صاحب کی تمام تر احتیاط کے باوجود کمیشن نے ایک باب جناب بھٹو پر بھی شامل کیا جس میں اس دور کے اخبارات کے مطابق ان کے اصل جرائم کی مکمل طور پر پردہ پوشی کی گئی۔ اس کے باوجود بھٹو صاحب اس انکوائری سے اتنے خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنے دل میں چھپا لیا۔ اس کی بھی افواہ تھی کہ سوائے ایک کاپی کے باقی تمام کاپیاں تباہ کرا دی گئیں۔ یہ انکوائری نہ شائع ہوئی اور نہ ہی عوام کے سامنے آئی۔ بہرحال بھارتی میڈیا نے یہ انکوائری شائع کی اور پاکستانیوں کو بھی اس انکوائری کی تفصیل بھارتی میڈیا سے ملی۔ 1977 میں جب مارشل لاء لگا تو اس انکوائری کی ایک کاپی بھٹو صاحب کے ذاتی بیڈروم سے ملی۔ اس میں 24 صفحات کمیشن کا تعلق بھٹو صاحب کے متعلق تھا جو ضائع ہو چکے تھے اور معاملات ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئے۔

مشہور بھارتی صحافی شرمیلا بوس آکسفورڈ یونیورسٹی میں سینئر ریسرچ سکالر ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر بہت زیادہ تحقیق کی ہے۔ ان کی یہ تحقیق کتابی صورت میں Dead Reckoning: Memories of the 1971 Bangladesh War. کے نام سے 2011 میں منظر عام پر آئی ہے۔ شرمیلا بوس کے مطابق "یہ انکوائری کمیشن اختیارات اور Terms of Reference کے لحاظ سے نامکمل اور بہت محدود تھا نہ ہی اس کی کوئی بین الاقوامی کریڈیبلٹی تھی۔ حتیٰ کہ اس میں کا کھلا پبلک ٹرائل اور کورٹ مارشل جیسی سفارشات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کمیشن کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنایا گیا۔ یہ بالکل غلط تھا کہ بغیر سوچے سمجھے تمام الزامات مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج اور خصوصاً جنرل نیازی پر لگا دیئے گئے۔ فوج کو جان بوجھ کر بدنام کیا گیا حالانکہ یہ فوج سخت مخالف حالات کے باوجود بہت

قوتی پاکستان کے دفاع میں بہت جرأت اور بہادری سے لڑی۔ شاندار جنگی تاریخ رقم کی۔ ایسے لوگوں کی عزت نہ کر کے پاکستانی قوم اپنی بے عزتی کی مرتکب ہوئی۔ یہ نظر آتا ہے کہ مشرقی پاکستانی فوج کے کمانڈر جنرل نیازی اور اس کے ADC کو ہی تمام تر ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ انہیں زبردستی ڈسمس کیا گیا اور اس کی پنشن بند کر کے ان کے ساتھ بہت ناانصافی کی گئی۔ اس نے کورٹ مارشل کا مطالبہ کیا تاکہ وہ اپنے خلاف کارروائی کا دفاع کر سکے لیکن اس کے جائز مطالبے کو ظالمانہ طریقے سے رد کر کے اسے بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا جو کہ سراسر دھاندلی اور یکطرفہ ظالمانہ کارروائی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جنرل نیازی دوسری جنگ عظیم کا ایک بہت ہی Decorated سولجر تھا۔ اس کا ذاتی کردار اپنی جگہ لیکن بطور سولجر۔ بطور کمانڈر اور بطور محب وطن پاکستانی اس نے مشرقی پاکستان پہنچنے کے چند ہفتوں کے اندر ہی مکتی باہنی کو ملکی سرحدوں سے باہر دھکیل دیا اور پورے مشرقی پاکستان میں حکومتی رٹ بحال کر دی جبکہ کئی مشہور جرنیل ناکام ہو چکے تھے۔ اس سے اگلا کام حکومت کی طرف سے سیاسی کارروائی تھی جو حکومت نے جان بوجھ کر یا کچھ خاص وجوہات کی وجہ سے شروع ہی نہ کی۔ سیاسی مسئلے کا حل جنگ قطعاً نہ تھی۔ یہ سیاستدانوں کی نااہلی تھی کہ مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کی بجائے ملک پر جنگ ٹھونس دی گئی جس کی جنرل نیازی یا مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج قطعاً ذمہ دار نہ تھی"۔

اس بدقسمت قوم کو آج تک نہیں معلوم کہ پاکستان کو دولخت کرنے کا اصل ذمہ دار کون تھا؟ قوم کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں کہ ملکی سالمیت پر جانیں قربان کرنے والے "توپوں کا چارہ" کہلائے اور سالمیت توڑنے والے شہید بن گئے۔

o

سرنگ، سانپ اور سپیرن

یہ سارا اس سپیرن لڑکی کے حُسن کا فتور تھا۔ میں نے زندگی بھر کبھی اس طرح کا پُراسرار حُسن نہیں دیکھا۔ نہ وہ اتنی حسین ہوتی نہ منیر اڈا کو اس پر عاشق ہوتا اور نہ یہ المناک واقعہ جنم لیتا۔

محمد نذیر ملک

گندھالہ (تحصیل چوآ سیدن شاہ) کے پہاڑی جنگل کے اوپر بادل اس زور سے گرجا کہ خاموشی بھی سہم گئی، پہاڑ لرز اٹھا، کالی گھٹائیں گھر آئیں، سر شام اندھیرا چھا گیا اور کچھ ہی دیر میں موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نیلگوں پہاڑیوں پر مشتمل گندھالہ کا جنگل جو کہ سنتھا اور پھلاہی کے درختوں کا مجموعہ تھا، تیز دھار بارش سے نہا گیا۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔

گو کہ ہم دونوں دوستوں رفیق اور رشید نے گھروں میں جلانے والی خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے اپنی اپنی گدھیوں پر لادنے کا کام مکمل کر لیا تھا اور گھر واپسی کی ابھی بمشکل راہ ہی پکڑی تھی کہ موسم سرما کی بارش ہم سے لپٹ گئی۔ ایسے میں سفر جاری رکھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

ہمیں قریب کے پہاڑ میں ایک کھوہ دکھائی پڑ گئی۔ ہم گدھیوں کی رسیاں پکڑے اس کھوہ کی جانب ہو لیے تاکہ بارش سے بچا جا سکے۔ کھوہ کے دہانے پر جا کر اندر جھانکا تو وہ اندر سے کافی کھلی معلوم ہوئی۔ البتہ اس کے اندر بہت اندھیرا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے دونوں والے رومال میں ماچس موجود تھی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن پھر بھی ایک ماچس ہم ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ ماچس اور کچھ دوسری چیزیں بھی رومال رفیق نے پہلے ہی اپنے پاس سنبھال لی تھیں۔ اس نے کھوہ کے دہانے پر کھڑے ہو کر دیاسلائی سلگائی تاکہ کھوہ کے اندرونی ماحول کی جانکاری حاصل کی جا سکے۔

ادھر جونہی دیاسلائی میں سے آگ کا شعلہ لپکا کھوہ کے اندر سے "سوں سوں" کی آواز نے ہمارے قدم روک لیے۔ ہم کسی بھی آنے والے ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔ یہ ہماری نوجوانی کا دور تھا۔ نوجوانی میں ویسے بھی طبیعت بڑی مہم جوئی کی جانب راغب رہتی ہے اور انسان چھوٹے چھوٹے خطروں کو خاطر میں نہیں لاتا اور بعض اوقات بے وقوفی کی حد تک احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی اکثر سوچیں دماغ کی بجائے دل کے تابع ہوتی ہیں۔ یہ نہایت جذباتی دور ہوتا ہے۔

جلتی دیاسلائی کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کھوہ کے عین وسط میں ایک بہت بڑا سانپ پھن پھیلائے پھنکار رہا تھا۔ سانپ کی دہشت ہی اس قدر ہوتی ہے کہ لامحالہ ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ رفیق کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیاسلائی مکمل جلنے پر اسے پھینکنا پڑی۔ پھنکار کی آواز برابر آئے چلی جا رہی تھی۔ ہمیں یوں لگا کہ کھوہ میں سانپ کے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے۔ رفیق نے فوراً دوسری دیاسلائی جلائی۔ ہم نے دیکھا کہ اب کی بار کھوہ کا اندرونی منظر بدلا ہوا ہے۔ کھوہ کے اندر سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک آدمی اور نوجوان لڑکی بیٹھے ہیں اور وہی سانپ ان کے قدموں میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس کی سوں سوں کی آواز بھی اب بند ہو چکی ہے۔ کھوہ میں اب مکمل سکوت تھا۔ دوسری دیاسلائی بھی بجھ گئی اور اندر پھر پہلے والا گھپ اندھیرا چھا گیا۔

"اوئے! جنگل کے اس برساتی موسم میں ماچس کی تیلیاں مت ضائع کرو"۔ اسی اثنا میں اندر سے مردانہ آواز گونجی۔ "ماچس مجھے دے دو تاکہ آگ جلانے کا بندوبست کیا جا سکے"۔

چونکہ اس کے اور ہمارے درمیان سانپ حائل تھا اور اندھیرے میں ہم نے قدم آگے بڑھائے بغیر اندازے سے اس طرف ماچس اچھال دی جس طرف ہم انہیں بیٹھے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ ماچس عین اس کے اوپر جا گری جو اس نے اٹھا لی اور تھوڑی ہی دیر میں اس شخص نے تنکوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کو آگ لگا دی جس کے الاؤ کی روشنی میں کھوہ کا اندرونی منظر زیادہ واضح

کہا۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے پاس پڑی ہوئی ادھ جلی لکڑیوں کی گٹھڑی سے چند چھوٹے سائز کی لکڑیاں نکالیں اور خشک گھاس کی مدد سے انہیں آگ لگا دی۔

"اندر آ جاؤ"۔ اس نے ہمیں کہا۔ "سانپ سے نہ ڈریں اور یہاں قریب آ کر بیٹھ جائیں۔ یہ سانپ تمہیں کچھ نہیں کہے گا"۔

ہم دونوں نے اپنے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا یہ سانپ آپ کا پالتو ہے اور آپ کون ہیں؟

"یہ میرا نہیں میری بیوی کا ہے"۔ اس نے کہا۔

ادھر ہم نے دیکھا کہ لڑکی بڑے پیار سے سانپ کے سر پر اپنی دو انگلیاں پھیر رہی تھی اور سانپ نے اپنا سر زمین پر ٹکایا ہوا تھا۔ ہم نے بہت سے پالتو پرندے اور جانور دیکھ رکھے تھے لیکن اس طرح کا پالتو سانپ نہیں دیکھا تھا۔ البتہ سپیروں اور مداریوں کے پاس تو سانپ دکھائے جاتے تھے بے شک ان کا زہر نکال لیا جاتا تھا لیکن وہ یوں سدھائے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ سپیرے اور مداری اپنا کرتب دکھا کر ان سانپوں کو پھر ان کی ٹوکری میں ڈال دیتے اور ٹوکری کا منہ مضبوطی سے باندھ دیتے۔ مگر یہ عجیب سانپ تھا جس کی کوئی ٹوکری نہ تھی، نہ ہمیں نظر آ رہی تھی۔ لڑکی سانپ کو کبھی اپنے گلے اور کبھی گود میں ڈال لیتی۔ ادھر سانپ بھی اس کی باہوں میں لپٹا نظر آتا۔ ہمارے لیے یہ منظر بڑا عجیب اور حیران کن تھا۔ یہ سانپ ٹوکری کے بغیر ان کے پاس یوں بیٹھا تھا جیسے ان کی رکھوالی کر رہا ہو اور بالخصوص لڑکی کا رویہ اس کے ساتھ ایسا لگتا تھا جیسے یہ اس کا کوئی بہت ہی اپنا ہو۔

اس پر اسرار ماحول میں وہ لڑکی بھی کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کا حسن انتہائی فریب اور سحر انگیز تھا کہ دیکھنے والی نگاہ کو جکڑ لے۔ میں نے زندگی میں بڑی بڑی حسین عورتیں دیکھی ہیں لیکن اس سانپ والی دوشیزہ میں کوئی اوکھی بات تھی جس کا بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔

لکڑیاں جل اٹھی تھیں اور ان کی آگ کھوہ کی ٹھنڈی فضا کو حرارت پہنچا رہی تھی۔ ہم دونوں بھی مزید آگے بڑھ کر بغیر سانپ سے ڈرے چولہے کے قریب ہو کر آگ تاپنے لگے۔ یہ چولہا وہاں پہلے کا بنا دکھائی دیتا تھا۔ باہر بارش برابر جاری تھی۔ جواں سال آدمی نے ہمیں کہا کہ تمہاری گدھیوں پر لکڑیوں کا بوجھ لدا ہوا ہے اور گدھیاں بھی بارش میں بھیگ رہی ہیں تم ایسا کرو کہ ان کا بوجھ اتار کر انہیں اس کھوہ کے دہانے میں ذرا اندر کر کے کھڑا کر دو تاکہ وہ بھی بارش سے محفوظ ہو جائیں۔ یہ بارش تو رات بھر تھمنے والی نہیں ہے۔

سچ ہمیں گدھیاں یاد آ گئیں جنہیں ہم برستی بارش میں ان کے بوجھ سمیت باہر چھوڑ آئے تھے۔ ہم اٹھے اور کھوہ سے باہر نکل کر گدھیوں کے پاس آئے اور ان کے بوجھ گرا دیے اور انہیں پکڑ کر کھوہ کے منہ کے اندر کر کے چھوڑ دیا۔ باہر بوندا باندی (ہلکی بارش) متواتر جاری تھی اور مکمل طور پر رات چھا چکی تھی۔ جیسی جھڑی لگی تھی معلوم ہوتا تھا کہ یہ نہایت خاموشی سے برستی ہے۔ اب بادل گرج رہے تھے نہ بجلی چمک رہی تھی، جنگل خاموش تھا اور ہر طرف ہو کا عالم تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ درخت ہیولوں کی مانند کھڑے تھے، ہر طرف تاریکی کا راج تھا، سردی بھی خوب تھی۔

ہم نے اندر آ کر اس آدمی سے پوچھا کہ آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا ہے؟ ہم نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم دونوں مشن ہائی سکول میں جماعت نہم میں پڑھتے ہیں، دونوں دوست ہیں اور ہماری آپس میں رشتہ داری بھی ہے۔

"پہلے کچھ کھانے کا انتظام کر لیں، پھر بتاتے ہیں

بتاؤں گا"۔ اس نے کہا۔

ہم نے اسے مزید بتایا کہ ہم مزدوروں کے لئے گھر میں آگ جلانے کی خاطر خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے گدھوں پر لادے گھروں کو جا رہے تھے کہ ہمیں بارش نے آلیا۔ یہ کھوہ دیکھی اور اس طرف چلے آئے۔

"ایسی رجبی بارش کا دورانیہ عموماً لمبا ہوتا ہے"۔ اس نے جواباً کہا۔ "یہ دبی دبی برکتی ہے اور گندم کی فصل کے لئے بہت فائدہ مند ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے سامان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس جو تھوڑی دوپہر کی کچھ بچی تھی حلوے کی شکل میں روٹیاں ہیں ہمارا سالن اور اچار وغیرہ تو دن ہی میں ختم ہو گیا تھا۔

"فکر نہ کرو ہمارے پاس کھانے کو کافی کچھ ہے"۔ اس نے کہا اور ایک بڑی سی گٹھڑی سے مکئی کی روٹی کے ٹکڑے اور گیہوں کا گڑ ملا مرونڈا نکال کر ہمارے سامنے ڈھیر کر دیا۔ بھوک تو ہمیں بھی لگی تھی ہم نے مرونڈا لے لیا اور روٹیاں ان کے حوالے کر دیں۔ یوں دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی بھوک مٹا ڈالی۔ ہمیں خوشی تھی کہ ہم اس جنگل بیابان میں کم از کم خالی پیٹ نہیں سو رہے تھے۔

ہمیں اس بات کی فکر نہیں تھی کہ ہمارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ ہمارے علاقے میں اکثر ایسا ہو جاتا تھا کہ بارش آنے پر جنگل بیابان میں نکلے لوگ کسی کھوہ یا غار میں پناہ لے لیتے تھے اور بعض اوقات پوری رات وہیں گزر جاتی تھی۔ ہمارے گھر والوں نے موسم کی خرابی دیکھ کر پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ایسی صورت حال میں کہیں پناہ لے لینا۔

لکڑیاں جلنے کی حرارت سے کھوہ کی اندرونی فضا خوشگوار ہو گئی تھی اور سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ اب اس جواں سال آدمی نے اپنا نام حافظ منیر بتایا اور لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میری بیوی ہے اور یہ سانپ اس کا ہے جو ہر وقت اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ اس نے وہاں سے 8 میل کی مسافت پر واقع ایک گاؤں کا نام بتا کر کہا وہ وہاں کے رہنے والے ہیں اور آگے آنے والے ایک دوسرے گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہ وہاں جا رہے تھے کہ راستے میں بارش نے آلیا تو انہوں نے اس کھوہ میں رک جانے کا ارادہ کر لیا اور کہا کہ بدقسمتی سے یہاں آتے ہی ہمارے آگ جلاتے ہوئے ہمارے پاس سے ماچس کی تیلیاں ختم ہو گئیں اور اب ہم نے یہ رات اسی انتہائی ٹھنڈی جگہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے گزارنی تھی اللہ نے آپ لوگوں کو ہمارے پاس بھیج دیا۔ حافظ منیر زمین پر بیٹھے بیٹھے ذکر کر رہا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی کالا کمبل اوڑھے دیوار کی جانب منہ کر کے سانپ سے کھیل رہی تھی۔ ہم دونوں کو بھی بیٹھے بیٹھے نیند کے جھٹکے لگنے لگے۔ ہم نے کھیس اوڑھ رکھے تھے۔ ان کھیسوں سے اوڑھنے اور بچھونے کے دونوں کام لیتے ہوئے ہم زمین پر دراز ہو گئے۔ حافظ منیر کا اپنی بیوی سمیت کرایا گیا تعارف مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد خراٹے سنائی دینے لگے۔ اور تھوڑی دیر میں ہمیں بھی نیند نے دبوچ لیا۔

نہ جانے رات کا دوسرا کون سا پہر تھا جب کھوہ کے اندر اٹھنے والے شور کی بدولت ہماری آنکھ کھل گئی۔ چولہے میں رکھی نئی لکڑیاں جل رہی تھیں حافظ منیر اور اس کی بیوی اٹھے ہوئے تھے اور تین اجنبی لوگ (ادھیڑ عمر کے آدمی) ایک جوگیر شکاری کتے سمیت کھوہ میں آن گھسے تھے۔

وہ حافظ منیر کے ساتھ نہایت دھمکی آمیز زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ سیدھی طرح لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔ ہم لڑکی کو لے کر چلے جائیں گے۔ اگر تم نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو ہم تمہارے ٹکڑے کر کے اسی جگہ میں دفن کر دیں گے اور تمہارا نشان تک نہ ملے گا۔

اسی اثناء میں کتا جو ان کے ہمراہ آیا تھا اچانک چاؤں چاؤں کرتا ہوا کراہتا اور کھوہ سے باہر بھاگا۔

نکا پھر فوراً اندر آ گیا۔ اس نے چاؤں چاؤں کی آواز سے گویا کھوہ کو سر پہ اٹھا لیا تھا۔ دیکھا تو سانپ اس سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ جدھر کا رخ کرتا سانپ تیزی سے اسی طرف لپک پڑتا۔ کتا کھوہ کے اندر چکر لگا رہا تھا اور اب بار بار کھوہ کی دیواروں کے ساتھ ٹکرانے لگا۔

''لڑکی! آخر تم نے وہی کام کرا دیا جس کا ہمیں ڈر تھا''۔ آنے والے تین آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ ''تو نے اپنے سانپ سے میرے ڈبو کو مروا دیا۔ تیرے حد سے بڑھے ہوئے زہریلے سانپ نے کتے کی آنکھوں میں زہر کی پچکاری مار ڈالی ہے اور یہ آنکھوں سے اندھا ہو گیا ہے۔ اب اس کی بینائی کبھی واپس نہیں آ سکے گی۔ اس کا علاج تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔ اگر تیرا سانپ اس کتے کو ڈس لیتا تو اس کا علاج ہم کر لیتے۔ ایسا پہلے بھی دو ایک بار ہو چکا ہے اور ہم نے کتے کو بچا لیا تھا مگر اب یہ بہت بری موت مرے گا۔ تم نے نہایت ہی اوچھا ہتھکنڈہ اختیار کیا ہے۔ تیرے اس حد سے بڑھے ہوئے چہیتے ناگ نے یہ کام تیرے اشارہ پر کیا ہے۔ خیر اس کا حساب بھی میں تم سے چکا لوں گا۔ تم فکر نہ کرو... ڈبو نے ہمیں یہاں تک پہنچانے میں ہماری مدد کی ہے۔ یہ ہمیں برستی بارش اور رات کی تاریکی میں اس کھوہ تک لے آیا۔ تم نے میرے ڈبو کو اپنے سانپ سے مروا دیا۔ اب ہم تمہارے اس یار کا قیمہ کر کے اس ڈبو کو کھلائیں گے۔ ارے ماکھے دیکھتے کیا ہو اتار دو کلہاڑی کا دو دستے والا پھل اس کے یار کی گردن میں''۔ وہ زور سے چلایا۔

ہم دونوں مبہوت ہو کر اب تک یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''چاچا! ہمیں بھی تو کچھ پتہ چلے کہ معاملہ کیا ہے؟'' ہم نے آنے والوں سے پوچھا۔

''لڑکو! تم اس معاملے میں دخل مت دو''۔ ایک آدمی نے کہا۔ ''یہ ہمارے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔ ہم کسی کو بھی اپنی عزت سے کھیلنے نہیں دیں گے۔ اگر اس وقت بارش نہ ہوتی تو ہم تم دونوں کو اسی وقت یہاں سے چلتا کرتے''۔

''لیکن یہ لڑکی تو حافظ منیر کی بیوی ہے''۔ میں نے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ کوئی بیوی نہیں ہے۔ یہ شخص اسے ورغلا کر گھر سے بھگا لایا ہے۔ ان کا نکاح ہی نہیں ہوا تو بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟'' وہ پھر چلایا۔ ''ماکھے! چلا کلہاڑی اور اتار دے اس کے یار کی گردن''۔

ماکھا دو قدم آگے بڑھا اور اس نے کلہاڑی بلند کی۔ لڑکی دوڑ کر حافظ کے آگے کھڑی ہو گئی۔

''پہلے مجھے مار دو بابا!''۔

''ماکھے! لڑکی کا شوق بھی پورا کر دو''۔ اس آدمی نے کہا۔ ''اسے اپنے یار کے پاس جانے کا بہت شوق ہے''۔

ماکھے نے کلہاڑی پھر ہوا میں لہرائی لیکن کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور وہ چیخ اٹھا۔ ''ارے مار دیا''۔ ماکھے کو لڑکی کے سانپ نے پاؤں پر ڈس لیا تھا اور ساتھ ہی وہ زمین پر گر گیا۔ اس نے کلہاڑی دوسرے آدمی کی جانب اچھال دی۔ دوسرے نے سانپ پر کلہاڑی کا زوردار وار کر کے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ماکھا موت سے پہلے منہ میں چلا گیا اور سانپ تڑپنے لگا۔ لڑکی نے اپنے چہیتے سانپ کو تڑپتے دیکھا تو اس نے لپک کر کلہاڑی والے شخص کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ کلہاڑی والے کے بازو سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس نے لڑکی کی چٹیا پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ جھٹکے سے کلائی پر سے لڑکی کے دانت اکھڑ گئے۔ کلائی پر کاٹے جانے والے نے اب تک لڑکی کی چٹیا پکڑی ہوئی تھی۔ چٹیا کھینچ کر کے اس نے لڑکی کا چہرہ اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ لڑکی کراہ اٹھی۔

حافظ نے لپک کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لی اور لڑکی کی چٹیا پکڑنے والے شخص پر اس کا بھرپور وار کر دیا جو کارگر ثابت ہوا وہ فوراً گر گیا اور تڑپنے لگا اور چند ثانیوں میں اس کی زندگی کی شمع بجھ گئی۔

بچ جانے والے تیسرے آدمی کو ہم دونوں نے مل کر بٹھا لیا۔ وہ نہتا تھا اس نے ہمیں بتایا کہ لڑکی والے خانہ بدوش سپیروں کا کنبہ ہے۔ لڑکی کی ماں بوڑھی سپیرن ہے۔ اس نے اپنی حفاظت کے لئے یہ انتہائی زہریلا سیاہ سانپ پال رکھا تھا اور اسے یہ سمجھ وہ بہت محبت کرتی تھی وہ اسے محبوب کا درجہ دیتی تھی۔ جو دو آدمی مارے گئے ان میں ایک لڑکی کا باپ تھا جو سپیروں کا نائب تھا اور دوسرا اس کا چاچا لگتا تھا اور میں ان دونوں کا دوست ہوں اگرچہ میں ان کی برادری سے نہیں ہوں۔ یہاں تک کہہ کر وہ شخص جس نے اپنا نام فضل کریم بتایا تھا خاموش ہو گیا۔

ادھر ہم سوچنے لگے کہ کہانی کے مخفی رکھے گئے حصہ کی کہانی حافظ منیر سے سنیں جس نے اصل سین سنسر کر رکھا تھا یا فضل کریم سے؟

کھوہ میں دو بندے مارے گئے تھے۔ حافظ کا پول بھی کھل گیا تھا۔ وہ لڑکی کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔ جیسے ہمارے سامنے اپنی بیوی ظاہر کرتا رہا۔ اوپر سے ایک قتل بھی کر چکا تھا اور کھوہ کے اندر تین آدمی ہم دونوں اور فضل کریم موقع کے گواہ تھے۔ اس کے علاوہ لڑکی نے بھی یہ قتل ہوتے دیکھا تھا جو کہ اس کے عاشق نے اس کے باپ کا کیا تھا۔ وہ عاشق کا قتل کرنے آئے تھے مگر دونوں بھائی خود مارے گئے۔ لڑکی کا باپ قتل ہو گیا اور چچا سانپ کے ڈسنے سے موت کے منہ میں چلا گیا۔ بہرحال ہم نے فضل کریم کو کہا کہ وہ کہانی مکمل کرے۔

"فضیرو!" حافظ منیر نے ہاتھ کھڑا کیا اور کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں ان لونڈوں کے سامنے کہانیاں سنانے کی۔ اب تک جو کچھ انہوں نے دیکھ لیا ہے وہی ہضم کر لیں تو کافی ہے"۔ اور پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔ "لڑکو! تم دونوں اسی وقت یہ کھوہ خالی کر دو اور بھول جاؤ کہ تم نے کچھ دیکھا ہے۔ اگر تم نے میرے خلاف زبان کھولی یا گواہی دینے کی کوشش کی تو یاد رکھو میرا نام بھی منیرا ڈاکو ہے۔ میں تمہاری نسلیں اجاڑ کر رکھ دوں گا۔ تمہیں پتہ ہے تم کہاں کے رہنے والے ہو اور کون ہو۔ منیرا ڈاکو۔ نام تو تم لوگوں نے سن رکھا ہو گا بس یاد رکھنا"۔

منیرا ڈاکو کا نام سن کر ہمیں جھرجھری سی آ گئی۔ علاقہ میں فی الواقع اس کا نام گونجتا تھا۔

"میں حافظ بھی ہوں"۔ منیرا پھر گویا ہوا۔ "میں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حافظ منیر بن کر زندگی جینے کی کوشش کی تھی لیکن ظالم سماج نے آج پھر مجھے منیرا ڈاکو بنا ڈالا اور مجھ سے اس لڑکی کا باپ قتل کرا دیا"۔

"لیکن تم نے بھی تو اس سماج کا بنایا ہوا قانون توڑا ہے تم اس لڑکی کو اغوا کرنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہو"۔ میں نے ہمت کر کے یہ سب کچھ منیرا ڈاکو کے منہ پر کہہ دیا۔

"اس لڑکی کو میں نے نہیں بلکہ اس لڑکی نے خود مجھے اغوا کر لیا ہے"۔ منیرا کہنے لگا۔ "یہ لڑکی اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہی ہے پوچھ لو اس سے۔ میں نے اس کے باپ کی منت کی تھی اس کے پاؤں بھی پڑا تھا۔ میں نے حافظ منیر بن کر اس سے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا لیکن موجے سپیرے نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں ایک ڈاکو قاتل اور لٹیرے کو اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دوں گا"۔

"موجے نے ٹھیک کیا تھا کون شریف باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک ڈاکو اور قاتل کے ہاتھ میں دے گا"۔ رفیق کی زبان سے یہ سارے الفاظ ایک ساتھ پھسل گئے۔

منیرے نے ہم دونوں کو گھور کے دیکھا۔ روایت

بیٹھ کر رہ گیا۔ اپنے عاشق کے ہاتھوں اپنے باپ کی موت پر ہم لڑکی کا ردعمل جاننا چاہتے تھے لیکن منیرا ہمیں وہاں سے راتوں رات بھگانے کے چکر میں تھا۔ ادھر فضل کریم نے بھی اپنی جان بچانے کی غرض سے منیرے کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی تھی۔ ہمیں لگا کہ اب کھوہ کے اندرونی حالات ہمارے مخالف ہو گئے ہیں۔

ابھی رات کافی باقی تھی اور باہر وہی جھڑی کا راج تھا۔ سردی ہڈیوں کے پار ہوا چاہتی تھی۔ اندر منیرا ڈاکو ہم دونوں کو کھوہ سے نکال باہر کرنے کے درپے تھا۔ کھوہ کے اندر اب منیرے ڈاکو کی حکومت تھی۔ اس نے ہمیں سچ بولنے کی پاداش میں اور اپنے جرم کا کھرا کھوج مٹانے کی غرض سے بھری برسات، رات کی تاریکی اور ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی میں کھوہ سے باہر نکل جانے کی سزا سنا دی تھی۔ جس کے تصور سے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گو کہ اب کھوہ کے اندر والا منظر بھی کچھ کم ڈراؤنا اور بھیانک نہیں تھا۔ ایک طرف دو انسانی لاشیں گری پڑی تھیں۔ کھوہ کے وسط میں دو ٹکڑوں میں بٹا بہت بڑا سانپ پڑا لرز رہا تھا۔ بیچاری لڑکی نے رو رو کر الگ اپنا برا حال کیا ہوا تھا۔ ایک طرف اس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور وہ بھی اپنے محبوب کے ہاتھوں اور دوسری طرف اس کا دوسرا محبوب سانپ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ اسے ایک وقت میں دو صدمے سہنے پڑ رہے تھے۔ اس کا آگ کے الاؤ جیسا تمتماتا چہرہ بجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ روئے چلی جا رہی تھی۔ اس موقع پر اس کا محبوب بھی اسے تسلی نہیں دے رہا تھا اس کے ہاتھوں سے ایک انسانی جان چلی گئی تھی۔ اسے اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنا سارا غصہ ہم پر نکالنا چاہتا تھا اور ہمیں برابر کہے چلا جا رہا تھا کہ ہم کھوہ چھوڑ دیں۔ عجیب ضد تھی اس کی۔ بھلا اس میں ہم دونوں کا کیا قصور تھا۔ سارا کیا دھرا تو اس کا اپنا تھا۔

"ہم صبح تک یہ کھوہ نہیں چھوڑیں گے"۔ ہم نے یک زبان ہو کر کہا۔ "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ کھوہ سرکاری عملداری والے لیز شدہ رقبہ میں ہے۔ کسی کی ذاتی جاگیر نہیں۔ اس وقت ہم یہ کھوہ نہیں چھوڑ سکتے"۔ ہم بھی ضد لگا کر اور چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔

اب سونا تو کیا تھا کسی نے، کھوہ میں پیش آمدہ حالات سے سب کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اندر سے ہمیں منیرے ڈاکو سے خطرہ بھی تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ ایک انسانی جان لے چکا تھا اور اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ شواہد مٹانے کے لیے ممکن ہے۔۔۔ ہمیں بھی نقصان پہنچا ڈالے۔ ہم دل ہی دل میں دعا کرنے لگے کہ یا اللہ ہماری حفاظت فرما اور شر کو ہم سے دور کر دے۔ ہم دونوں کافی چوکنے اور محتاط ہو کر بیٹھے رہے۔ منیرے نے کلہاڑی اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اور ہمارے مابین کوئی اتنا زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا۔ ادھر فضل کریم بھی بالکل بکری بنا منیرے کی ہاں میں ہاں ملاتا جا رہا تھا اور ہمیں غصہ دلائے جا رہا تھا۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتا تو بھی ہمارا حوصلہ بڑھ سکتا تھا۔ منیرا اس کا اور یہ اس کا دشمن تھا وہ منیرے کو قتل کرنے آیا تھا لیکن اس کے ساتھی جب مارے گئے تو اس نے اپنی جان کے خوف سے منیرے سے صلح کر لی۔ ادھر منیرا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"لڑکو! مجھے قانون مت سکھاؤ میں سب قانون جانتا ہوں"۔ اس نے سرد لہجا اور نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہوا۔ "سب کی طرح کھوہ سے باہر ہو جاؤ"۔ ہم نے کہا کہ ہمارے یہاں اس کھوہ میں بقیہ رات گزارنے سے تمہارا کیا جائے گا؟

"میرا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تمہاری جان ضرور جائے گی"۔ اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟" ہم نے کہا۔

"وہ ایسے"۔ وہ کلہاڑی لے کر اپنی جگہ سے اٹھا اور

روشن ڈیک میں ہمارے مدمقابل آن کھڑا ہوا۔ ابھی اشارہ نہ ہوا تھا کہ سپیرن لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی دوڑتی ہوئی منیرے کا کلہاڑی والا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "منیرے! انہیں مت مارنا تم پہلے بہت کچھ کر چکے ہو۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔ نہ ہی انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے"۔

"کیوں! یہ تمہارے یار لگتے ہیں کیا؟" منیرے نے غصے بھرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے میرے باپ کو قتل کر دیا"۔ لڑکی نے منیرے کے منہ پر تھوک کر کہا۔ "تمہاری وجہ سے میرا محبوب سانپ مجھ سے جدا ہوا۔ اور اب مجھے یہ طعنہ دے رہے ہو۔ میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں چھوڑا۔ اپنے بہن بھائی چھوڑے، اپنے باپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا۔ میرا باپ بہت عزت والا تھا۔ لوگ اس کی بات مانتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ ایک اچھا باپ اور شریف آدمی تھا لیکن تم.... منیرے تم اس سے بزدلی کر کے میرا قاتل بن گئے۔ تم میرے باپ کے قاتل ہو...... میں تم پر تھوکتی ہوں ..... اور اس جھڑی برسات میں واپس اپنے ڈیرے پر جا رہی ہوں۔ تم میں اگر ہمت ہے تو مجھے روک کر دیکھو"۔ اس نے منیرے کو دھکا دے کر پرے گرا دیا۔

اچانک منیرا کراہ اٹھا۔ سپیرن لڑکی کا سانپ جسے اس کے باپ نے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا اور لڑکی سمیت سب نے اسے مردہ سمجھ لیا تھا اصل میں اس کے اندر ابھی جان باقی تھی اور اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا کیونکہ وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ سانپ پر بے ہوشی طاری تھی۔ ہوا یہ کہ سپیرن لڑکی نے جب منیرے کو دھکا دے کر پرے کیا تو منیرے کا پاؤں سانپ کے اوپر آ گیا۔ سانپ کے کٹے پھٹے اور شدید طور پر زخمی جسم پر جب منیرے کا پاؤں پڑا تو سانپ ہوش میں آ گیا اور اس نے عین اپنی فطرت کے مطابق اپنے اوپر پاؤں رکھنے والے کو ڈس لیا اور اپنا بچا کھچا تمام تر زہر منیرے کے جسم میں انڈیل دیا۔ سپیرن اچک پڑی۔ اس نے دو ٹکڑے سانپ کو اٹھا لیا اسے چوما اور اس کے دونوں ٹکڑے اپنی گود میں بھر کے زار و قطار رونے لگی۔ سب نے دیکھا کہ سانپ تھوڑی دیر بعد سپیرن کی جھولی میں پڑے پڑے دوبارہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ سپیرن نے سانپ کو زمین پر رکھ دیا۔ اسے الٹایا تو وہ الٹا ہی رہ گیا۔ سپیرن نے تصدیق کر دی کہ اب اس کا محبوب سانپ فی الحقیقت اس سے جدا ہو گیا ہے اور اس کی زندگی ختم ہو گئی۔

نوٹ: ہو سکتا ہے کچھ لوگ اس بات پر یقین نہ کریں کہ دو ٹکڑے ہونے کے باوجود سانپ نے منیرے کو کیسے ڈس لیا۔ یہ حقیقت ہے ایسا ہونا ممکن ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے "نیشنل جیوگرافک" میں ایسا ہی ایک منظر دیکھا جس میں ایک شخص نے سانپ کا سر کاٹ دیا تھا اور جسم الگ پھینک دیا۔ وہ جب دوبارہ کٹے ہوئے سر کے قریب سے گزرنے لگا تو کٹا ہوا سر منہ کھول کر حملہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بعد میں اس آدمی نے اس کٹے ہوئے سر کو زمین میں دبا دیا۔ (ایڈیٹر)

ادھر منیرا بھی آخری سانس پر تھا۔ منیرے کے جسم میں داخل شدہ زہر کا تریاق کسی کے پاس نہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حافظ منیر عرف منیرا ڈوگر بھی زندگی کی بازی ہار گیا۔

گندھالہ کی اس خون آشام کھوہ میں ایک اور لاش کا اضافہ ہو گیا اور صبح تک کھوہ کا اندرونی ماحول انتہائی سوگ بھرا اور بھیانک بنا رہا۔ یوں یہ صدیوں لمبی قہر بھری رات بالآخر کٹ گئی۔ گندھالہ کے جنگل میں سوگواری صبح طلوع ہوئی۔ صبح بھی ابھی جھڑی جاری تھی۔ ہم دونوں گھر واپس جانے کی تیاری کرنے لگے۔

ہم اپنے پیچھے کھوہ میں سپیرن لڑکی، فضل کریم، تین انسانی لاشیں، دو ٹکڑے مردہ سانپ اور آنکھوں سے اندھا ہو کر شکاری کتا چھوڑ آئے اور خود اپنی گدھیوں کو بغیر بوجھ کے گھر لے آئے۔

گھر پہنچ کر جب گھر والوں کو اپنی بپتا سنائی تو سب نے مشورہ دیا کہ جو کچھ بھی ہم نے رات کھوہ میں دیکھا اسے خواب سمجھ کر بھول جائیں اور آئندہ کبھی گندھالا کا رخ نہ کریں۔ اس کے بعد ہم طویل عرصہ تک پھر گندھالا نہیں گئے۔

برسوں بعد اب سے کچھ ہی دن پہلے میں اور میرا ایک دوست رفیق اپنے ایک پرانے دوست کی جیپ پر گندھالا میں لگی اس کی کوئلہ کی کان دیکھنے گئے تو واپسی پر جب جیپ اس کھوہ والے پہاڑ کے دامن میں نیچے بنی ہوئی سڑک سے گزر رہی تھی تو میں نے رفیق کو آواز دی۔

"رفیق یار! کیا خیال ہے اس کھوہ کی زیارت نہ کرنے چلیں"۔ رفیق مجھ سے متفق ہو گیا۔ اس نے کہا اگر وہاں تک راستہ جاتا ہے تو جیپ میں چلتے ہیں مگر وہاں تک جیپ لے جانا ممکن نہ تھا۔ بہرحال ہم نے جیپ رکوائی اور بمشکل تمام کھوہ تک پہنچے۔ کھوہ کے اندر گئے۔ کھوہ بالکل اسی طرح قائم و دائم تھی جیسے چھوڑ کر گئے تھے لیکن کھوہ کے اندر سوگواری اداسی تھی۔ جابجا مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا پھر کسی منیرے ڈاکو نے چمبیرن لڑکی کے ساتھ اس کھوہ میں پناہ نہیں لی۔

اندر کھڑے ہو کر جب ہم نے اس مہیب رات کا تصور کیا تو اب بھی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہمیں لگا کہ یہاں سے ہوا بھی سسکیاں لے کر گزر رہی ہے۔ منیرا ڈاکو، موجے اور ساکھے کی روحیں بھی اس کھوہ کے آس پاس بھٹک رہی ہوں گی۔

"یار غضب!" رفیق نے کہا۔ "یہ سارا اس چمبیرن لڑکی کے حسن کا فتور تھا۔ زندگی بھر پھر کبھی اس طرح کا حسن نہیں دیکھا۔ نہ وہ حسین ہوتی، نہ منیرا اس کا عاشق ہوتا، نہ اسے لے کر گھر سے نکلتا۔ بختا خانم نے چمبیرن کا حسن آگ کے الاؤ کے سامنے کس طرح جھلکا دیا تھا؟"

پٹی

اس کہانی میں مزاح کا پہلو ہے ضرور مگر کہاں؟

☆ .... انیس انصاری

ایک مزے کی کہانی سنئے!

"ایک مریض ڈاکٹر کے پاس آیا، اس کے ایک پیر پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"دردِ سر" ۔ مریض نے جواب دیا۔

"پھر پیر پہ پٹی کیوں؟"

"وہ پھسل کر وہاں پہنچی ہے" ۔ مریض نے جواب دیا۔

سب ہنسنے لگے۔

سب ہنسنے لگے سوائے ایک شخص کے وہ کچھ عجیب انداز سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد مجھ سے پوچھنے لگا۔

"معاف فرمائیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مریض کو کیا بیماری لاحق تھی؟"

"دردِ سر" ۔ میں نے جواب۔

"تو اس کے پیر پہ پٹی کیوں بندھی ہوئی تھی؟"

"وہ پھسل کر وہاں پہنچی تھی" ۔

"اچھا، یہ بات ہے" ۔ اس نے جواب دیا اور خیالوں میں کھو گیا۔

"میں نہیں سمجھا" ۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے پھر کہا۔ "مجھے منطقی طور پر سمجھایئے، مریض نے کہا تھا ناں کہ اس کو دردِ سر ہے" ۔

"یقیناً" ۔ میں نے جواب دیا۔

"لیکن اس کے پیر پہ پٹی کیوں بندھی ہوئی تھی؟"

"وہ پھسل کر پہنچی تھی" ۔

"تعجب ہے" ۔ یہ کہتا ہوا وہ ٹیبل سے اٹھ کھڑا ہوا،

فکر کی تہہ تک پہنچا اور خیالوں میں کھویا ہوا باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”اس کہانی میں مزاح کا عنصر کہاں ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آتا۔ اگر کسی آدمی کے سر میں درد ہے تو اس نے پاؤں پہ پٹی کیوں باندھی؟“ وہ بیٹھ گیا۔

”لیکن اس نے باندھی کہاں، وہ تو پھسل کر وہاں پہنچی تھی“۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”آیئے باہر کھلی فضا میں چلیں، ہمیں اس بات کی تہہ تک پہنچنا ہے“۔

ہم باہر کھلی فضا میں آ گئے۔

”دیکھئے جناب!“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتایئے کیا یہ کوئی مزاحیہ بات ہے یا مجھے بے وقوف بنایا جا رہا ہے“۔

”میرے خیال میں مزاح کا پہلو صاف اور واضح ہے“۔

مجھے تعجب سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اس میں مزاح ہے کہاں؟“

”مجھے علم نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مزاح سے بھرپور واقعہ ہے“۔

”مزاح سے بھرپور!“ اس نے تعجب سے دہرایا۔

”تو پھر ہو سکتا ہے کہ آپ نے پورے حقائق بیان نہ کئے ہوں“۔

”حقائق!“ میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، مثلاً اس مریض کی صرف ایک ہی ٹانگ ہو“۔

”نہیں“۔ میں نے بوکھلاہٹ میں کہا۔ ”اس کی دونوں ٹانگیں تھیں“۔

جود و سخا کا روگ

یحییٰ برمکی کی سخاوت بہت مشہور تھی۔ لوگ اس سے ملنے اور مصافحہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے لیکن ایک تقریب میں بغداد کے ایک امیر معاذ بن مسلم کو جب یحییٰ برمکی سے سامنا ہوا اور یحییٰ برمکی نے از راہ اخلاق مصافحے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر چھپا لیا اور مصافحے سے بچا رہا۔

یحییٰ برمکی کو اس کے اس رویے پر حیرت بھی ہوئی اور ناراضگی بھی۔ پوچھا۔

”معاذ! تم نے مجھ سے مصافحہ کیوں نہیں کیا؟ تم سے یہ بد اخلاقی کیوں سرزد ہوئی آخر؟“

معاذ نے جواب دیا۔ ”جناب والا! آپ کا ہاتھ ایک ایسی چٹان ہے جس سے جود و سخا اور بخشش و کرم کے دریا نکلتے ہیں۔ جب آپ نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں ڈر گیا کہ اگر خدانخواستہ آپ کے اتصال سے یہی روگ مجھے بھی لگ گیا تو میں تو کہیں کا بھی نہ رہوں گا۔ تباہ و برباد ہو کر رہ جاؤں گا“۔

یحییٰ برمکی نے اپنی تعریف سے شرمسار ہو کر گردن جھکا لی۔

”اگر آپ کی بات مان لی جائے تو حقائق اس طرح ہوئے کہ ان کے سر سے پھسل کر پٹی اس کی گردن میں آئی جہاں سے گزرتی ہوئی چھاتی پر پہنچی۔ ذرا نیچے پھسلی تو پیٹ پر آئی اور پھسلتی ہوئی وہ دونوں ٹانگوں سے گزر کر دونوں پاؤں میں آ گئی ہو گی اس لئے تو کہتا ہوں کہ شاید اس کی ایک ٹانگ تھی“۔

”نہیں“۔ میں نے نہیں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مریض لنگڑا نہیں تھا"۔

"تو پھر ایک پاؤں میں پٹی کیسے آئی؟" وہ حیران کن نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ پھسل کر وہاں پہنچی"۔ میں نے کہا۔

اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور حیرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ "میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر مریض کو کیا عارضہ تھا"۔

"خدا حافظ!" میں نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔

***

ایک بجے میری آنکھ ٹیلیفون کی مسلسل گھنٹی سے کھلی۔ وہی آواز آ رہی تھی۔ "جناب! میری مدد کریں۔ میری تو نیند اڑا دی ہے اس کہانی نے۔ وہ پٹی بندھا ہوا پیر میرے سر میں گھوم رہا ہے۔ ضرور اس کہانی میں کہیں نہ کہیں مزاح ہے ضرور لیکن کس جگہ؟"

"کسی جگہ ہے تو ضرور"۔ میں نے جماہی لے کر کہا۔

"وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں، بے وقوف نہیں ہوں میں جناب! اور خاصا پڑھا لکھا بھی ہوں۔ میں نے یہ کہانی اپنی بیوی کو سنائی تو اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا"۔

"آپ کو نیند کی ضرورت ہے"۔ میں نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

دوسرے روز شام کے وقت اس کا فون آیا وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے آپ کی کہانی بہت سے ڈاکٹروں، ڈریسروں اور نرسوں کو سنائی ہے ان سب کا کہنا ہے کہ پٹی کسی بھی صورت میں سر سے پھسل کر پاؤں میں نہیں جا سکتی"۔

"نہیں جا سکتی تو جائے جہنم میں۔ اگر وہ وہاں نہیں جا سکتی تو آپ اور ہم کون ہوتے ہیں اسے وہاں پہنچانے والے؟" میں نے جل کر جواب دیا۔

"میں بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں، آخر کس نے منطق کس دن کے لئے بنائی ہے"۔ اس نے زور سے کہا اور میں نے غصے سے ریسیور پٹخ دیا۔

وہ لگاتار کافی عرصے تک فون کرتا رہا۔ ایک مرتبہ گھر بھی آیا۔ میں نے اس سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جھڑکیاں تک دیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

آخر میں نے اس کہانی کو چھپنے کا فیصلہ کیا تا کہ دنیا دیکھے کہ اس جہان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن میں مزاح سمجھنے والی شے حس لطیف نام کو بھی نہیں۔ کہانی لکھ کر ماہنامہ طنز و مزاح کے ایڈیٹر کے پاس لے گیا۔

وہ دل کھول کر ہنسا۔

"کتنے بے وقوف ہیں کچھ لوگ"۔ ایڈیٹر نے کہا۔

"کیا واقعی ایسے لوگ بھی ہیں اس جہاں میں جن میں مزاح سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "اور ایک کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔"

"واقعی!"

اب کے لوگوں میں کوئی نہیں غالب
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے تھے

ایڈیٹر صاحب نے مزاحیہ شعر سنا دیا۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے ایک ہاتھ میری پیٹھ پر رکھ کر منہ کو میرے کان سے لگایا اور سرگوشی میں کہنے لگے۔ "آپ مجھے اس راز سے واقف تو کرائیں، آخر مریض کو کیا تکلیف تھی؟"

"اس کو درد سر تھا"۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تو پٹی اس کے پیر پر کیوں بندھی تھی؟"

میری آنکھوں کے سامنے تتلیاں ناچنے لگیں اور میں سمجھا کہ میری یہ کہانی کبھی بھی شائع نہ ہو گی کبھی بھی نہیں۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور بڑے بڑے حقائق

حبیب اشرف صبوحی

○ میرا ایک تکیہ کلام تھا اور اب بھی ہے" جو بندوں کا شکرگزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا شکرگزار بھی نہیں ہوتا"۔ میں اکثر و بیشتر اس جملے کو اپنی روزمرہ کی گفتگو میں دہراتا رہتا تھا۔ پچھلے سال میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی میں نے دیکھا کہ موبائل کی سکرین پر پاکستان سے باہر کا نمبر آ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر موبائل کا بٹن آن کیا تو میرے دفتر کے ایک بہت پرانے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ سلام دعا کے بعد میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ "رانا سیف الرحمٰن صاحب! کیا آپ پاکستان سے باہر چلے گئے ہیں؟" اس نے کہا۔

"جی! میں عمرہ کرنے آیا ہوں اور خانہ کعبہ کا غلاف پکڑے ہوئے آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں"۔

"بھائی! یہ کام تو میرا قریب سے قریب رشتہ دار بھی نہیں کرتا جو کام آپ کر رہے ہیں"۔ میں نے حیران ہو کر کہا۔

"سر! آپ ہی کہا کرتے تھے" اس نے کہا۔ "جو بندوں کا شکرگزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا بھی شکرگزار نہیں ہوتا۔ یہاں میں اللہ کا بھی شکرگزار ہوں اور آپ کا بھی"۔

اس کے بعد جب وہ حج پر تشریف لے گیا تو وہاں جا کر بھی فون کیا اور میرے لئے دعا کی۔ میں سوچتا ہوں کہ کچھ لوگ اتنے وضعدار اور نسبت والے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بڑوں کو کبھی نہیں بھولتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے محسنوں کو یاد رکھنے کی توفیق دے۔ آمین!

○... ہم ایک دکاندار سے دفتر کے لئے کثیر مقدار میں سامان لیتے تھے کیونکہ ایک تو اس کے ریٹ بہت مناسب ہوتے تھے اور دوسرا چیز بھی معیاری ہوتی تھی۔ وہ دفتر جب بھی آتا مجھ سے ملتا اور بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ یہ ایک کاروباری بندہ

ہے۔ جب تک اس کا کام ہم سے چھتا ہے یہ محبت اور خلوص سے ملتا رہے گا اور جب کام ختم ہو جائے گا تو یہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح غائب ہو جائے گا۔ وہ اکثر ایک جملہ مجھے کہتا تھا۔ ''آپ کی نیکیاں میں قبر کی دیواروں تک نہیں بھولوں گا''۔

میں اس سے کہتا کہ بھائی یہ تمہاری کاروباری باتیں ہیں جب میں اس سیٹ سے ہٹ جاؤں گا۔ تم مجھے پوچھو گے تک نہیں۔ آج مجھے اس سیٹ سے ہٹے ہوئے 15 سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں بھلایا۔ ہر سال شروع ہوتے ہی نئے سال کا کیلنڈر اور ڈائری بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ عید اور دیگر تہواروں پر بھی یاد رکھتا ہے۔ اس مادیت کے دور میں ایسے لوگوں کا ملنا کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ آج کل جب کسی سے کام پڑتا ہے تو اس کو باپ بنا لیتے ہیں اور جب وقت گزر جاتا ہے تو اس کی نیکیوں کو بھول جاتے ہیں۔

○..... مسجد میں ایک نمازی سے دوستی ہو گئی۔ وہ پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ اس کے کاروباری حالات ٹھیک نہیں تھے اور اس کی وجہ سے فکرمند رہتا تھا۔ دو سال پہلے کا واقعہ ہے کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے مسجد میں آنا چھوڑ دیا۔ دو چار دفعہ اس کے لڑکے سے پوچھا کہ تمہارے ابا مسجد میں نماز پڑھنے کیوں نہیں آتے، کیا وجہ ہے؟ وہ ہر دفعہ کوئی بہانہ بنا رہا تھا اور اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سخت پریشان ہے۔ میں نے عید سے چند روز قبل اس کو زبردستی نماز کے بعد روک لیا اور کہا کہ تم کوئی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ جب میں نے اس پر بہت زور دیا تو اس نے بتایا۔

''میرے والد نے لوگوں کے بہت پیسے ادھار دینے تھے۔ کاروبار بالکل تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ رشتے داروں نے منہ پھیر لیا ہے۔ جن لوگوں کا پیسہ دینا تھا انہوں نے میرے والد کو جیل میں قید کروا دیا ہے۔ ضمانت کے لئے 25 ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ ورنہ ان کی عید جیل میں ہی ہو گی۔ کوئی رشتہ دار مدد کرنے کو تیار نہیں ہے''۔

میں نے کچھ دوستوں کی مدد سے پیسوں کا انتظام کروایا اور عید سے قبل اس کی ضمانت ہو گئی۔ عید والے روز وہ میرا شکریہ ادا کرنے گھر آیا اور کہا کہ دعا کریں کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں تاکہ میں آپ کا قرضہ دے سکوں۔ میں نے اسے کہا کہ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ جب بھی ہو تو دے دینا۔ ورنہ وہ پیسے معاف کر دیے ہیں۔ وقت گزرتا گیا۔ اس رمضان شریف میں اس کا بیٹا مسجد میں نظر آیا۔ میں نے اس کے والد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میرے والد آج کل ساہیوال میں کام کر رہے ہیں اور خدا کے شکر سے کام ٹھیک جا رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے خاموشی سے تمام پیسے جو میں نے اس کے والد کے سلسلے میں دیئے تھے واپس کر دیئے اور کہا کہ ہمارا کام اللہ کے شکر سے ٹھیک چل رہا ہے۔ یہ پیسے آپ کی امانت ہیں۔ کسی ضرورت مند کے کام آ جائیں گے۔

زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے پیسے لے کر واپس کئے۔

○..... میرے گھر کے سامنے پولیس کے محکمے کے ایک آفیسر رہتے تھے جو ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ تہجد گزار تھے اور لوگوں کے کام آتے تھے۔ نماز پڑھنے مسجد میں باقاعدگی سے جاتے تھے اور ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ تکبیر اولیٰ ضائع نہ ہو۔ اگر کسی شادی یا تقریب میں بھی جاتے تھے تو اس بات کا خصوصی اہتمام کرتے تھے کہ نماز باجماعت پڑھی جائے۔ جب تک ملازمت میں بھی رہے تو انہوں نے ہمیشہ رزق حلال پر زور دیا۔ ان کے تمام بچے برسر روزگار

تھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں بیمار ہو گئے اور ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹروں نے اُن کی گرتی ہوئی صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُن کے بچوں کے باہر سے آنے تک اُن کو آکسیجن پر رکھا۔ جب اُن کے بچے اور رشتہ دار سب پہنچ گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ اب میں آکسیجن کی نالی ان کی ناک سے نکال لوں گا اور یہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر نے اُن کے بچوں اور رشتہ داروں سے اجازت لے کر آکسیجن کی نالی اُن کی ناک سے نکال دی۔

سب نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا لیکن نالی نکالتے ہی معجزہ یہ ہوا کہ بزرگوار کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اتنے لوگوں کو کھڑے دیکھ کر حیران ہو گئے اور کہا کہ آپ لوگ کس طرح آ گئے ہیں۔ اُن کو بتایا گیا کہ آپ کافی عرصے سے بیمار تھے اور اب آپ معجزانی طور پر ٹھیک ہو گئے ہیں۔ بزرگوار کہنے لگے کہ اب مجھے گھر لے چلو، میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ تھوڑی سی کمزوری ضرور ہے۔ چنانچہ وہ گھر والوں کے ساتھ اپنے گھر آ گئے۔

گھر آئے ہوئے ابھی دو تین روز ہوئے تھے جسم میں کمزوری ضرور تھی گھر والوں سے بار بار کہتے تھے کہ یہ سفید وردی میں لوگ گھر میں کیوں پھر رہے ہیں، ان کا کیا کام ہے؟ گھر والے کہتے تھے کہ ہمیں کوئی نظر نہیں آ رہے۔ انتقال سے چند لمحے پہلے کہنے لگے کہ خواتین کمرے سے باہر چلی جائیں، سفید وردی والے زیادہ تعداد میں آ گئے ہیں۔ خواتین کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو بزرگوار انتقال کر چکے تھے۔ سفید وردی والے اصل میں فرشتے تھے اور ان کی جان قبض کرنے آئے تھے اور بغیر کسی تکلیف کے ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ نیک آدمیوں کی موت بھی آسانی اور معجزے کے ساتھ ہوتی ہے۔ انسان کی نیکی اس سے

کر سفر کے بعد بھی تو تم دائم رہتی ہے۔

○ خوش اخلاقی اور حسنِ عمل سے انسان بڑے سے بڑے کام کو کر لیتا ہے اس سلسلے میں کچھ واقعات بتانا چاہتا ہوں۔ میرے ایک عزیز کراچی سے لاہور آئے۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔ یہاں سے وہ راولپنڈی جانا چاہتے تھے ان کی سیٹیں میں نے کراچی سے آنے والی ٹرین میں بک کروا دیں۔ جب ہم مقررہ تاریخ اور دن کو راولپنڈی جانے کے لئے اپنی سیٹوں پر پہنچے تو وہاں ایک بزرگ خاتون بچوں سمیت بیٹھی ہوئی تھیں جب ہم نے ان سے کہا کہ یہ سیٹیں ہماری ہیں تو انہوں نے لڑائی شروع کر دی اور کہنے لگیں کہ ہم تو کراچی سے راولپنڈی تک کے لئے بک کرا کر آئے ہیں، ہم خالی نہیں کریں گے۔ میرے عزیز نے بزرگ خاتون کی باتیں بڑے تحمل اور صبر سے سنیں اور کہنے لگے۔

”اماں جان! آپ بیٹھی رہیں، آپ کے بچے بھی بیٹھے رہیں۔ ابھی اتنا وقت نہیں ہے کہ ٹکٹ چیکر سے فیصلہ کروائیں کہ یہ سیٹیں کس کی ہیں؟ ہم زمین پر بیٹھ کر گزارا کر لیں گے“۔ پھر بچوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ”دیکھو ان کی شکل ہماری امی سے ملتی ہے، یہ سفر اچھا گزرے گا“۔

اپنے بچوں کے لئے جو بسکٹ اور دوسری چیزیں خریدی تھیں فوراً ان کے بچوں اور بزرگ خاتون کو دیں۔ چند لمحوں میں ان بزرگ خاتون نے ان کی سیٹیں خالی کر دیں اور کہا کہ تم اتنے چھوٹے ہوتے ہوئے اس اچھے اخلاق کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ میں تمہاری تعلیم اور تربیت کی قائل ہو گئی ہوں۔ بعد میں میرے عزیز نے بتایا کہ میں ان کے اس رویے سے اتنی متاثر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ راولپنڈی میرے گھر ضرور آنا۔ میں تو ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوں۔ یہ سب اچھے اخلاق اور اچھی حسنِ عمل کا نتیجہ تھا ورنہ ہمارے راستے کوئی اور ہوتا تو لڑتے جاتے۔

اسی طرح میں ایک روز راولپنڈی سے لاہور ریل کار سے آ رہا تھا۔ ریل کار میں بہت رش تھا، کافی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میرے سامنے دو مسافروں کی سیٹ تھی اور دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ٹرین کو چلے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک ضعیف آدمی بڑی مشکل سے چلتا ہوا ہمارے سامنے آیا اور سامنے بیٹھے ہوئے دونوں اشخاص سے درخواست کی مجھے بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ ان دونوں لوگوں نے جگہ دے دی۔ وہ ضعیف آدمی شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ان دو اشخاص میں ایک شخص کچھ دیر بعد واش روم چلا گیا۔ راستے میں اسے کھڑے ہوئے مسافروں میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار مل گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا اور ضعیف آدمی سے کہنے لگا کہ اب سیٹ خالی کرو میرے یہ عزیز کافی دیر سے وہاں کھڑے تھے۔ اس ضعیف آدمی نے سیٹ خالی کر دی اور بڑی رنجیدہ شکل بناتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد ٹکٹ چیکر آ گیا۔ اس نے سب کے ٹکٹ چیک کئے جب وہ ضعیف آدمی کے پاس آیا اور اس کا ٹکٹ چیک کیا تو حیرانی سے بولا کہ بابا جی یہ آپ کی سیٹ ہے جس پر یہ دو لوگ بیٹھے ہیں اور آپ کھڑے ہیں؟ ٹکٹ چیکر نے ان دونوں آدمیوں کو اٹھا دیا جو بابا جی کی سیٹ پر ”قبضہ گروپ“ کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے اور وہ مستحق شخص جس کی سیٹ تھی وہ کھڑا ہوا تھا۔ یہ ضعیف آدمی کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے ان لوگوں کو یہ نہ بتایا کہ یہ سیٹ اس کی ہے اور وہ پریشانی اور تکلیف میں کھڑا ہے۔ میں نے ایسا اعلیٰ ظرف اور وسیع الفکر انسان کبھی نہیں دیکھا اور اس کردار کو میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔

لاہور

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں شدتِ احساس کے باعث لرز اٹھا۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا اور میں نے تیزی سے مڑ کر اپنے آپ کو تانگے میں ڈال دیا۔

☆ .... انیس الرحمٰن

جب میں اسٹیشن پر اترا تو دو وقت مل رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی میں نے ٹیکسی پر سامان لادا کر نئی بستی کا رخ کیا جو اسٹیشن سے چھ سات میل کی مسافت پر واقع تھی۔

میں ایک مدت بعد تین ماہ کی چھٹی لے کر پاکستان آیا تھا اور عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے نگری نگری پھر رہا تھا۔ میں نئی بستی میں خانم سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھا اور اس کے ساتھ نئی بستی کی صاف شفاف سڑکوں پر چہل قدمی کر کے کچھ گزرے دنوں کی یاد تازہ کرنا چاہتا تھا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا اور اب جبکہ میں جادۂ زیست پر کافی آگے بڑھ آیا تھا تو ماضی کے دھندلکوں پر طائرانہ نظر ڈالنے سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی نخلستان اور ریگزاروں میں اچھلتی، کودتی اور سسکتی دم توڑتی بڑھتی رہی ہو۔

آج سے پانچ سال پہلے میں خود اسی بستی میں رہتا تھا۔ بارش کے بعد یہ کتنی دھلی دھلی سی نظر آتی تھی اور یہاں کی نئی تعمیر شدہ سڑکیں جیسے دھرتی کی کوکھ سے نکلی ہوئی، بل کھاتی حسین دوشیزائیں، جون کی گرمیوں کے تپتے دنوں میں تو پہاڑ کے دامن میں یہ اونچی نیچی، سکڑی ہوئی زمین ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی بڑھیا کے چہرے کی جھریاں ستم ہائے زمانہ کا شکوہ کرتے وقت کچھ اور زیادہ گہری اور نمایاں ہو جاتی ہیں لیکن چاندنی راتوں میں ان ہی جھریوں پر ایک بہت ہی دلفریب سا نکھار پیدا ہو جاتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے بوڑھی سہاگن، سولہ سنگھار کئے اپنے پرانے محبوب کے انتظار میں ارمان بھرے گیت الاپ رہی ہو۔

یہ کچھ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ میرے ساتھ والا کوارٹر ایک ویڈیو آرٹسٹ خانم کے نام الاٹ کر دیا گیا اور افسر بحالیات نے خاص رسوخ سے کام لے کر اس کا قبضہ بھی بہت جلد دلوا دیا۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ طرح طرح کے شگوفے چھوڑے جانے لگے اور نت نئی افواہیں سننے میں آنے لگیں۔ لوگ خانم کے کردار کو مشکوک بتاتے تھے۔ ان دنوں نئی بستی کے ہر چوراہے پر خانم ہی موضوع سخن تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خلیل خان نے فاختائیں اڑانا چھوڑ کر لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا شروع کر دی ہوں۔

خانم کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے میرے دل میں بھی ان باتوں کی تحقیق کرنے کی جستجو پیدا ہو گیا۔ یوں میری نظر سے کوئی قابل اعتراض بات نہ گزری تھی۔ بیچاری کا مختصر سا کنبہ تھا۔ دو ضعیف ماں، باپ اور ایک خود۔ ماسوائے ان دونوں کے جب اس کا ویڈیو پروگرام ہوتا ور گھر پر ہی رہتی اور باہر چبوترے پر اپنے البمن کے سے کھیلتی رہتی لیکن جب میں اپنے کوارٹر سے باہر نکلتا تو ور برآمدے میں چلمن کے پیچھے چلی جاتی۔ یوں وہ معمولی نقشہ کی دبلی، پتلی سپاٹ سی لڑکی تھی۔ رنگ البتہ صاف تھا اور جیسا کہ مجھے بعد میں چل کر معلوم ہوا حد درجہ کی تنک مزاج اور حساس تھی۔

وہ تقسیم ہند کے بعد کا زمانہ تھا۔ کتنی ہی بستیاں ویران ہو گئی تھیں مگر اب نئی آبادیاں جنم لے رہی تھیں۔ مکانوں اور نوکریوں کی بہت ہی قلت تھی۔ زندگی ایک مسلسل اذیت بن گئی تھی اور سر چھپانے کے لئے ایک کھپریل تک کا ملنا بھی کارِ دارد تھا۔

آخر ضرورت نے ایک نئی ایجاد کو جنم دیا اور لوگوں کی مسلسل چیخ و پکار کے بعد حکومت کو نئی بستیوں کی تعمیر کا خیال آیا۔ ان ہی بستیوں میں سے ایک میں مجھے بھی سر چھپانے کے لئے کوارٹر مل گیا لیکن اگر نہ ہی ملتا تو اچھا تھا کم از کم دنیا میرے حال پر رحم تو کھاتی لیکن کوارٹر کے اندر تو میں ہی غمزدہ تھا اور میں ہی غمگسار۔ مئی جون کے مہینے تو خیر جوں توں کر کے بغیر بجلی اور پنکھوں کے پسینوں

میں تنہا تنہا کر گزار ہی دیتے مگر برسات کی راتیں میرے لئے اجیرن کی راتیں ثابت ہوئیں۔ چھتوں کا یہ عالم کہ بارش رکنے کے گھنٹوں بعد تک برستی رہتیں۔ صبح اٹھ کر جب میں آئینہ کے سامنے شیو کرنے کھڑا ہوتا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ ادھر آئینہ کے اس طرف ایک مخبوط الحواس مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹ سے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ان زخموں کی مسکراہٹ ہو جن پر نمک چھڑک دیا گیا ہو۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں زندگی سے ناامید نہ ہوا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ دور تاریکیوں کے پار مسلسل جھلملا رہی تھی۔

مجھے ساون کی وہ برستی ہوئی شام کبھی نہیں بھولتی جب خانم کے ملازم نے مجھ سے آ کر کہا۔ "چھوٹی بی بی جی آپ کو سلام کہتی ہیں اور یہ کہ آج ان کا ریڈیو پروگرام ہے۔ بارش کی وجہ سے کوئی تانگہ نہیں مل رہا اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ریڈیو سٹیشن تک ان کو اپنی کار میں چھوڑ آئیں۔" بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ میں تو ملاقات کے لئے کسی بھی موقع کا منتظر تھا۔ مگر خدا کی شان دیکھئے کہ ملاقات کا وسیلہ بھی بنا تو میری اموزا کار جس کے ہارن کے علاوہ بلا مبالغہ ہر چیز بولتی تھی اور جس کے متعلق یہ روایت تھی کہ واسکوڈے گاما اس کار کو اپنے ساتھ پرتگال سے لایا تھا اور جاتی مرتبہ بیکار سمجھ کر یہیں چھوڑ گیا تھا۔ کیا خوب کار تھی کہ اول تو چلتی ہی نہ تھی اور جب چل پڑتی تو بریکوں سے بے نیاز ہو جاتی۔ یوں بھرنے کو تو میں نے حامی بھر لی مگر دل ہی دل میں متفکر ضرور تھا۔ بہرحال اس روز کار نے میری عزت رکھ لی۔

اس شام کے بعد میں اور خانم ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔

ہر کنواری لڑکی کی طرح خانم بھی ایک ساتھی کی متلاشی تھی۔ جس کے ساتھ وہ زندگی کی طویل اور کٹھن راہیں طے کر سکتی لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کی زندگی میں جتنے بھی مرد داخل ہوئے تھے وہ اس سے پانچواں ناطہ جوڑنے کے متمنی تھے اور سنجیدگی سے اس کا ہاتھ تھامنے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ کچھ ایسے ہی پیہم تلخ تجربوں سے خانم کا دل ٹوٹ چکا تھا کہ میں اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ یہ کچھ تو خانم کی روز بروز کی بڑھتی ہوئی وابستگی نے بے زبانی کی زبان سے مجھ تک پہنچایا اور کچھ اس کی ماں کے نیم امید و بے دبے سے اشاروں نے۔

یوں خانم میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کہ ایک گھریلو بیوی میں ہونی چاہئیں۔ وہ حد درجہ کی خوددار، ہمدرد اور سلیقہ بھی ہوتی تھی اور اگر میری منگنی نہ ہو گئی ہوتی تو میں ضرور اس سے شادی کر لیتا۔ ویسے میری نظر میں محبت کوئی بے اختیاری چیز بھی نہیں یہ کسی ایک خاص ماحول میں کسی کے ساتھ وابستگی کا نام ہے اور یہ وابستگی محض اتفاقات کی پیدا کردہ ہے۔ پہلی نظر کی محبت کا کم از کم میں قائل نہیں۔ بہرحال اس سلسلے میں میں خانم کو غلط فہمی میں رکھنا نہیں چاہتا تھا نہ معلوم کیوں مجھے خانم سے بے حد ہمدردی تھی شاید اس لئے کہ اس کی حیثیت ایک ایسے مظلوم کی سی تھی جو بالکل بے یار و مددگار ہو۔

جب سے خانم میرے پڑوس میں آباد ہوئی میرے دوستوں کا دائرہ کچھ زیادہ ہی وسیع ہو گیا جن سے معمولی پہچان تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے بے تکلف قسم کے دوست بن گئے اور نئے لوگ مجھ سے متعارف ہونے کے بہانے ڈھونڈتے اور بناتے رہے۔ ایس ڈی او صاحب بھی جو پہلے مجھ سے کافی الگ الگ رہتے تھے، اپنے خلوص کا اظہار کرنے لگے۔ یوں بھی ہر محکمے کے بابو جنہوں نے اپنی فرض شناسی اور انسانی ہمدردی کا اظہار خانم کے کوارٹر سے ہی شروع کیا اور وہیں پر ختم کر لیا محکمہ بجلی کے لائن مین نے آ کر کہا کہ اس بستی میں سب سے پہلا بجلی کا کنکشن آپ کو ملے گا۔ یہ کچھ دنوں کی تکلیف ہے، اس کے لئے

معذرت چاہتا ہوں۔ محکمہ مالیات کے کلرک نے آ کر اطمینان دلایا کہ اگر کسی مہینے آپ کے پاس قسط ادا کرنے کے لئے پیسے نہ ہوں تو فکر نہ کیا کریں۔ ہم الاٹمنٹ آپ کے نام سے کینسل نہیں ہونے دیں گے۔ واٹر ورکس کے مستری نے آ کر دلاسہ دیا کہ بہت جلد ہی آپ کے ہاں پانی کا کنکشن آ جائے گا۔ دوسرے یا تیسرے ہی چکر میں یہ لوگ خانم سے گانے کی فرمائش کر دیتے اور وہ سب کو ایک ہی سا جواب دیتی کہ جب ریڈیو پر ان کا پروگرام ہو تو اس وقت سن لیں۔

بہر حال یہ تو تھا کلرک طبقے کا حال اس کے علاوہ افسران کی بھی ایک لمبی فہرست تھی جن میں سے اکثر یا تو اپنی خودی بلند ہونے کی وجہ سے یا اپنی نام نہاد پوزیشن کے خیال سے خود خانم کے کوارٹر پر نہ آ سکتے تھے ان میں افسر مالیات اسسٹنٹ ڈائریکٹر بلڈنگز ریڈیو سٹیشن، اسسٹنٹ انجینئر محکمہ بجلی، ایس ڈی او، پی ڈبلیو ڈی اور سپرنٹنڈنٹ واٹر ورکس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان سب لوگوں کی خواہش تھی کہ خانم خود ان کے دفتر میں آئے۔ اس کے لئے یہ لوگ اپنے دائرہ اختیار کے بل بوتے پر پوری کوشش کرتے رہے۔ مثلاً خانم نے اپنے کوارٹر کے باہر سڑک کے ساتھ پھولوں کی ایک کیاری بنا رکھی تھی۔ اس پر ایس ڈی او صاحب اپنے روڈ انسپکٹر پر بہت بگڑے کہ اس نے سڑک پر تجاوز کیوں ہونے دیا۔ آج لوگوں نے کیاریاں بنائی ہیں کل کچھ اور بنا بیٹھیں گے۔ اس غریب نے عرض کی۔ "جناب! میں ابھی جا کر کیاریاں برابر کروائے دیتا ہوں"۔

اس پر وہ اور بھی گرجے۔

"کوئی مذاق تھوڑی ہے لوگ دعوے کر بیٹھیں گے تو عدالت کی پیشیاں کون بھگتے گا۔ جا کر سب لوگوں کو نوٹس دو اور کہو کہ جس جس نے نام کوارٹر الاٹ ہیں وہ مجھ سے آ کر ملیں ورنہ تجاوز بے جا کے سلسلے میں سب کے خلاف کیس بنا دیئے جائیں گے اور انہیں تاوان دینا پڑے گا"۔

یہ کچھ کہلوا کر وہ اطمینان سے دفتر میں بیٹھ کر خانم کا انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے گشت پر نکلنا بھی بند کر دیا۔ بس ہر وقت خیالی پلاؤ پکاتے رہتے۔ خانم آئے گی تو اس پر رعب ڈالوں گا پھر نرم پڑ جاؤں گا اور پھول لگانے رکھنے کی اجازت دے دوں گا۔ بعد میں اسے چائے بھی پلواؤں گا، وغیرہ وغیرہ۔

ادھر سپرنٹنڈنٹ واٹر ورکس نے بھی اپنی طرف سے کسر اٹھا نہ رکھی۔

خانم کے کوارٹر والی لائن میں دو دن پانی کا کنکشن نہ دیا تاکہ وہ خود آ کر ان کی منت سماجت کرے لیکن وہ بھی بڑی ہی خوددار لڑکی تھی ان سے اس قسم کی امید کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف تھا۔

سپرنٹنڈنٹ واٹر ورکس بھی ایک نرالی شخصیت کے مالک تھے یوں تو ٹھگنے تو تھے ہی مگر پیٹ تو اتنا باہر نکلا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پیٹ میں تربوز لٹکے چلے جا رہے ہیں۔

خانم کے کوارٹر کے نزدیک پی ڈبلیو ڈی نے تعمیری کاموں کے لئے ایک تالاب بنایا ہوا تھا اور اسے بھرنے کے لئے وہاں ایک نلکا بھی لگا ہوا تھا اسی نلکے سے خانم گھر کے لئے پانی منگوانے لگی بلکہ کبھی کبھی تو گرمیوں کی سنسان دوپہر میں خود بھی چھوٹی سی بالٹی لے کر اپنے ملازم کے ساتھ پانی بھرنے نکل پڑتی اور میں دل ہی دل میں اس لڑکی کے گھریلو پن کی داد دیتا۔

ایس ڈی او اور سپرنٹنڈنٹ واٹر ورکس کو اپنے اپنے اختیارات پر بڑا مان تھا۔ ایس ڈی او صاحب کہتے۔

"ارے تم کو معلوم نہیں کہ خانم کو پھول کتنے پیارے ہیں جب سے ان کو یہ نوٹس دیا گیا ہے۔ پھلواری اجڑ دی جائے گی تو بس یوں سمجھو کہ خود ہی

ہو گی۔ اب کسی دن، کسی گھڑی بھی وہ میرے دفتر میں آ جائے گی"۔

اور موٹو سپرنٹنڈنٹ کہتا۔

"بچو! پانی کی مار بڑی مار ہے بھلا پھولوں کی مار بھی کوئی مار ہوتی ہے"۔

"ابے موٹے! کوئی کسی کا پانی بند نہیں کر سکتا۔ آخر بہشتی مر تھوڑے گئے ہیں۔ دو روپے ماہوار پر کوئی بھی بہشتی آ سکتا ہے۔ مگر پھلواری تو میری مرضی کے بغیر کسی صورت بھی برقرار نہیں رہ سکتی"۔ ایس ڈی او صاحب اپنی فوقیت جتاتے۔

"پھولوں کی بھی کوئی قیمت ہے، دو آنے میں پھول ہی پھول"۔ سپرنٹنڈنٹ تحقیر آمیز لہجہ میں جواب دیتا۔

"ارے تو کتنا نادان ہے۔ تیری عقل تو تجھ سے بھی زیادہ موٹی ہے"۔ ایس ڈی او افسوس اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہتا۔ "یوں تو آج کل آدمی کی بھی کوئی قیمت نہیں بیس روپے ماہوار پر جیسا آدمی چاہے رکھ لو لیکن آج اگر تجھے مار دیا جائے اور تیری ماں کو دس آدمی خرید کر لا دیئے جائیں تو کیا وہ خوش ہو جائے گی؟"

الغرض یہ دونوں ایک دوسرے پر اپنے اختیارات کا سکہ جمانے کے لئے گھنٹوں بحث کرتے اور اکثر تو تو میں میں پر اتر آتے۔

آخر ایک روز جوش میں آ کر انہوں نے سو سو روپے کی شرط لگالی کہ خانم جس کے دفتر میں پہلے آ جائے وہ شرط جیت جائے گا۔

اس کے بعد دونوں نے اپنی اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ ایس ڈی او نے پھر اپنا وڈ انسپکٹر خانم کے گھر بھیجا کہ اگر آپ تین دن کے اندر اندر اس پھلواری کے لئے ایس ڈی او صاحب سے اجازت نامہ نہ لائیں تو میں یہ اکھاڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

موٹے نے اپنے مستری کو بلا کر کہا کہ اسٹور کے پاس والا تالاب تعمیری کاموں کے لئے بنایا گیا تھا اور اب کیونکہ تعمیر کا کام ختم ہو چکا ہے اس لئے اس کا نلکا بند کر دو۔

جب پانی بند کئے کئی روز ہو گئے اور دفتر میں کوئی نہ آیا تو سپرنٹنڈنٹ نے پھر چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ خانم کا نوکر واٹر ورکس کی ٹنکی سے جو کہ نزدیک ہی تھی پانی بھر لاتا ہے۔ انہوں نے فوراً ہی سپروائزر کو بلا کر بڑی ہی زبردست قسم کی جھاڑ پلائی کہ خبردار! اگر آئندہ کسی کو ٹنکی سے پانی بھرنے دیا تو تمہیں نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ان کے ایسا کرنے سے یہ ضرور ہوا کہ خانم کا ضعیف باپ لکڑی ٹیکتا ہوا ان کے پاس آ گیا مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ان کے پاس آ چکا تھا۔ اس بار سپرنٹنڈنٹ نے قطعی طور پر اسے بتا دیا کہ اس سلسلے میں اس کے پاس لالی کو خود آنا چاہئے۔

بڑے میاں نے احتجاج کیا۔ "جناب! وہ کوارٹر میری لڑکی کے نام الاٹ ہے کم از کم عورتوں کے ساتھ تو یہ رعایت ہونی چاہئے کہ ان پر دفتر آنے کی پابندی عائد نہ کی جائے"۔

موٹے سپرنٹنڈنٹ نے بڑے ہی سنجیدہ ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "یہ رعایت صرف پردہ نشین عورتوں کو دی گئی ہے اگر آپ کی صاحبزادی پردہ کرتی ہوں تو بے شک آپ کے نام مختار نامہ بنوا دیں جس پر کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی تصدیق ہو۔ دراصل آپ تو معاملہ کی نوعیت کو سمجھتے ہی نہیں۔ میں واقعی بالکل مجبور ہوں۔ اوپر سے ہدایت ہی ایسی آئی ہوئی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ کسی ملازم نے جھوٹے منہ بھی کہا تو میں نے کنکشن دے دیا۔ مگر جب سے کچھ لوگوں نے پانی کے بل دینے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ انہوں نے تو کل

لگوانے کے لئے درخواست ہی نہیں دی، جب سے یہ سختی اختیار کرلی پڑی۔ ویسے بھی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ آپ کے کوارٹروالی لائن ابھی مکمل نہیں ہوئی اور یوں میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک اس لائن کے سارے الاٹی آ کر میرے دفتر میں ایگریمنٹ فارم پر دستخط نہ کر جائیں گے میں اس لائن کو مکمل ہی نہیں کرواؤں گا''۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے میاں اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ نہ معلوم انہوں نے خانم کو دفتر جانے کے متعلق کہا یا نہیں۔ بہرحال وہ دفتر نہیں گئی اور دوسرے ہی روز اس کے ہاں پانی بھرنے کے لئے سقہ رکھ لیا گیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن خانم نے اس سلسلے میں مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ غالباً اس کی بردبار طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا ہو۔ کچھ اپنی اسی خودداری کے سبب وہ فلمی دنیا میں بھی کامیاب نہ ہو سکی ورنہ اسے کئی فلموں میں بیک گانوں کی پیشکش ہو چکی تھی۔

یوں پانی کی مجھے بھی سخت تکلیف تھی اور میں نے پانی بھرنے کے لئے ایک سقہ لگا رکھا تھا جو پرانی منیجز کے کنوئیں سے پانی لاتا تھا جو کھاری ہونے کے ساتھ ساتھ بھاری بھی تھا۔

ایک مرتبہ میں نے بھی سپرنٹنڈنٹ سے پانی کے کنکشن کے لئے کہا تھا مگر مجھے اس نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر کنکشن لینا چاہتے ہو تو خانم کو ہمارے دفتر میں بھیج دو ورنہ ان کوارٹروں کی لائن ہی مکمل نہیں ہو گی کیونکہ سوٹا میرا دوست تھا اس لئے میں نے اس کی شکایت کرنی مناسب نہ سمجھی اور نہ ہی دوبارہ اس سے درخواست کی۔

ادھر ایس ڈی او صاحب بھی جب دھمکیاں دیتے دیتے تھک گئے تو انہوں نے ناامید ہو کر آخر ایک دن خانم کے کوارٹر کے سامنے لگی ہوئی کیاریاں برابر کروا دیں۔

اس کے علاوہ اور افسران بھی اپنے اپنے اختیارات بروئے کار لائے مگر انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔

ایک دن میرے ایک دوست نے ایک ریڈیو انجینئر سے میرا تعارف کروایا۔ ایسے ہی خانم کا ذکر چل نکلا۔ میں نے پوچھا۔

''آپ کی تو خانم سے اچھی خاصی واقفیت ہوگی''۔

''اچھی خاصی واقفیت!'' انہوں نے طنزاً کہا۔ ''ارے وہ تو یہاں منتقل ہونے سے پہلے میرے مکان کی نچلی منزل میں رہتی تھی۔ ویسے بھی یہ آرٹسٹ لوگ مجھ سے بنا کر ہی رکھتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ان کے پروگرام نشر ہوتے وقت ٹرانس میٹر میں کچھ گڑبڑ کر دوں''۔

''پھر آپ جا کر خانم سے مل آئیں''۔ میں نے تجویز کیا۔

''لیکن آج کل وہ مجھ سے ناراض ہے''۔ انجینئر صاحب نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' میں سراپا سوال بن گیا۔

''بس یونہی، کچھ تو وہ لڑکی ہی بہت گہری قسم کی ہے اور کچھ میں نے اس کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔ یوں بھی اس کا مجھ جیسے کسی معمولی آدمی کا روگ نہیں''۔

''بے چاری! مجھے تو اس سے بے انتہا ہمدردی ہے''۔ میں کچھ جذباتی سا ہو گیا۔

''ہمدردی!'' انجینئر صاحب جیسے چونک پڑے۔ ''پھر آپ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''بس یہی ممکن نہیں، ورنہ میں اس کے لئے کیا کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں''۔

''پھر تو آپ کی ہمدردی خانم کے لئے بے معنی ہے اور یہ کیا کچھ کرنے کی تمنا بیکار۔ میاں آج کل تو وہ کسی اچھے سے خاوند کی تلاش میں ہے''۔ انجینئر صاحب نے

اپنا حتمی فیصلہ سنا یا۔

اس کے بعد انجینئر صاحب میرے کوارٹر سے نکل کر خانم کے کوارٹر کے سامنے ٹہلنے لگے لیکن ابھی انہوں نے تین چار ہی چکر لگائے تھے کہ اندر سے خانم کا کتا بھونکتا ہوا باہر آ گیا اس کو دیکھتے ہی ان کا منہ فق ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کتے سے ان کی کوئی ناخوشگوار یاد وابستہ ہو۔ انہوں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور چل دیئے۔ کتے کی آواز البتہ دیر تک ان کا پیچھا کرتی رہی۔

ایک شام خانم کا ملازم میرے پاس آ یا اور کہنے لگا۔ ''بڑی بی بی جی آپ کو بلاتی ہیں''۔ گیا تو خانم کی والدہ نے متفکر انداز میں کہا۔ ''نہ معلوم بٹیا کو کیا ہو گیا ہے۔ صبح سے تکیے میں منہ دیئے رو رہی ہے۔ کھانا پانی بھی کچھ نہیں''۔

میں خانم کے کمرے میں گیا تو اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بڑی بے بسی سے دیکھا اور پھر تکیے میں منہ چھپا لیا۔ میں نے کہا۔

''خانم! بھلا بہنیں بھائیوں سے بھی اپنا دکھ درد چھپاتی ہیں''۔ اور پھر میں اس کے پریشان بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

خانم نے کوئی جواب نہ دیا اور تکیے کے نیچے سے ایک پرچہ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔

یہ افسر بحالیات کی طرف سے نوٹس تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اس نوٹس کے ملنے کے تین دن کے اندر اندر پانچ سو روپے کی قسط جمع نہ کرائی گئی تو الاٹمنٹ کینسل کر دی جائے گی۔

''اوے، بس اتنی سی بات''۔ میں نے خانم کو دلاسا دیا۔ ''یہ پیسے کل ہی جمع ہو جائیں گے تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اب اٹھو، منہ ہاتھ دھو ڈالو''۔

خانم کی وہ معصوم اور تشکر آمیز نظریں مجھے اب تک یاد ہیں۔

اس طرح روتے ہوئے میں نے خانم کو پہلی بار دیکھا تھا اور نہ ایسا تو اکثر ہوا کہ کچھ مغموم سی جیتی کسی انجانی سوچ میں غرق ہے اور میں نے ہمدردی کے دو بول کہے اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور پھر دیر تک اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

کبھی کبھی تو وہ ڈوبے ہوئے انداز میں کہتی۔

''بھیا! اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا''۔ اور میں بھی خانم کی مدد کر کے ایک گونہ تسکین محسوس کرتا۔

ایک دن جب خانم آزردہ خاطر بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی میں نے یونہی اس کا دل بہلانے کے لئے کہا۔

''بستی میں اب تو کافی چہل پہل ہو گئی ہے اور آج رات چاند بھی پورا ہے۔ ٹہلنے میں بڑا لطف آئے گا''۔

لیکن اس روز خانم پر قنوطیت کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا اس نے کھسیانی سی ہنس کر جواب دیا۔ ''یوں بستی تو آباد ہو چلی ہے پر کچھ میرا دل بجھتا جا رہا ہے جیسے میں ایک شمع ہوں جو خاموش ہوا چاہتی ہو یا ایک ایسا تارہ ہوں جو ٹوٹ چکا ہو جس کا تعلق چاندنی راتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا ہو اور یوں لوگوں کو تارے کے ٹوٹنے اور بے نور ہو جانے سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو اپنی ذات کے سبب تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گئے ہوں کہ کہیں تارے کا ٹوٹنا ان کے لئے منحوس ثابت نہ ہو''۔

میں خانم کی ڈھارس بندھانے کی حتی المقدور کوشش کرتا مگر زندگی سے مفر ناگزیر تھا اور اس کی بڑھتی ہوئی مشکلات روز بروز نت نئی نفسیاتی الجھنوں کو جنم دے رہی تھیں۔

پھر میں نے اپنے ملک کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ بحرین میں تیل کی ایک کمپنی نے مجھے معقول تنخواہ کی

پچکچاہٹ کی تھی۔ جانے سے پہلے جب میں خانم سے ملنے گیا تو وہ کتنا روئی تھی، وہ منظر مجھے جب بھی یاد آتا ہے دل بھر آتا ہے۔ میں جو گھر بھر میں سنگدل مشہور ہوں اس روز رونے بنا نہ رہ سکا تھا۔

دو سال تک خانم سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا بلکہ گاہے گاہے میں اسے کچھ روپے بھی ارسال کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ میری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ازلی خوطینت عود کر آئی تھی۔ اس کے اکثر خطوط میں زمانہ کی بے مروتی کا رونا رویا ہوتا تھا اور یہ کسی حد تک تھا بھی ٹھیک۔ یوں بھی سر کا بوجھ تو سب ہی بانٹ لیتے ہیں لیکن دل کا بوجھ بانٹنے والا شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔

پھر یکایک کچھ ہوا کہ خانم مجھ سے ناراض ہو گئی اور مجھے اسے منانے کے لئے یہاں آنا پڑا۔ دراصل ہوا یہ کہ میں کمپنی کے کام سے مشرقِ وسطیٰ کے ایک طویل دورے پر نکلا ہوا تھا۔ میری غیر حاضری میں خانم کا تار آیا۔ اسے اپنے والد کے علاج کے لئے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔

دورے سے واپسی پر جب مجھے یہ تار ملا تو میں نے فوراً روپے ارسال کئے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ بغرض سے میری طویل غیر حاضری اس تاخیر کا باعث ہوئی لیکن یہ روپے مجھے شکریہ کے ساتھ واپس مل گئے اور ساتھ خانم کا خط کہ اب روپوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میاں جی کو اب شکر آنے لگی ہے اور انہیں ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔

اس کے بعد جب بھی میں نے خانم کو کوئی چیز بھیجی وہ دوسری ہی ڈاک سے واپس آ گئی۔ شاید وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔

اب میرا تانگہ نئی بستی کے قریب پہنچ گیا تھا اور جوں جوں نئی بستی نزدیک آتی جاتی تھی میرا اشتیاق اسی قدر بڑھتا جاتا تھا۔

نئی بستی میں پہنچ کر مجھے کچھ عجب سا اپنائیت کا احساس ہوا۔ یہاں اب آبادی دریا کی سبز چمکتی موجوں کی طرح کلبلا رہی تھی۔ خانم کے کوارٹر کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی اس کے سامنے پھلواری پھر سے لگ گئی تھی جس کے ساتھ ہی ایک کار کھڑی تھی۔ باہر کے رُخ ایک کمرے کا اضافہ ہو گیا تھا جس میں سے مدھم روشنی کے ساتھ ساتھ خانم کے گانے کی آواز باہر آ رہی تھی۔

”بابو جی! آپ جلدی ہی آ گئے“۔ تانگے والے نے دانت نکوس کر کہا۔

میں نے تھرا کر دونظروں سے گھورا اور پھر نیچے اتر کر دروازے پر دستک دینے لگا۔

دروازہ کھلنے پر میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اندر سے ایک لمبی لمبی مونچھوں والا پٹھان باہر آیا اور کہنے لگا۔

”خو آج بائی جی کسی سے نہیں مل سکتی، وہ صبح کے ساتھ مصروف ہے“۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں شدتِ احساس کے باعث لرز اٹھا۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا اور میں نے تیزی سے مڑ کر اپنے آپ کو تانگے میں ڈال دیا۔

اور جب تانگہ واپس ہو رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خانم کے لب ہنس رہے ہوں اور دل رو رہا ہو۔ جیسے تارو ٹوٹ چکا ہو جیسے بوڑھی دھرتی کا سہاگ لٹ گیا ہو اور اس کی کوکھ سے نکلی ہوئی دوشیزہ کسبیاں بن گئی ہوں اور جیسے نئی بستی کے گھر گھر ناسور پھوٹ پڑے ہوں، انسانیت سوز ناسور، جن پر آج تک کسی نے پھایا نہیں رکھا۔

اور جیسے خانم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے بھائی سے روٹھ گئی ہو۔

◆✻◆

افسانہ

وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ انسان سے بہتر تو یہ جنگلی جانور ہیں جو وحشی کہلائے جاتے ہیں پھر بھی حیوانیت کا مظاہرہ نہیں کرتے انسان کی طرح۔

☆ .... دیپک کنول - بھارت

متھرا داس بھدرواہ کے ہانکا علاقے کے نوری گاؤں کا باسی تھا۔ فطرت سے بڑا کمینہ تھا۔ تھا تو وہ پیشہ ور مداری مگر امیر بننے کی لگن میں وہ اپنے پیشے کو چھوڑ کر ایسے اُلٹے سیدھے کام کرنے لگا جو اُس کے شایانِ شان نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں نا "جس نے اتاری لوئی اُس کا کیا کرے گا کوئی"۔ حیا شرم تو وہ بیچ کے کھا گیا تھا۔ اُس پر تو بس دولت مند بننے کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ایمانداری کے راستے

سے کوئی جھٹ پٹ دولتمند نہیں بن سکتا۔ ڈھیر سارا پیسہ کالی کمائی سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور کالے دھندے کے لئے بے ایمان بننا بہت ضروری ہے۔

متھراداس تو پیدائشی بے ایمان تھا۔ چونکہ وہ جنگلوں کے بیچوں بیچ رہتا تھا اس لئے اس نے انہی جنگلوں کو لوٹنا شروع کیا۔ سال چھ مہینے اس کی سمگلنگ کا دھندہ زور شور سے چلتا رہا۔ اس نے اس غیر قانونی دھندے سے خوب مال کمایا۔ ایک دن قسمت نے پلٹا کھایا۔ کسی آدمی نے پولیس میں اس کے خلاف شکایت درج کرائی۔ اس کے گھر پر چھاپہ پڑا اور گھر سے درجنوں شہتیریں برآمد ہوئیں۔ گھر کی تلاشی لینے کے بہانے جتنی بھی نقدی گھر میں پڑی تھی اس پر پولیس والوں نے ہاتھ صاف کر لیا۔ متھراداس ایک جھٹکے میں کنگال ہو گیا۔

متھراداس چھ مہینے جیل میں پڑا رہا۔ ان چھ مہینوں میں اس کی حالت ایسی خستہ ہو گئی کہ وہ پائی پائی کا محتاج ہو کے رہ گیا۔ ایک طرف قید و بند کی صعوبتیں تو دوسری طرف پولیس والوں کی داداگیری۔ پولیس والوں کے منہ کو جب کسی انسان کا خون لگ جاتا ہے تو وہ بہانے بہانے سے جونک بن کر اس کا خون چوستے رہتے ہیں۔ متھراداس نے جتنی بھی کالی کمائی کی تھی ایک تو وہ چلی گئی اور اوپر سے اپنی تھوڑی بہت جائیداد بیچ کر وہ پولیس اور وکیلوں کی منہ بھرائی کرتا رہا۔ کہنے والے سچ ہی کہہ گئے ہیں کہ کنویں کی مٹی کنویں کو ہی لگتی ہے۔ متھراداس دولت مند بننے کی سنک میں جو کمایا اصل بھی ہار بیٹھا۔ اتنا بڑا ٹوٹا پڑنے کے بعد اس نے کھوٹا دھندہ کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔ چھ مہینے کی سزا پوری کرنے کے بعد وہ بھدرواہ کے علاقے سے ایسے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اس نے پورے چھ مہینے جموں میں جا کر گزارے۔ وہ اپنے گاؤں اور پولیس کے رویے سے اتنا عاجز آ چکا تھا کہ شہر میں رہ کر وہ بھوکا رہا لیکن [illegible] مگر اپنے گاؤں تبھی لوٹا جب اسے خبر ملی کہ جو پولیس والے اسے ہراساں کرنے آتے تھے ان کا پتا صاف ہو گیا تھا۔ گاؤں لوٹ کر کچھ روز تو وہ یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بار پھر اپنے خاندانی پیشے کو اپنا لے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ جانور کا بندوبست کہاں سے کیا جائے۔ جانور کے بنا مداری ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے کے بنا تانگہ۔ مداری کو نچانے کے لئے کوئی نہ کوئی جانور چاہئے تبھی وہ اپنا کھیل تماشا دکھا سکتا ہے۔ برسوں پہلے اس نے ایک بھالو خریدا تھا جس کی ناک میں نکیل ڈال کر وہ اسے گاؤں گاؤں نچاتا تھا۔ جب سے وہ مر گیا تھا متھراداس کا جی اس کام سے اٹھ گیا تھا۔ اب جب کہ اسے کوئی من پسند کام مل نہیں پا رہا تھا تو اس نے ایک بار پھر ڈگڈگی بجانے کا فیصلہ کیا تھا مگر بات جانور پر جا کے اٹک گئی تھی۔ جانور کو خریدنے کے لئے پیسے درکار تھے۔ اس کی حالت تو ایسی تھی کہ زہر کھانے کے لئے بھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ایسے میں بھی کیا نہائے کیا نچوڑے۔

آخرکار کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی بندر کے بچے کو پکڑ کر اسے اس طرح سدھا لے گا کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچنے لگے گا۔ اس کام میں اسے بلا کی مہارت حاصل تھی۔ اس علاقے میں کافی تعداد میں بندر موجود تھے جو کہ مضافات کے جنگل میں رہتے تھے۔ متھراداس تو اس جنگل کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے ایک دن بیچ جنگل میں پھندا لگا لیا اور خود ایک تناور درخت کی آڑ میں ٹکٹکی لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی مراد جلدی پوری ہو گئی۔ ایک بندر کا بچہ اس پھندے میں جا کر پھنس گیا اس کا شور و غل سن کر سارے بندر اس کی مدد کے لئے دوڑ کے آ گئے مگر کوئی اسے اس پھندے سے آزاد نہ کرا سکا۔ متھراداس نے بندروں کے

اس جتھے کو بھگانے کے لئے ایک پٹاخہ چھوڑ دیا۔ سارے بندر ڈر کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ متھرا داس بندر کو پھندے سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔

اس نے اس بندر کے بچے کا نام بالم رکھ دیا۔ اُسے سدھانے میں اُس نے اُس غریب پر اتنے مظالم ڈھائے کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ تین مہینے تک اُس نے اس بندر کو رسیوں سے باندھ کر رکھا۔ وہ اُسے بہت مارتا پیٹتا تھا اور کھانے کو بھی بہت کم دیتا تھا۔ وہ اس غریب جانور پر ہر طرح کے ستم ڈھاتا رہا۔ بڑی دیر کے بعد بالم کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر اُسے زندہ رہنا ہے تو اُسے متھرا داس کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ وہ تیزی سے متھرا داس کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ متھرا داس کی طرح بولنے کی بھی کوشش کرنے لگا۔ بہت جلد اس نے بھدی بھدی گالیاں سیکھ لیں جو متھرا داس اُسے سکھاتے سکھاتے دیئے جایا کرتا تھا۔ بندر انسان کی طرح بول سکتا ہے ایسی دیدنی نہ شنیدنی تھی مگر متھرا داس نے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا۔

ایک سال کے اندر وہ اتنا ماہر ہو گیا کہ متھرا داس جو بھی اشارہ کرتا تھا تو وہ کبھی شرابی بن جاتا تھا، کبھی بے رحم شوہر تو کبھی تھانیدار۔ تھانیدار بنتے ہوئے جب متھرا داس اُسے گالی دینے کے لئے کہتا تھا تو وہ ایسی دشنام طرازی پر اُتر آتا تھا کہ شریف شرفا کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیتے تھے۔ پر جو اس بندر کو انسان کی طرح گالیاں دیتے ہوئے دیکھتے تھے وہ سراپا حیرت بن کر کھڑے رہتے تھے اور پھر وہ بالم کی اس ادا پر واری واری جاتے تھے اور اُس پر سکوں کی بارش کر دیتے تھے۔ بالم نے متھرا داس کا دلدر دور کر دیا تھا۔ اب تو اس کے پو بارہ ہو گئے تھے۔ رات کو جب وہ گھر لوٹتا تھا تو اس کی جیبیں سکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ کھاتا بھلے ہی بھول جائے۔ پر وہ ٹھرے کی بوتل لینا نہیں بھولتا تھا۔ وہ ٹھرے کا عادی تھا۔ رات کو ٹھرے کے بنا اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے بالم کی بھی عادت بگاڑ دی تھی۔ جب وہ مستی میں آ جاتا تھا تو وہ زبردستی اس کے منہ سے ٹھرے کی بوتل لگا لیتا تھا۔ بالم کو گھونٹا دو گھونٹا اس زہر کو اپنے گلے سے اتارنا پڑتا تھا۔ دھیرے دھیرے اُسے بھی شراب کا چسکا لگ گیا۔ جس دن اُسے پینے کو نہیں ملتی تھی وہ بے چین ہو جاتا تھا اور رات بھر اودھم مچاتا رہتا تھا۔ وہ متھرا داس پر غراتا تھا، گھر کا سامان اکھاڑ پچھاڑ کے رکھ دیتا تھا اور تو اور وہ اپنا نزلہ راہ چلتے لوگوں پر اتارتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بالم نے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں نکالے۔ وہ جوانی سے ایک دم قریب ہو گیا۔ متھرا داس کو اس کا بڑھتا ہوا ڈیل ڈول دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا اس لئے وہ اسے پل بھر کے لئے بھی کھلا نہیں چھوڑتا تھا۔ بالم بھی اس طوقِ غلامی کو پھینک دینا چاہتا تھا۔ وہ اس شکنجے سے آزاد ہونا چاہتا تھا مگر اس کے فرار کے سبھی راستے مسدود کر دیئے گئے تھے۔ متھرا داس ہر دم اس پر عقابی نظریں جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں اس کا اس کے چنگل سے خلاصی پانا کارِ دارد والا معاملہ تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ متھرا داس نے صبح سے پینی شروع کر دی تھی۔ رات گئے تھک کر وہ نشے میں اتنا بے سدھ ہو گیا کہ وہ بالم کو باندھنے کی جگہ کھلا چھوڑ گیا۔ بالم کو اپنی آزادی کا پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ جب اس نے کمرے میں کود کرنے لگانے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ وہ بہت دیر تک کمرے میں یونہی کود کرتے مارتا رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں سے چھو منتر ہو جاتا اس نے متھرا داس پر ایک نظر ڈالی۔ اسے وہ سارے ظلم و ستم یاد آنے جو اس نے اس پر روا رکھے تھے۔ اس کی ساری کراہت اور نفرت عود کر آئی۔ متھرا داس ایک زندہ لاش کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ اپنی جھنجھل اتارنے کے لئے وہ اس کی چھاتی پر سوار ہوا اور اس نے اس کے سارے بال نوچ

لئے۔ اس کے بعد وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ اتنی ساری اذیت کے بعد ٹھکرا داس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔ بالم کو اس پر ذرا رحم نہ آیا۔ وہ تب تک اسے اذیت پہنچاتا رہا جب تک اس کے من کی آگ کچھ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کھڑکی سے چھلانگ ماری اور پھر یہ جا وہ جا۔ ٹھکرا داس لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر بہت دیر تک پڑا تڑپتا رہا۔

بالم اپنے علاقے کو بھولا نہیں تھا۔ وہ سیدھے نوری کے جنگل میں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر بندروں کا غول ایک جتھہ بنا کر اس کے گرد گھیرا ڈال کر اودھم مچانے لگے۔ اس گروہ کا مکھیا جو سب سے پیش پیش تھا اسے بالم کی موجودگی منظور نہیں تھی۔ بالم سمجھ گیا کہ اب اس جنگل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تاہم وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انسانوں کے ساتھ اتنے سال رہ چکا تھا۔ مکر و فریب، چھل کپٹ، جھوٹ اور مکاری، بیان بازیاں اور شعبدہ بازیاں، خوشامد پرستی اور دروغ گوئی یہ ساری چیزیں وہ انسانوں سے اچھی طرح سیکھ چکا تھا اس لئے اس نے مکھیا کے سامنے سر خم کیا اور اس کی شان میں قصیدے پڑھنے لگا۔ مکھیا اپنی تعریفیں سن کر مارے خوشی کے کپا ہو گیا۔ بالم کی چرب زبانی کام کر گئی۔ مکھیا نے بالم کو اپنے جتھے میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اگلے چند ہفتوں میں بالم نے وہ سارے جوڑ توڑ استعمال کئے جن میں ہمارے سیاستدانوں کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ بالم نے سب سے پہلے ماداؤں کو اپنے بس میں کر لیا اور اس کے بعد جتنے بھی جوان نر تھے انہیں بھی شیشے میں اتار لیا۔ مکھیا اب اکیلا رہ گیا تھا۔ بالم نے مکھیا پر ہلہ بول دیا۔ مکھیا اس اچانک یلغار سے پہلے تو ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے گروہ نے اس سے بغاوت کر دی ہے تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ اکیلے اتنے سارے بندروں کے ساتھ لڑ نہیں سکتا تھا اس لئے اس نے اپنی ہار تسلیم کی اور وہ اس علاقے کو بھاری من سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔

اب بالم اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہ آزادی پانے کے بعد بڑا جارح اور بے رحم بن گیا تھا۔ انسان کا نام سن کر اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ وہ انسان سے بے انتہا نفرت کرتا تھا۔ اس کے دل کی کدورت کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس نے اس علاقے میں ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ دن کو بھی یہاں سے کسی آدمی کا گزرنا محال ہو گیا تھا۔ اس نے کئی آدمیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ انسان کو دیکھتے ہی لال بھبھوکا ہو جاتا تھا۔ بالم وہ سارے ظلم و ستم بھول نہیں پایا تھا جو ٹھکرا داس نے اس پر ڈھائے تھے۔ وہ ان سارے مظالم کا بدلہ ایک ایک انسان سے لینا چاہتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ نورپور گاؤں کا ایک نوجوان البنو لال بھدرواہ سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جنگل کے راستے سے جانا جان جوکھم کا کام ہے وہ پھر بھی ہمت کر کے اسی راستے چل پڑا۔ جونہی وہ جنگل کے بیچوں بیچ پہنچا سارے بندر ایک ساتھ درختوں سے نکل کر اودھم مچانے لگے۔

بالم بھی ایک پیڑ سے اتر کے نیچے آیا اور پھر البنو لال کی طرف دیکھ کر غرانے لگا۔ البنو کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر بالم کو شانت کرنے کی کوشش کی پر بالم کا غصہ شانت ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ اس کی موجودگی سے بھڑک رہا تھا۔

"جی کرتا ہے کہ میں تم پر ٹوٹ کر تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔ آخر تم نے میرے علاقے میں پاؤں رکھنے کی جرأت کیسے کی؟"

"میری ماں بیمار ہے۔ میں اس کی دوائی لینے کے لئے شہر گیا تھا۔ آنے میں دیر ہو گئی اس لئے اس راستے سے مجھے لوٹنا پڑا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں

دوبارہ اس راستے پر قدم نہیں رکھوں گا۔ اس بار مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو"۔

"نہیں کبھی نہیں، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ سچ کہوں تو میں انسانوں سے پہلے بھی نفرت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا کیونکہ تم انسان جتنے شاطر ہو اتنے ہی کمینے اور احسان فراموش ہو۔ مجھے تم انسانوں سے گھن آتی ہے۔ کیونکہ تم خودغرض اور مطلب پرست ہو۔ جب مشکل میں پھنستے ہو تو اپنے مالک کو یاد کرنے لگتے ہو۔ جب مطلب نکل گیا تو اپنے خدا کو بھی بھول جاتے ہو۔ میں تم انسانوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تیار ہو جاؤ مرنے کے لئے"۔

"مجھے ذرا اگر تمہارا قصاص پورا ہوتا ہے تو بے شک مجھے مار ڈالو۔ مگر مرنے سے پہلے میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں" نایاب کے ابشور نے ہمت جتا کے پوچھا۔

"پوچھ کیا پوچھنا ہے؟" بالو نے غرا کے پوچھا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم سب پہلے بندر ہی بن کر اس دنیا میں آئے تھے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے کہ ہم سب بندر بن کر ہی اس دنیا میں آئے تھے۔ ہم بے وقوف تھے ہم سوتے رہے جبکہ تم بڑے سیانے نکلے تم نے چار ٹانگوں کی جگہ دو ٹانگوں سے چلنا شروع کیا۔ تم اونچی اڑان بھرنا چاہتے تھے۔ اس دنیا پر قابض ہونا چاہتے تھے اس لئے تم نے اپنے آپ کو بدلنا شروع کیا مگر اس بدلاؤ میں تم اتنے بے رحم سفاک اور خودغرض بن گئے کہ تم اپنی اصلیت ہی بھلا بیٹھے"۔

"جسے تم سفاکی اور خودغرضی کہتے ہو وہ اصل میں ہمارے ارتقا کی شروعات تھی۔ ہم نے ذہن کے دریچے کھول دیے اور ہم آگے بڑھے جب کہ تم نے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ بہادر ہونا تم اس جنگل کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لئے اس جنگل میں رہ کر تم نرے بندر کے بندر ہی رہ گئے۔ ایک بے جان گنوار اور غیر مہذب جبکہ ہم نے انسان بن کر ترقی کی معراج کو چھو لیا"۔

"اچھا ہوا کہ ہم بندر کے بندر ہی رہے۔ تمہاری طرح مہذب نہیں بنے تمہاری تہذیب نے تمہیں اتنا تو بھی بتا دیا کہ تم نے انہی جنگلوں کو کاٹنا شروع کیا جن کی آغوش میں تمہاری پرورش ہوئی تھی۔ جنہیں تم اپنے بھائی کہتے رہے تم نے ان ہی بھائیوں سے ان کی زمینیں چھین لیں۔ انہیں گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کیا۔ جہاں ہم نے اپنا رین بسیرا بنایا تھا تم نے ان ہی بستیوں کا رخ کیا تو تم نے ہمیں بے دردی سے مارا پیٹا۔ ہمارے بچوں کی جان لی۔ تم اپنے آپ کو مہذب کہتے رہے پھر بھی دوسروں کا حق مارتے رہے۔ اس کے الٹ ہمیں دیکھو، ہم جنگل میں رہے تو ہم نے ان جنگلوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ہم نے پھل پتوں سے اپنی بھوک مٹائی مگر کسی کی روزی نہیں چھینی، کسی کو گزند نہیں پہنچایا، کسی کا حق نہیں مارا"۔

"تم کاہل تھے اس لئے تم انہی جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ ہم نے تو چاند ستاروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔ تم شرافت کا دعویٰ کرتے ہو تو مگر درندے دوسرے جنگلی جانوروں کو بھی کیا وہ جب دوسروں کو اپنے منہ کا نوالہ بناتے ہیں تو کیا وہ فعل شنیع نہیں ہے؟"

"قدرت کے نظام کے حساب سے جس کو گوشت خور بنا دیا تو وہ کیا کھانے گا۔ وہ گھاس کھا کے جی نہیں سکتا۔ وہ کسی نہ کسی جنگلی جانور کو اپنے منہ کا نوالہ بنا ہی لے گا۔ وہ اتنا ہی شکار کرتا ہے جتنے کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تم لوگوں کی طرح صرف مزے کے لئے کسی کی جان نہیں لیتا ہے۔ قدرت نے تمہارے لئے تو ساری نعمتیں پیدا کی تھیں پھر بھی تم معصوم اور بے زبان جانوروں کی جان کیوں لیتے ہو جب کہ گوشت کھانے

کے لیے تم کو پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ تم تو قدرت کے بنائے گئے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے رہے پھر بھی تم انسانیت کا دعویٰ کرتے ہو؟"

"اگر ہم کسی جانور کی جان لیتے ہیں تو تم بھی انسانوں کی جان لیتے ہو؟ ہم جنگلی جانور انسان کی جان تبھی لیتے ہیں جب ہماری جان کو خطرہ پیدا ہو جائے۔ اپنے دفاع میں کسی کی جان لینا کوئی گناہ نہیں ہے۔ تم لوگوں نے تو اپنے ہی لوگوں کی جان لینے سے گریز نہیں کیا۔ کبھی دین دھرم کے نام پر تو کبھی ملک گیری کی ہوس میں تم لوگوں نے ہزاروں لوگوں کی جانیں لیں"۔

"یہ جو تمہاری حرص و ہوس ہے نا اس نے تمہیں ہم سے بھی بدتر اور وحشی بنا رہا ہے۔ ہمیں دیکھو ہم آپس میں کتنے اطمینان اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ ہم نے کسی کا گلا کاٹتے ہیں نہ کسی معصوم کی عزت لوٹتے ہیں۔ نہ کسی کا گھر اجاڑ دیتے ہیں اور نہ کسی کو زندہ جلا دیتے ہیں نہ کسی کو بم سے اڑا دیتے ہیں اور نہ خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔ ہم بھوکے ہوں تب بھی تشدد نہیں کرتے۔ آخر تم یہ کس تہذیب کی دہائی دے رہے ہو؟"

"چند لوگوں کے افعال سے عالم انسانیت کو ہدف ملامت نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ مت بھولو کہ یہ انسان ہی ہے جسے قدرت کی طرف سے اشرف المخلوق کا خطاب ملا ہے"۔

"تمہیں جو خطاب ملا تھا اصل زندگی میں تو تم نے سب کچھ اس کے الٹ کر کے رکھا۔ اپنے ہی بھائی بندوں کو مارنے کے لئے تم نے مہلک سے مہلک ہتھیار بنائے۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو تم نے ایٹم بم بنایا۔ اپنے ہی ہاتھوں تم نے اپنے وجود کو مٹانے کے لئے وہ سب کچھ بنایا جس کی تمہیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ اصل میں تم انسان جو ہو نا تم سب کے سب انا پرستی اور مادہ پرستی کے امراض کے شکار ہو۔ اپنی برتری قائم کرنے کے لئے ایک انسان دوسرے کو مار رہا ہے اور اسے ترقی و تہذیب کا نام دے رہا ہے۔ ایک نگاہ اپنے گرد و پیش میں ڈالو اور پھر مجھے بتاؤ کہ کیا تم لوگ اشرف المخلوق کہلانے کے لائق ہو"۔

"میں مانتا ہوں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہو رہا ہے"۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے اعتراف کرنے سے کل سے یہ سب کچھ بند ہو جائے گا۔ نہیں یہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ یہ قتل و غارت، یہ خون ریزی، یہ تشدد، یہ جنگ و جدل، یہ سب کچھ تمہارے خون میں رچ بس گیا ہے۔ تم مہذب تو بنے مگر تم نے اپنی وحشی جبلت کو اپنے آپ سے الگ نہیں ہونے دیا۔ تم کو جب بھی موقع ملا تم نے ہم سے بھی برا سلوک کیا۔ تم کہنے کو تو انسان کہلائے جاتے ہو مگر تم نے اپنے فعل و عمل سے انسانیت کو شرمسار کر کے رکھ دیا۔ مجھے بتاؤ کہ جنہوں نے کشمیر میں نہتے لوگوں کو چن چن کے مارا وہ کون تھے؟ مجھے بتاؤ کہ پاکستان میں جو آئے روز بے گناہ شہریوں کو بموں کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ کون لوگ ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ عراق میں، شام میں، افغانستان میں، صومالیہ میں جو قتل و غارت ہو رہا ہے یہ سب کون کر رہا ہے؟ تم اپنے آپ کو انسان کہتے ہو نا تو پھر مجھے بتاؤ کہ آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ کون کر رہا ہے؟"

"ہاں یہ سب کچھ ہم انسان ہی کر رہے ہیں"۔

"تو پھر تم اپنے آپ کو کس منہ سے اشرف المخلوق کہتے ہو؟ ارے تم تو ہم سے بھی جاہل اور خود غرض ہو۔ کمینے اور بے رحم ہو۔ تم کو بچوں پر دیا نہیں آتی۔ تمہیں بزرگوں پر ترس نہیں آتا۔ تم عورتوں پر رحم نہیں کھاتے ہو۔ ارے کس طرح کے مہذب ہو تم۔ بڑی بڑی مشینیں چلانے سے اور مہلک ہتھیار تیار کرنے سے تم مہذب نہیں کہلائے جا سکتے ہو۔ تم میں ترقی پھر بھی انسانیت نہیں

ہے۔ تم اپنے مفاد کے لئے اپنے خدا کو ہزار بار بازار میں بیچ کے آتے ہو۔ ہمیں دیکھو ہمارا نہ کوئی مذہب ہے نہ کوئی تہذیب، پھر بھی ہم سکھ شانتی سے رہتے ہیں۔ تم نے تو اپنی اس چھوٹی سی دنیا کو مذہب کے خانوں میں بانٹ لیا ہے۔ کوئی اللہ کے نام پر خون بہاتا ہے تو کوئی ایشور کو اپنے گناہوں کا ساجھے دار بنا لیتا ہے۔ کبھی مسجد کی خاطر، گرجے کو اڑاتے ہو تو کبھی مندر کی خاطر مسجد کو مسمار کر دیتے ہو۔ یہ جھگڑا ہے کس کا؟ خدا کا، اللہ کا، ایشور کا، گاڈ کا یا انسان کا۔ میں آج تک تمہاری منطق، تمہارے فلسفے کو سمجھ نہیں پایا۔ میں کیا تم خود اپنی فطرت کو سمجھ نہیں پائے ہو۔"

"تمہیں انسان میں تخریب کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ تم اس کے تعمیری کاموں کو درگذر کر کے یہ جتانا چاہتے ہو کہ ہر برے کام کا ذمہ دار انسان ہے۔"

"تم نہیں تو اور کون ہے؟ میں تو جنگلوں میں رہتا ہوں۔ میرا یہاں نہ کوئی نظام ہے نہ کوئی قانون، ہے پھر بھی ضابطہ دیکھو ہمارا۔ ہم جنسی لذت کے لئے کسی کی عزت نہیں لوٹتے۔ ہمارا جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی مادہ کے ساتھ جو اس کے لئے تیار ہو۔ ہم غیر مہذب ہو کر بھی زنا بالجبر نہیں کرتے۔ قدرت نے کچھ اصول ہمارے لئے بھی طے کئے ہیں جن پر ہم بغیر کسی دباؤ کے عمل کرتے ہیں۔ تم انسان، جانور کہلانے کے لائق بھی نہیں ہو کیونکہ چھوٹی چھوٹی بچیوں تک کو اپنی حیوانیت کا شکار بنا دیتے ہو۔ اتنا ہی نہیں باپ اپنی بیٹی کی عزت لوٹتا ہے، بھائی اپنی بہن کی، پھر بھی تم انسانیت اور شرافت کا دعویٰ کرتے ہو۔"

ایشور لاجواب ہو گیا۔ اس کے پاس بالم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اس بندر سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، بولا۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے مجھے چلنا چاہئے۔"

"ہاں تم تو ہمیشہ عجلت میں رہے ہو۔ تم تو جب سے آدمی کے خول میں جا کر گھسے ہو عجلت میں ہی رہے ہو۔ سب کچھ پانے کی لگن، دولت کمانے کی ہوس، عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی حرص، ان سب چیزوں کو پانے کے لئے تم نے ہمیشہ عجلت برتی ہے اور یہ سب چیزیں پانے کے لئے تم نے وہ سب کچھ کیا جو انسانیت کے دائرے سے باہر ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری باتیں تمہیں کڑوی لگیں گی کیونکہ میری باتیں سچی ہیں نا، تم سچ سننا پسند نہیں کرتے۔"

ابھی وہ اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ دھاڑ سن کر پورے سموہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی خاطر ادھر ادھر پناہ لینے لگا۔ ایشور کے لئے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شیر اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسے اپنی موت ٹھیک سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے شیر اس پر جھپٹ پڑے بندروں نے ایک ساتھ اودھم مچا دیا۔ شیر اس شور غل سے اس قدر بدحواس ہو گیا کہ وہ ایشور کو شکار کرنے کی بجائے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایشور نے تشکر بھری نظروں سے بالم کی طرف دیکھا جو ایک پیڑ کی شاخ پر بیٹھ کر اپنے گروہ کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ جنگل سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ٹھیک رات کے بارہ بجے وہ اپنے گھر پہنچا۔ رات بھر بندر کی کہی ہوئی باتیں اس کے ذہن پر ہتھوڑے بن کر برستی رہیں۔ اس کی کہی ہوئی باتیں اسے رات بھر نوچتی، کچوکتی رہیں۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ انسان کی کرنی ایسی ہے کہ وہ انسان کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ انسان سے بہتر تو یہ جنگلی جانور ہیں جو وحشی کہلائے جاتے ہیں پھر بھی حیوانیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، انسان کی طرح۔

(بشکریہ ماہنامہ "تحقیق" لاہور)

مسجدوں میں سے ان آئمہ اور خطباء کو نکال دیا جائے جو کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ ہوں اور امامت کو محض کاروبار سمجھ کر پیشے کی حیثیت اختیار کر رکھی ہو اصل میں یہی لوگ فساد کی جڑ ہیں جو دین کی اصل روح کو تو سمجھتے نہیں اور جبہ و دستار پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے۔

☆ .... محمد افضل رحمانی

پشاور کے آرمی سکول میں دہشت گردوں نے سنگ دلی اور قساوت قلبی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ 150 انسانی جانیں چشم زدن میں ضائع کر دیں جن میں 132 معصوم طلباء بھی شامل ہیں۔ گو اس قسم کے واقعات روس، امریکہ وغیرہ میں ہو چکے ہیں لیکن عالم اسلام کی پندرہ سو سالوں کی تاریخ میں ایسی سنگ دلی کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان کبھی بھی کسی بھی وقت، کسی بھی حالت میں اتنا سنگ دل واقع نہیں ہوا حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی بچوں کے قتل سے منع کر دیا گیا ہے بلکہ قیدیوں میں سے بھی نابالغ بچوں کو علیحدہ کر لیا جاتا تھا اور انہیں قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ صرف ان بالغ قیدیوں کو قتل کیا جاتا تھا جو اپنے جرم کی سنگینی کی وجہ سے سزائے موت کے حقدار ہوتے تھے۔

حضرت خبیبؓ کو مکہ میں سولی دی گئی حجیر بن ابی الواہب نے سو اونٹ کے بدلے میں انہیں خریدا تھا تا کہ وہ اپنے باپ کے بدلے میں انہیں قتل کرے۔ حجیر کی لونڈی جو بعد میں مسلمان ہو گئی تھیں، کہتی ہیں کہ جب خبیبؓ کی سولی کا وقت قریب آیا تو انہوں نے زیر ناف بال صاف کرنے کے لئے استرا مانگا چنانچہ انہیں استرا دے دیا گیا۔ اتفاق سے ایک کمسن بچہ اس وقت خبیبؓ کے پاس چلا گیا۔ گھر والوں نے دیکھا کہ استرا ان کے ہاتھ میں ہے اور بچہ ان کے پاس ہے۔ یہ دیکھ کر گھبرائے۔ خبیبؓ نے فرمایا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بچہ کو قتل کر دوں گا؟ نہیں خدا کی قسم میں ایسا نہیں کر سکتا۔

پشاور میں سنگ دل قاتلوں نے کون سا اسلام ایجاد کیا ہے۔ ادھر تو ہاتھ میں استرا اور کمرے میں جانی دشمنوں کا بچہ موجود ہے لیکن اپنے دشمنوں اور قاتلوں کے بچے سے بدلہ نہیں لیا۔ یہ عجب منطق ہے کہ ڈرون حملے امریکہ کرے دور آپریشن فوج کرے اور اس کے جواب میں معصوم کلیوں کو مسل دیا جائے۔ یہ تو انسانی بچوں کا معاملہ ہے کیا سنگ دل قاتلوں کے دل و دماغ میں۔

بات نہ آئی کہ ان ماؤں کا کیا حشر ہوگا جن کے جگر گوشے ہمیشہ کے لئے ان سے جدا کر دیئے گئے۔ سرور جن و انس حضرت محمد رسول اللہﷺ تو ایک چڑیا کی آہ و زاری پر تڑپ گئے تھے۔ جب اثنائے سفر میں ایک صحابی نے ایک چڑیا کے بچے پکڑ لئے تھے اور چڑیا اپنے بچوں کی جدائی میں بے قرار ہوگئی تھی وہ زمین پر لوٹتی اور نہایت پریشان تھی کہ نبی کریمؐ نے اس کی حالت دیکھی تو ارشاد فرمایا اس چڑیا کے بچے جس نے پکڑے ہیں وہ واپس اس کے گھونسلے میں رکھ دے چنانچہ آپؐ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

مولانا عبدالعزیز سے

گو مولانا عبدالعزیز نے پشاور کے واقعے کی مذمت کر دی ہے۔ میں ان سے ٹھنڈے دل سے گزارش کروں گا کو میرا قلم بہت کچھ لکھنے پر مجبور رہا ہے لیکن میں جذبات میں بہہ کر کوئی غلط الفاظ لکھنا نہیں چاہتا صرف اتنا کہوں گا کہ جب آپ کی لال مسجد میں معصوم بچوں اور پردہ دار بچیوں اور بچوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اس وقت بھی قوم نے اس اندوہناک واقعے کی مذمت کی تھی اور میڈیا والوں نے اپنے آپ کو انتہائی خطرے میں ڈال کر تمام واقعات کو رپورٹ کیا تھا۔ سیاستدانوں علماء کرام دانشوروں اور کالم نگاروں نے بھرپور طریقے سے مذمت کی تھی۔ صرف چند حوالے لکھنے پر ہی اکتفا کروں گا۔

○ آپریشن اس وقت کیا گیا جب معاملہ تقریباً طے پا چکا تھا لیکن صدر (پرویز مشرف) نے بھرپور طاقت استعمال کی اور اندھا دھند خون بہایا۔ سقوط ڈھاکہ جیسے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ (نواز شریف)

○ لال مسجد میں انسانیت سوز آپریشن امریکی دباؤ پر کیا گیا۔ جنرل مشرف اسلامی مراکز کو دہشت گردی کے روپ میں پیش کر کے اپنی نوکری پکی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (نواز شریف)

○ لال مسجد آپریشن کا سب سے زیادہ نقصان حکومت کو ہوا۔ (قاضی حسین احمد مرحوم)

○ لال مسجد آپریشن سانحہ جلیانوالہ باغ سے بڑا جرم ہے۔ (حمید گل)

○ لال مسجد آپریشن حکومت نے امریکہ کو دکھانے کے لئے کیا گیا۔ (جاوید ہاشمی)

○ جس قدر لاقانونیت ہے اگر خودکشی جائز ہوتی تو کر لیتا۔ امریکہ سے شاباش لینے کے لئے ایک فون کال پر لال مسجد کے خلاف آپریشن کیا گیا جس میں سینکڑوں معصوم جاں بحق ہوئے۔ (بزرگ پارلیمنٹرین حمزہ)

○ وفاق المدارس اور مجلس عمل کی اپیل پر لال مسجد آپریشن کے خلاف ملک گیر احتجاج ہزاروں افراد کے مارے جانے پر غائبانہ نماز جنازہ لوگ روتے رہے۔ حکمرانوں کے خلاف نعرے۔ کراچی سے پشاور تک عوام میں غم و غصہ مساجد میں مذمتی قراردادیں۔ حکمران ہزاروں معصوم بچوں کے قاتل ہیں۔ نمازیوں نے خاندان کی خواتین کا دریافت کیا جائے۔ سپریم کورٹ تحقیقات کرے (مقررین کا مطالبہ)

○ جامع مسجد القادسیہ میں ہونے والی غائبانہ نماز جنازہ میں 10 ہزار خواتین و افراد کی شرکت لاہور پریس کلب کے سامنے بڑا مظاہرہ، قاضی کا منصورہ میں اجتماع سے خطاب، شیرانوالہ گیٹ داتا دربار اور گوجرانوالہ میں بھی احتجاجی ریلیاں، حکومتی اقدام کی مذمت مقبوضہ کشمیر میں ہڑتال مظاہرے کئی حریت کارکن گرفتار۔ علی گیلانی نظر بند۔ بھارت میں احتجاج جاری، آپریشن لال مسجد کی شدید مذمت۔

○ لال مسجد آپریشن میں بے گناہ افراد مارے گئے۔ پاکستان عالمی طور پر بدنام ہوا۔ (عمران خان)

○ ایک سٹور کے کیش کاؤنٹر پر کھڑے سیاہ فام مسلم نوجوان نے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟" میں نے کہا۔ "پاکستان سے"۔ کام کرتے کرتے اس کے

پانچ ورک گئے ادھر۔ جہاں مسجد پر حملہ کر کے عورتوں اور بچوں کو مار دیا گیا؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں وہیں سے تکفین یہ سب کچھ ہم نے تمہارے اور امریکہ کے لئے کیا ہے، اس کی آنکھیں غضب ناک ہو گئیں۔ مت کہو ایسی بات تمہیں پتہ نہیں کہ مسجدوں پہ گولی نہیں چلائی جاتی، ہمیں خوش کرنے کے لئے تم اپنے اللہ کو بھی بھول جاتے ہو۔ جناب صمدانی تقدیر کسی زخم پر پھاہا نہ رکھ سکی اس لئے کہ انہیں اس وقت کی حدت اور شدت کا اندازہ ہی نہیں جو پاکستان پر گزر گئی جس نے سولہ کروڑ انسانوں کے سینے چھلنی کر دیئے اور جس کی تپش کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جانے گی۔ (نقش خیال جناب عرفان صدیقی سے ایک اقتباس)

○ شہیدوں کے لہو پر سیاست اور منافقت کا جھنڈا گاڑنے والوں نے بے نصیبوں کے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ اب یہ مسجد معصوم لوگوں کی ارواح کا گھر بن چکی ہے۔ اب یہ مسجد ایک قبرستان ہے۔ قربان گاہ انتقام گاہ بن چکی ہے۔ اب اس مسجد سے اللہ اکبر کی نہیں بلکہ دعاؤں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سب رنگوں پر اللہ کا رنگ غالب ہے۔ مسجد کا لال رنگ شہیدوں کے لہو اور سفید رنگ بے گور و کفن لاشوں کے کفن کی یاد دلاتا رہے گا۔ (محترمہ طیبہ ضیاء "چور دروازہ بند گلی میں کھلتا ہے" سے ایک اقتباس)

مولانا دیکھ لیا آپ نے حالانکہ یہ میں نے صرف چند حروف لکھے ہیں لیکن آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس وقت بھی پوری قوم نے اس سانحے کی مذمت کی تھی۔ آج آپ پشاور سانحے کی مذمت کرنے پر تذبذب کا شکار کیوں ہوئے؟

جہاد کا بنیادی مقصد

میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی جہاد نہ اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے تھے اور نہ دوسرے مذاہب کے لئے موجب اکراہ، رب العالمین نے اسلامی جہاد کی جو وجہ بیان کی ہے وہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی مدافعت نہ کرتا اور بعض کے ذریعے بعض کو نہ ہٹا دیتا تب صوامع اور بیع اور صلوٰۃ اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بہت کیا جاتا ہے۔ ضرور گرا دی جاتیں اور جو اللہ (کے مقاصد) کی مدد کرتا ہے اللہ تو قوت والا اور غلبہ والا ہے۔

صَوَامِع، صَوْمَعه کی جمع ہے۔ لغت میں اس عمارت کو کہتے ہیں جو اوپر سے پتلی ہوتی جائے درویشان قوم ترسا کے خلوت خانے اسی شکل کے ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے مندروں کی بھی یہی شکل ہے اور اس نام سے معروف ہیں۔

بِيَعٌ، بِيعَه کی جمع ہے اس سے مراد عیسائیوں کا گرجا ہے۔

صَلَوٰاتٌ، یہ عبرانی صَلُوٰة کا معرب ہے اس سے مراد یہودیوں کی عبادت گاہ ہے۔

مساجد، مسجد کی جمع ہے مسلمانوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔

اب آیت بالا میں غور کر دیکھئے کہ یہ ظاہر کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی کہ وہ تمام مذاہب کی آزادی کو قائم کریں، بدامنی دور کریں، پادریوں، عیسائیوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں کو اور مسلمانوں کی مسجدوں کو کوئی نقصان گرانہ سکے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایرانیوں نے پرویز کے عہد حکومت میں ایشیا کوچک پر قابض ہونے کے بعد عیسائیوں کے گرجوں کو گرا دیا تھا۔ دس سال بعد عیسائیوں نے دوبارہ غلبہ کے بعد پارسیوں کی عبادت گاہوں کو تباہ کر دیا تھا۔ شاہان روما نے یہودیوں کے سب عبادت خانے زمین کے برابر کر دیئے تھے، فیروشلم، دمشق

نے 80ء میں یروشلم کی عبادت گاہ گرا دی تھی۔ قسطنطین کی والدہ کے حکم سے کوڑا کرکٹ گرانے کی جگہ بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کی مساجد تو بالکل ہی غیر محفوظ تھیں کیونکہ پارسی، رومائی، نصرانی مسلمانوں کے خلاف بالاتفاق عداوت پر تلے ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اٹھایا اور پھر انہی کے کندھوں پر تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بار رکھا اور انہوں نے اس بار کو خوشگوار فرض کے طور پر اٹھایا اور خلفائے راشدینؓ، خلفائے بنو امیہ، خلفائے بنو عباس کے ادوار حکومت میں مورخ ایک مثال دینے سے بھی قاصر ہے کہ کسی مذہب کے عبادت خانوں کی توہین کی گئی ہو گرانا تو بہت دور کی بات ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے بیت المقدس کے گرجے میں صرف اس وجہ سے نماز نہیں پڑھی تھی کہ کہیں مسلمانوں کو عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں گھسنے کا جواز نہ مل جائے۔ جب اسلامی لشکر نے اسکندریہ فتح کیا تو مفتوح رعایا نے استغاثہ کیا کہ ان کے ایک بت کی آنکھ کسی مسلمان نے توڑ دی ہے۔ فوجی افسر نے کہا کہ اگر تم یہ ثابت کر دو کہ میری فوج کے کسی شخص کا یہ فعل قیام امن کے بعد اور ہو بیدہ دانستہ تھا تو میں تم کو اختیار دیتا ہوں کہ تم بے شک میری ایک آنکھ پھوڑ دو۔ یہ فیصلہ سن کر سب لوگ سکون کے ساتھ واپس چلے گئے۔

ادھر تو یہ حالت ہے لیکن پاکستان میں عجیب و غریب نامانوس اسلام متعارف کرا دیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہیں تو درکنار مسجدوں تک کو معاف نہیں کیا گیا اور بیسیوں مسجدیں بموں کے دھماکوں سے خاک کا ڈھیر بنا دی گئی ہیں بے گناہ نمازیوں کو بغیر کسی جرم کے شہید کر دیا گیا جن کی تعداد بے حد وحساب ہو گئی ہے میں نے خود اپنے کانوں سے کئی لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ اگر یہی اسلام ہے تو ایسے اسلام کو سلام۔ ہم ایسے اسلام سے باز آئے۔ بانی اسلام حضرت محمد کریمؐ نے کب فرمایا تھا کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کرو۔

ایک عذر اور اس کا جواب

شاید یہ کہا جائے کہ کافروں کو بالجبر مسلمان نہیں کیا جاتا جو مسلمان ہیں ان پر اسلامی قوانین کا نفاذ ضروری ہے۔ تو میں کہوں گا کہ بے شک مسلمانوں کو اسلامی طرز زندگی اپنانا چاہئے۔ ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ بھی لازمی ہونا چاہئے بلکہ فی الفور ہونا چاہئے لیکن جن لوگوں کو آپ نے مسجدوں میں بھرے بازاروں میں، بسوں میں بارود سے اڑا دیا۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ اسلامی نظام سے باغی تھے؟ کیا آپ نے عام لوگوں تک اسلامی نظام کی برکات کا پیغام یا نمونہ کما حقہ پہنچا دیا ان کے دماغوں میں اسلام کی سچائی اور دیگر مذاہب پر اسلام کی برتری ثابت کر دی۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ عوام الناس تک اسلامی تعلیمات کی اصل روح پہنچانے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ آپ نے اسلام کو پوری دنیا میں بدنام کر دیا ہے اور اہل اسلام کو اسلام سے متنفر کر دیا ہے۔ آپ نے آج جو اسلام کی صورت پیش کی ہے کوئی عقل کا اندھا ہی اب اسلام کا نام لے گا۔ آپ کی چشم پوشی سے بعض مسلمان اس نجاست تک پہنچ چکے ہیں جو قابل رحم ہی کہی جا سکتی ہے۔

میں ایک امیر آدمی کے گھر ٹھہرا رات کو باتوں کے دوران اس نے اپنی سیاحت کا ذکر شروع کر دیا اور کئی یورپی ملکوں کے نام گنوائے جہاں کی وہ سیر کر چکا تھا۔ میں نے پوچھا کبھی آپ مکہ اور مدینہ بھی گئے۔ جھٹ سے بولا کہ نہیں۔ دراصل ادھر جانے میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے کہا جناب وہ تو مسلمانوں کے متبرک مقام ہیں۔ مکہ المکرمہ میں خانہ خدا ہے اور مدینہ طیبہ میں روضہ رسولؐ ہے۔ کہنے لگا معاف کرنا۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات

ایک نوجوان لڑکا جو ملک سے باہر رہتا تھا اس کا والد کافی دنوں تک ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد مر گیا اس کی داڑھی بڑھ گئی تھی۔ وفات کی اطلاع پر لڑکا واپس آیا اور باپ کی بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر ڈاکٹروں پر برس پڑا اور کہنے لگا تم لوگوں نے میرے والد کی یہ کیا منحوس شکل بنا دی ہے۔ حجام کو بلوا کر داڑھی کو صاف کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خدارا! سوچئے، ایسے لوگوں پر اسلام کیسے نافذ ہو سکتا ہے۔ اسلام نافذ کرنا ہے تو پہلے لوگوں کو اسلام سکھاؤ، بندوق رکھ دو، کتاب ہاتھ میں لو اور لوگوں کے دروازوں تک پہنچو۔ نبی کریمؐ کی تیرہ سالہ کی زندگی کو نگاہ میں رکھو۔

تصویر کا دوسرا رخ

ایک نوجوان لڑکی اپنی والدہ کے ساتھ میرے پاس آئی۔ میں نے نبض چیک کرنے کی غرض سے اسے کہا کہ ہاتھ ادھر کرو۔ کہنے لگی قاری صاحب! معاف کرنا اگر آپ نبض چیک نہ کریں اور میں اپنی بیماری خود بتا دوں تو آپ برا محسوس تو نہ کریں گے۔ میں نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ ویسے تم نبض چیک کیوں نہیں کرانا چاہتی؟ کہنے لگی۔ دراصل میرا دل نہیں چاہتا کہ کوئی غیر مرد میرے جسم کو ہاتھ لگائے۔ میں دل میں خوش ہونے کے علاوہ حیران بھی ہوا۔ مجھے بتاؤ وہ کس بندوق بردار سے ڈر کر ایسا کر رہی تھی؟

علماء حق سے ہمدردانہ اپیل!

گو شدت پسندوں کے خلاف پاک فوج آپریشن کر رہی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا کیونکہ جنگ کسی مسئلے کا کلی حل نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ جنگ سے مسائل مزید الجھ جاتے ہیں البتہ طاقت کا جواب طاقت سے دینا بعض دفعہ کارگر بھی ہوتا ہے۔ اس صورت حال کا اصل حل میرے نزدیک یہ ہے کہ شدت پسندوں کی برین واشنگ کی جائے، ان کے ذہنوں میں جن غلط نظریات کو بٹھا دیا گیا ہے اور وہ راہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں انہیں سمجھایا جائے اس کے لئے مندرجہ ذیل طریقے بتائے جا سکتے ہیں۔

1. اعتدال پسند علماء کرام کو سرکاری ٹی وی اور پرائیویٹ چینلز پر کافی وقت دیا جائے اور وہ پوری تیاری کے ساتھ قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ میں سے مستند واقعات اور حوالہ جات سے ثابت کریں کہ اسلام کی اصل روح کیا ہے۔

2. جو علمائے کرام اور اسلامی سکالرز قلم استعمال کر سکتے ہیں وہ قلمی جہاد کریں اور اپنے مضامین میں پوری لیاقت اور خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے مضمون سپرد قلم کریں جن میں اسلام کی صحیح تصویر ذہن میں آئے۔

3. خطبات جمعہ میں بجائے اس کے کہ فرقہ وارانہ گفتگو کی جائے ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے اور ان بھائیوں کو کرواوا کریں کہ جن کے گھر کو دشمن نے آگ لگا دی تھی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ آپس کے جھگڑے تو چلتے ہی رہیں گے لیکن پہلے اس سے نپٹنا چاہئے جو سرے سے ہمارے گھر کو جلانے کے در پے ہے۔

4. تھانے کی سطح پر ماہانہ میٹنگ ہونی چاہئے جس میں معززین علاقہ کے علاوہ مساجد کے خطیب حضرات کو بطور خاص مدعو کیا جائے واحد ایجنڈے پر کہ علاقے میں امن کس طرح قائم رکھا جائے اس طرح مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کو باہم ملنے کے مواقع فراہم ہوں گے جو خوشگوار نتائج کے حامل ہوں گے۔

5. جو علماء کرام طالبان کے علماء یا کمانڈروں سے براہ راست مل سکتے ہیں اور گفتگو کر سکتے ہیں وہ [illegible]

دلائل سے سمجھائیں کہ موجودہ حالات میں وہ اپنا بھی نقصان کر رہے ہیں اور خدارا مملکت پاکستان کا بھی اور اسلام کا بھی۔ اگر ان کے دماغ میں اتنا غصہ اور جوش بھر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اس کا توڑ بھی تو کیا جا سکتا ہے اور یہ کام صرف علماء ہی کر سکتے ہیں۔

6۔مدرسوں کو کسی صورت نہ چھیڑا جائے کیونکہ مدارس دین کے قلعے ہیں۔ وزیرِ داخلہ کا بیان ریکارڈ پر آ چکا ہے کہ نوے فیصد مدارس دہشت گردی سے پاک ہیں اور وہاں دہشت گردی کی تعلیم یا ٹریننگ نہیں دی جا رہی۔ وزیرِ داخلہ کے اعداد و شمار کے مطابق جو دس فیصد مشکوک مدارس ہیں یا غیر رجسٹرڈ ہیں بے شک ان کے خلاف کارروائی کی جائے، انہی دینی مدارس سے جید علماء دین، مفتیانِ عظام، بے شمار خطیب تیار ہو کر دین کی خدمت میں مصروفِ کار ہیں۔

7۔میرے خیال میں دینی مدارس میں صرف متعلقہ دینی مضامین ہی پڑھائے جائیں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک طالب علم کو آپ سائنس دان یا انجینئر بنا رہے ہیں تو وہ حافظِ قرآن بھی ہو۔ جس شعبے میں کوئی جانا چاہے وہ جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے شعبے میں وہ ماسٹر ہو اور اگر سائنس پڑھنے والا طالب علم حافظِ قرآن بھی ہو تو یہ اس کی اضافی خوبی ہو گی اسی طرح اگر عالمِ دین یا حافظِ قرآن سائنس اور انگلش پڑھے تو یہ اس کی اضافی خوبی ہو گی جو صرف مستحسن ہی نہیں بلکہ قابلِ قدر بھی ہے۔

8۔یہ خیال کہ انتہا پسند صرف دینی ذہن رکھنے والے ہی ہیں بالکل غلط ہے۔ ملک پاکستان اور دنیا کے دوسرے کئی ممالک میں انتہا پسند جماعتیں موجود ہیں لیکن ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

9۔انتہا پسندی کی اصل وجوہات جاننے کی کوشش کی جائے اور اُن وجوہات کو ختم کیا جائے تا کہ نہ رہے ڈنڈا نہ بجے بانسری۔

10۔مسجدوں میں سے ان آئمہ اور خطباء کو نکال دیا جائے جو کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ ہوں اور امامت کو محض کاروبار سمجھ کر پیشے کی حیثیت اختیار کر رکھی ہو اصل میں یہی لوگ فساد کی جڑ ہیں جو دین کی اصل روح کو تو سمجھے نہیں اور جبہ و دستار پر جبراً قبضہ کر رکھا ہے۔

11۔قصہ گو واعظین فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں چونکہ وہ خوش آواز اور جذبات میں ہلچل مچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اُن کے اندازِ بیان میں کاٹ اور طرزِ تکلم میں بلا کی مقناطیسیت ہوتی ہے انہیں مخالف فرقوں کے جذبات سے کھیلنے کا فن آتا ہے اور چند اختلافی مسائل طوطے کی طرح رٹے ہوتے ہیں اُن کی زبانیں بم دھماکوں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں انہیں عوام الناس میں جانے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے روکا جائے۔

12۔ مخلص، جید، صحیح عالمِ دین کی قدر کی جائے۔ انہیں معاشرے میں اُن کا صحیح مقام دیا جائے تا کہ نام نہاد، علامے، فہامے اور جعلی ملا مسند یہ چوری نہ کر سکیں۔

13۔نام نہاد دانشوروں کو ٹی وی پر اپنا اسلام پیش کرنے سے روکا جائے اور ان دانشوروں کو پابند کیا جائے کہ اپنی بے بنیاد رائے سے اسلام کے روشن چہرے پر سیاہی کے دھبے نہ لگائیں۔

14۔پشاور سانحے کے مجرموں اور اُن کے ماسٹر مائنڈ کو کڑی سے کڑی سزا دی جائے۔

15۔اللہ سے دعا بھی کی جائے کہ اللہ پاک ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے، ہر پاکستانی کو اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیے کفر تو چل سکتا ہے ظلم زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔

***

ایک نوجوان لڑکی کے انوکھے انجام کی کہانی

اسے خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔

☆ .... سید ابوالحسین

رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ ڈھاکہ جانے والی ایکسپریس تھوڑی دیر کے لئے جمال پور کے سٹیشن پر رکی۔ انٹر میں زیادہ مسافر نہیں تھے، جگہ وافر تھی اس لئے بیشتر مسافر پاؤں پسارے خراٹے لے رہے تھے۔ گاڑی چلنے والی تھی۔ انجن نے روایتی سیٹی بجائی۔ اس کی سیٹی گھوڑے کے گلے سے نکلی ہوئی ناگوار آواز سے خاصی مشابہہ تھی۔ درمیانی عمر کا ایک شخص دوڑ کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اس کا لباس سادہ تھا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں، چہرے پر زندگی کی سختیوں کے آثار تھے۔ وہ رات کے سکون پرور تقاضوں سے بے نیاز معلوم ہو رہا تھا، شاید نیند کی لذتوں سے بہت پہلے دستبردار ہو چکا تھا۔

ڈبے میں دو افراد ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ایک نوجوان تھا، اس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ نوجوان کے ساتھ ایک عورت تھی، اس کی عمر کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ پردہ کئے ہوئے تھی۔ پلیٹ فارم کی روشنی سے اس کا ایک ہلکا سا ایک رخ خاکہ بن سکتا تھا۔ نوجوان نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی پھر اطمینان کی سانس لے کر ڈبے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ درمیانی عمر کا نووارد تھوڑا فاصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی نشست زیادہ دور نہیں تھی، وہ اس جوڑے کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی توجہ انہی دونوں کی طرف تھی۔ گاڑی چلنے لگی۔ نوجوان نے سرگوشی میں اپنی ساتھی سے کہا۔ "سورج جلد نکل آئے گا، ہم آٹھ بجے تک ڈھاکہ پہنچ جائیں گے"۔

عورت نے چادر سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں ڈر رہی ہوں"۔

"تم کیوں ڈرتی ہو؟ ڈھاکہ بہت بڑا شہر ہے، وہاں ہمیں کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا"۔ نوجوان نے اسے تسلی دی۔

"کیا ایسا ہی ہو گا؟" عورت نے بے تکا سا...

پوچھا۔

"اور کیا" ۔نوجوان نے یقین سے جواب دیا۔

عورت نے درمیانی عمر کے نو وارد کی طرف دیکھا اور سہم سی گئی۔نوجوان نے محسوس کیا کہ نو وارد اگرچہ اُن کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن خاموش ہے اور اُس کی نگاہوں میں تجسس یا بدتمیزی کی چمک نہیں ہے۔نوجوان مسکرایا۔ اُس نے سوچا، عورتیں فطری طور پر بزدل ہوتی ہیں پھر وہ اپنا منہ عورت کے کان کے قریب کر کے بولا۔"کیا تم اُس شخص سے ڈر رہی ہو؟ تم نے دیکھا نہیں، وہ کتنا شریف آدمی معلوم ہو رہا ہے؟"

عورت نے کہا۔"ہم اگلے سٹیشن پر اتر جائیں گے"۔اُس کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ رات کا وقت ہے، ہم اس وقت اتر کر کہاں پھریں گے؟"

"زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔ہم دوسری ٹرین سے ڈھاکہ چلے جائیں گے"۔

"واہ، صرف اس لئے کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تمہیں دیکھ رہا ہے۔اگر تم اسی طرح ڈرتی رہیں تو ڈھاکہ میں کیسے رہو گی؟ وہاں تو ہزاروں لوگ رہتے ہیں اور......"

عورت نے اُس کی بات کاٹ دی۔"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ آدمی ہماری طرف کس طرح دیکھ رہا ہے؟"

"دیکھا کرے، سبھی دیکھیں گے۔تم جیسی حسین عورت کو نہ دیکھنا تو ایک گناہ ہے"۔نوجوان مردوں کے اس جذبے پر تبصرہ کر کے خوش ہوا۔

عورت نوجوان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی۔اُس نے اپنے آپ کو چادر میں بُری طرح لپیٹ لیا۔شاید وہ ڈر رہی تھی یا شاید بہت شرمیلی تھی۔نوجوان کو اس کی خاموشی اچھی نہیں لگی۔"تم خاموش کیوں ہو؟ کوئی بات کرو۔"عورت کچھ نہیں بولی۔

اُس نے پردے سے درمیانی عمر کے مسافر کی طرف دیکھا۔وہ بدستور اُسی کی طرف متوجہ تھا۔نوجوان نے کچھ توقف کے بعد تنگ آ کے کہا۔"میں اُس آدمی سے بات کرتا ہوں۔وہ آخر ہمیں کیوں گھورے جا رہا ہے؟"

"نہیں نہیں، یہ ہرگز نہ کرنا"۔عورت نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔

نوجوان نے اُس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔اُس نے کلائی چھڑاتے ہوئے کہا۔"ٹھہرو تو سہی، میں ابھی آتا ہوں"۔

وہ اُس آدمی کے قریب پہنچ گیا۔"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

ایسا محسوس ہوا جیسے ادھیڑ عمر کا شخص نوجوان کا منتظر ہی تھا۔اُسے نوجوان کی آمد پر حیرت نہیں ہوئی۔اُس نے صرف یہ کہا۔"کہئے؟" نوجوان کے لئے اُس کا یہ رویہ غیر متوقع تھا۔وہ کچھ گھبرا گیا اور اُس کے جوش میں کمی آ گئی۔ادھیڑ عمر کے شخص نے دریافت کیا۔"وہ عورت تمہاری کون ہے؟"

"جی، میری بیوی ہے"۔نوجوان نے جواب دیا۔

"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"صرف چند دن۔وہ بہت شرمیلی ہے۔دیکھئے نا، کپڑوں کے بنڈل کی طرح لپٹی بیٹھی ہے۔شرم اچھی چیز ہے لیکن اُسے کم سے کم مجھ سے نہیں شرمانا چاہئے۔میں اس کے لئے کوئی غیر تو نہیں ہوں"۔نوجوان ایک ہی سانس میں اتنی باتیں کر گیا۔

"بہت خوب شاید تم دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ غالباً محبت کی شادی ہے؟" اُس آدمی نے کہا۔نوجوان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔اُس نے صرف سر ہلا دیا۔

گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔یہاں بہت زیادہ مسافر

تھے۔ اب سورج نکلنے والا تھا۔ مسافر شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی بھر گئی۔ انٹر کا ڈبہ بھی بھر گیا۔ ڈبے میں جو مسافر سو رہے تھے، انھیں اٹھنا پڑا۔ مسافروں کے ہجوم سے عورت گھبرا گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نوجوان نے ادھیڑ عمر کے آدمی سے کہا۔ "اب مجھے جانا چاہیے"۔

"ہاں، ہاں ضرور۔ تمھاری بیوی کچھ پریشان بھی نظر آ رہی ہے"۔

انجن نے وسل دی، گاڑی روانہ ہوئی اور جلد ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ نوجوان نے اپنی ساتھی سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے بہت ہمدردی سے باتیں کیں، ایک بار تو میں نے سوچا کہ اسے سب کچھ بتا دوں"۔

عورت نے بے چینی سے پوچھا۔ "کہیں تم نے بتا تو نہیں دیا؟"

"نہیں، میں نے کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اگر بتا بھی دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، وہ بہت شریف آدمی ہے"۔

عورت نے پریشانی سے کہا۔ "چھوڑو بھی، بس زیادہ خاموش رہو"۔ نوجوان اس کی بے چینی پر حیران تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں، خاموشی ہی میں عافیت جانی۔

آخر گاڑی ڈھاکہ پہنچ گئی۔ یہ آخری اسٹیشن تھا، یہاں سے گاڑی کو واپس جانا تھا۔ مسافر سامان سمیت سمیت کر اترنے لگے۔ نوجوان اپنی ساتھی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ شاید سب سے آخر میں اترنے کا ارادہ تھا۔ درمیانی عمر والے کو بھی زیادہ جلدی نہیں تھی وہ بھی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر میں بھیڑ کچھ کم ہو گئی۔ نوجوان نے باہر دیکھا، اب ان کے اترنے کی باری تھی لیکن باہر دیکھتے ہی وہ بے اختیار چلایا۔ "غضب ہو گیا"۔

عورت سراسیمہ ہو گئی۔ "کیا بات ہے؟"

نوجوان نے گھبراہٹ میں کہا۔ "تمھارا شوہر

پولیس والوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر موجود ہے"۔

عورت بُری طرح سہم گئی۔ "اب کیا ہوگا؟"

نوجوان چند لمحے کھڑا رہا پھر ادھیڑ عمر کے شخص کی طرف لپکا۔ ادھیڑ عمر کے شخص نے اُس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، نیچے کیوں نہیں اترتے؟"

"میں خطرے میں ہوں"۔ نوجوان نے آہستہ سے کہا۔

"بات کیا ہے؟"

"میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ ہم شادی شدہ نہیں ہیں گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ میری ساتھی کا شوہر پلیٹ فارم پر موجود ہے"۔ نوجوان کی آواز بھرا گئی۔ "اب کیا ہوگا؟ ہماری مدد کیجیے۔ میں التجا کرتا ہوں"۔

درمیانی عمر کے شخص پر نوجوان کے انکشاف کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سب کچھ پہلے سے معلوم ہو۔ اُس نے آہستہ سے آگے بڑھ کے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پلیٹ فارم پر ایک کالا سا لمبا آدمی پولیس والوں کے ساتھ ایک ایک ڈبے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا شخص مسکرا کے نوجوان سے مخاطب ہوا۔ "فکر نہ کرو، تم باہر جاؤ میں تمہاری بیوی...... معاف کرنا، تمہاری محبوبہ کو لے کر آتا ہوں"۔ نوجوان نے اُس کی طرف تشکر سے دیکھا اور ڈبے سے نکل کے ایکا ایکی ہجوم میں غائب ہوگیا۔

ادھیڑ عمر کے شخص نے عورت سے کہا۔ "آؤ اب چلیں"۔

عورت اُس کے ساتھ ڈبے سے اتری اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اُس کے پہلو میں چلنے لگی۔ وہ بہت پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اُس کی شرم ختم ہوگئی۔ "کیا تم اب بھی وہیں رہتے ہو؟"

یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اُس شخص نے عورت کی آواز سنی ہے مگر اُس نے سنی تھی۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔ "اور بھلا کہاں جا سکتا ہوں"۔

عورت نے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے؟" مرد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ گیٹ کے قریب پہنچے۔ ٹکٹ کلکٹر نے اُن سے ٹکٹ طلب کیے۔ مرد نے عورت سے اُس کے ٹکٹ کے بارے میں پوچھا۔ عورت نے نفی میں جواب دیا۔ مرد نے اپنی جیبیں ٹٹولیں پھر اپنا ٹکٹ اور ایک کرنسی نوٹ نکال کر ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کر دیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے انہیں جانے دیا۔ گیٹ سے نکل کے عورت نے پوچھا۔ "منّو کیسی ہے؟"

مرد نے بیزاری سے جواب دیا۔ "اچھی ہے"۔

"تمہارے ساتھ کون رہتا ہے؟" عورت نے دوبارہ دریافت کیا۔

"کوئی نہیں رہتا۔ منّو اپنی پھوپھی کے ساتھ رہتی ہے"۔

"اچھا!" عورت مرد کے ساتھ چلتی رہی۔ نوجوان باہر کھڑا تھا لیکن عورت اُس سے بے خبر تھی۔ وہ مرد سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا منّو نے کبھی مجھے یاد کیا؟ کبھی اُس نے میرے متعلق پوچھا؟" اُس کا گلا رندھ گیا، آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ جواب کی منتظر تھی مگر اُسے جواب نہیں ملا۔

مرد نے بھی اَن سُنی کر دی۔ دو تین قدم بعد اُس نے کہا۔ "اچھا، اب مجھے چلنا چاہیے"۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اُس نے نوجوان کو شکریے کا موقع بھی نہیں دیا۔

دونوں کسی سواری کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ نوجوان نے عورت سے کہا۔ "جب تم دونوں نیچے اترے تو تمہارا خاوند درمیانی عمر والے کو دیکھ کر بُری طرح بھاگا جیسے اُس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ آخر وہ کون تھا؟"

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ "اُس کے ساتھ میں پہلی بار......"

◆○◆

کیا اس قوم کی ایک بھی ماں ایسی نہیں جسے رفوگری آتی ہو؟

☆ ابدال بیلا

قوموں کے مسیحا اور گھروں کی مائیں حقیقت میں رفوگر ہوتی ہیں۔ سارے گھر کی سلامتی، اس کا تحفظ اور امن، ماں کی ممتا سے وابستہ ہے۔ اس لئے کہ ماں زمین پہ خدا کا نور ہوتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا کام جوڑنا ہوتا ہے۔ جب تک ماں کی چھتر چھایا اولاد کے سر پہ ہو، بھائی بھائی سے جڑے رہتے ہیں۔ بہنیں بھائیوں کی حیا اور بھائی بہنوں کے لئے جیا کرتے ہیں۔ پورے گھرانے کے تمام ہنر مند بچے اپنی انفرادی خوش رنگیوں کے باوجود ایک وحدت میں جڑے رہتے ہیں۔ جیسے پورا گھرانہ ایک خوش کن کلی ریشم تاروں سے گندھی ہی پھولوں بھری چادر ہو۔ جس میں ہر پھول اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے بھی پوری چادر کا حسن بنا ہوا ہو۔ ایسی چادریں، شالیں، دریاں اور قالین بڑی محنت سے محبت کی کھڈی پہ تیار ہوتے ہیں۔ ان کے تانے بانے کی ہر لمبی، ہر دھاگہ اپنے اپنے رنگ میں رنگا کمال ہنرمندی سے اوپر نیچے سے گزر کر، تکمیل کے بعد، ایک حسین پھولوں کا گلدستہ بنا نظر آتا ہے۔

ایسی چادریں بڑی نازک ہوتی ہیں۔

وہ ماں، جس نے ایسی چادر بنی ہو، وہ ایسی کسی چادر کو کھونچ کھانچ نہیں آنے دیتی۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس ریشم بافت پشمینے کو کسی نوکیلی میخ پہ ڈال کے کھینچا تو یہ پھٹ جائے گی۔ بنے ہوئے دھاگے میں جو پھول پتی بھی آئی وہ ادھڑ جائے گی۔ ہر زخم سے محنت سے بنائے تانے بانے سرک جاتے ہیں۔ کوئی شریر بچہ کسی بھی رنگ کے دھاگے کو پکڑ کے کھینچنے بیٹھ جائے تو پوری چادر ادھڑ جاتی ہے۔ پھول پتیاں اپنے اپنے گھروں سے نکل کے بکھر جاتی ہیں۔

ایسے میں پھر ماں کام آتی۔

ہر ماں اصل میں رفوگر ہے۔

پہلے تو وہ ہر خوش رنگ پھولوں بھری چادر کو اس کی ہر اس جگہ سے بچاتی ہے جہاں کیل کانٹے ہوں۔ جہاں سے چادر کے پھٹنے کا ڈر ہو۔ اگر کبھی، کہیں چادر سے کوئی کھونچ لگ جائے تو وہ اس جگہ سے نکلے دھاگے نہیں کھینچتی۔ ان دھاگوں کو انہی رنگ روپ دھاگوں کی مدد سے ایسی ترتیب اور مہارت سے رفو کرتی ہے کہ چادر پھٹنے کا وہ نشان نظر نہیں آتا۔ رخنہ نہیں پڑتا، پھٹی چادر سالم لگتی ہے۔ چادر بچی رہتی ہے۔

ایک قوم بھی ایک گھرانہ ہوتی ہے۔

ہر قوم اپنے خوش رنگ پھول بیٹوں کے ساتھ ایک سجی سجائی حرمت بھری چادر جیسی ہوتی ہے۔

ہر قوم کی بھی ایک ماں ہوتی ہے۔

ہر قوم کی ماں ہونی چاہیے۔

ایسی ماں جو قوم کی یکجا خوش رنگ سلامتی کے لیے ہر اس زخم پہ مرہم کی رفوگری کرتے کہ اس قوم کا کوئی پھول اپنی جگہ سے نہ سرکے۔

رفوگری مشکل کام ہے۔

پھاڑنا آسان۔

جوڑنا کمال فن کا متقاضی ہے۔

ہمارے ملک میں ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں اپنی اپنی جگہ ایک خوش رنگ پھول ہے۔ انفرادی شخصی زندگی کی طرح کبھی کبھار قوموں کی زندگی میں بھی انہیں خاردار راستوں پہ چلنے کی مجبوری آ جاتی ہے۔ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ خاردار راستوں پہ آدمی اپنی قبا سنبھال کے ایسے چلے کہ کہیں کسی کانٹے سے کھونچ نہ آئے۔ اگر کوئی کانٹا، کوئی کیل کہیں چبھ جائے، پہنی ہوئی قبا یا اوڑھی ہوئی چادر کہیں سے پھٹ جائے تو ہوش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ایک ماں کی طرح رفوگری کی جائے۔ کوئی پھٹے کپڑے کو مزید نہ پھاڑے۔ ماہر رفوگر کی طرح ایسی

امیر المومنین **حضرت علی** کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشاد گرامی ہے۔ ''صرف پیسے کا ہونا رزق نہیں ہے۔ اچھا اخلاق، نیک اولاد اور مخلص دوست بھی بہترین رزق میں شامل ہیں''۔

رفوگری کرے کہ لگا ہوا گھاؤ بعد میں نظر ہی نہ آئے۔

آج کل معاملہ الٹا ہے۔

ہر ایرا غیرا جیسے دو لفظ لکھنے آتے ہیں، جسے دو بول بولنے کی کہیں کسی چینل پہ توفیق دی جاتی ہے، وہ قوم کی یکجائی کے بخیے ادھیڑنے میں جتا ہوا ہے۔ ہر ''دانشور'' بجائے رفوگری کے، اس خوش رنگ قوم کے تانے بانے کے دھاگے کھینچنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ جنہیں سیاسی زعما ہونے کا گمان ہے، وہ بھی اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ یہ لمحہ رفوگری کا ہے، بخیے ادھیڑنے کا نہیں۔

ادھیڑنا تو بے ہنر، کم عقل بچوں کا کام ہے۔ ایسے بچوں کا جن کے نصیب میں ماں جیسی ممتا اور محبت نہیں ہوتی۔ یہاں ہماری قوم کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ ایک اجتماعی گلدستے کا پھول ہے، خوش رنگ پھول۔ وہ مزدور ہو، کسان ہو، کاریگر ہو، کلرک، فوجی ہو، دکاندار ہو، قلم کار ہو یا کوئی اہل کار، ہر شخص کی اپنی مخصوص جگہ ہے۔ اپنی جگہ پر ہر پھول سوہنا لگتا ہے۔ سکردو، گلگت، چترال، پشاور، سوات، راولپنڈی، واہگہ، میران شاہ، مظفرآباد، سرگودھا، جھنگ، لاہور، ملتان، لاڑکانہ، کشمور، تربت، کوئٹہ، گوادر، کراچی، سیہون شریف اور بدین تک سارے مقامات ہماری قومیت کی اجتماعی عبادت گاہ میں بچھے ہوئے مصلے کے پھول ہیں۔ ان سب کی سلامتی ہی ہماری اجتماعی عبادت ہے۔ پتہ نہیں، ہمارے آج کے زعما کیوں ہماری ماؤں، نانیوں، دادیوں کے اس حسین ہنر کو بھولے بیٹھے ہیں، جو کیا کرتی تھیں۔

''پھاڑو نہیں، جوڑو''۔

جوڑنا ہے تو رفوگری سیکھو۔

پھٹے ہوئے کناروں سے دھاگے نہ کھینچو۔

اپنی اکائی کو لیرولیر نہ کرو۔

اسے ملائمی سے سلامت رکھو اور ہر مشکل وقت میں اپنی حرمت بھری یکجائی کی چادر کو قومی پرچم کا تقدس دے کے یقین، اتحاد اور نظم سے اوڑھے رکھو۔ دشمن کی چالوں میں نہ آؤ۔

دشمن کا کام پھاڑنا ہے۔

اپنے پھاڑا نہیں کرتے۔

جو پھاڑ رہا ہے، اسے اپنا نہ کہو۔

جو جوڑ رہا ہے صرف اسے اپنا مانو۔

اختلافات کہاں نہیں ہوتے مگر اختلاف رائے کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ کوئی مرنے مارنے پر اتر آئے۔ یہ گلی محلوں اور بازاروں میں بہنے والا خون کہنے کو کسی کی شریان کا ہو، ہے وہ ایک باہم پیوستہ متحد جسم کا۔

ایک جسم میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔

آنکھیں، کان، ناک، منہ، ہاتھ، بازو، دل، گردے، جگر، ٹانگیں اور پاؤں۔ کیا کبھی ایک جسم کے اپنے ہی اعضا نے کبھی ایک دوسرے کو کاٹا ہے؟

کیا کبھی آنکھیں یہ سوچتی ہیں کہ اپنے طاقتور بازو کاٹ پھینکیں؟

کبھی اپنے ہاتھوں نے کبھی اپنے پیٹ پر ککیں ماری ہیں؟

زخم کہیں بھی آئے، کہیں دکھن بھی لگے، درد سے پورا جسم بلبلاتا ہے۔ کیا اس میں کوئی بحث ہے کہ ضرورت مرہم کی ہے۔ زخم سینے کا وقت ہے، رفوگری کا ہے۔

پھر ان زخموں کے دھاگے کیوں کھینچے جا رہے ہیں؟

کیا اس قوم کی ایک بھی ماں ایسی نہیں جسے رفوگری آتی ہو؟

◆■◆

میری نظر میں ہر دور ہر دور مرد کامل ہے جو نفس کی خواہشات کو اپنے مقصد کی راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دیتا پھر وہ چاہے کوئی بھی ہو، کچھ بھی ہو اور کہیں بھی ہو۔

☆ .... رحمی شاہد

میں وجاہت علی خان اپنی ذات اور ضروریات کا بوجھ لئے جئے چلا جا رہا ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بوجھ تو بوجھ ہی ہوتا ہے ذات کا ہو یا جسم کا اور ذات کا بوجھ تو اور بھی زیادہ اذیت دیتا ہے کیونکہ وہ جسم کی حدود میں محصور ہوئی اذیت سہہ رہا ہوتا ہے۔ مجھے ہوش سنبھالتے ہی میری ماں نے بتایا تھا کہ میں اپنے خاندان کا پہلا اور اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔ میری پیدائش پر میری دادی جان جھوم اٹھی تھیں۔ دادا تو حیات نہ تھے اس لئے میری پیدائش کی صورت میں انہیں مجھ میں اپنے مرحوم شوہر کی تصویر نظر آتی تھی۔

انسان سدا کا غلام ہے، مالک بن بھی جائے تو سوچ کی حدوں سے غلامی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کبھی اپنی ضرورتوں کا غلام بن کر دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے اور کبھی اپنے نفس کا غلام بن کر خدائی حدوں کو پامال کرتا ہے۔ واحد چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے میری عزت و تکریم میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وجہ میری ذات نہ تھی، وجہ اس خاندان کا چراغ ہونا تھی۔ وگرنہ اگر میں اپنے ماں کے گھر پیدا ہونے والا آٹھواں بچہ ہوتا تو بھی کیا اسی عزت و تکریم کا مستحق ہوتا؟ میں اپنی سوچ کی وسعتوں میں سرگرداں سچائی کی حدود سے خوفزدہ رہتا اپنی ذات اور اس کے گرد حصار کی صورت میں لپٹے رشتوں اور ماحول کی سچائی سے خوفزدہ رہتا۔ جذبات اور سراغ جاں تماشے تماشے میری روح شل ہو جاتی مگر جواب سے میری تشنگی دور ہی رہتی۔

میں اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں اور دادی سے زیادہ قریب تھا۔ اپنے گرد اپنی دو رشتوں کی

ہو رہے تھے اور زیادہ حساس بنا رہا تھا کہ اب ان کی امیدوں پر پورا اترنے کی ذمہ داری مجھ پر ہی عائد ہوتی۔ اپنی دادی کے 'مرد کامل' بننے کے تصور میں میں پروان چڑھنے لگا۔ وہ ایک سخت گیر خاتون تھیں، یہ سختی ان کے حالات کی پیداوار تھی اور میری ماں ایک انتہائی نرم اور شائستہ خاتون تھیں۔ ان دو خواتین کے بیچ میں میری ذات کا طلبعت کے سفر پہ رواں دواں تھی۔ ان دو خواتین کے مزاج کا تضاد میری ذات اور روح کا تضاد بن گیا۔ میری ماں بتاتی ہیں کہ میری دادی جان نے کبھی مجھے رونے نہیں دیا کیونکہ ان کے نزدیک مرد رویا نہیں کرتے۔ میں سوچتا کیا مرد انسان نہیں ہوتے؟ ان میں دل نہیں ہوتا؟ وہ محسوس نہیں کرتے؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی کئی کنیزوں کی فوج رہتی جو مجھے رونے جیسی گالی سے دور رکھتی تھیں۔ میرے خیال میں میں آخری بار اور شاید پہلی بار بھی اسی وقت رویا ہوں گا جب میں اس دنیا میں آیا تھا! میرا رونا میرا ادھورا پن ظاہر کرتا تھا۔ اس لئے مجھے اس سے دور ہی رکھا جاتا تھا۔

وقت کی مسافت طے کرتے کرتے لڑکپن کی حدوں تک آ پہنچا۔ ضروریات زندگی کی ہر آسائش میسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی ادھوری خلش رہتی جسے ابھی جاننا میرے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی 'کلاس' کے لڑکوں سے ہی دوستی کی اجازت تھی، وہ خاندان جو میرے خاندان کے معیار کے مطابق تھے انہی میں اپنی زندگی کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے آج میں اس مقام پر آ پہنچا کہ خلش بڑھتے بڑھتے ناسور بن گئی۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی جو چاہا خواہش سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ ملا۔ پھر اس ادھورے پن کی کیا وجہ تھی؟ خلش ناسور کیوں ہوگئی کامل ہونے ہونے آدھا کیوں رہ گیا؟

میرے لئے تیار کردہ ڈکشنری میں ناکامی اور نامرادی کا کوئی لفظ نہ تھا۔ کاش! جسم کی آسائش اور آرائش کی طرح روح کی آسائش اور تکمیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ وہ تو میری رگوں میں دوڑتے خون کی شرافت تھی اور میری ماں کی تربیت جس نے مجھے کبھی راہ سے بھٹکایا نہیں ورنہ ٹیڑھی راہیں تو راستے کے پتھروں کی طرح سامنے آتی رہیں اور میں انہیں ٹھوکر میں رکھے آگے بڑھتا گیا۔

آج میرے پاس دنیا کی بہترین ڈگریاں ہیں، مردانہ وجاہت، اونچا خاندان اور اچھی تربیت میرے قدموں کی دھول ہیں۔ میں نے اس خاندان کا نام ڈوبنے نہیں دیا اور اپنی دادی اور ماں کی خواہش کے مطابق بظاہر 'مرد کامل' بن ہی گیا مگر مرد کامل کی روح پیاسی نہیں ہوتی رہ گئی؟

میں سوچتا ہوں انسان ہوتے ہوئے بھی ہمارے اندر کے بت ہمیں چین سے جینے نہیں دیتے۔ یہ بت خود پرستی کی آگ کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ تسکین کی خواہش میں دنیاوی معیار کو بہت بلندی پہ لے جاتے ہیں اور دوسرے انسانوں کی خواہشات اور احساسات کا خون انہی بتوں کے قدموں میں بہاتے ہیں، پھر بھی تشنہ رہتے ہیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ ہم بظاہر کے غلام ہیں اسی لئے ہم خسارے میں ہیں۔ بظاہر کے غلام نہ ہوئے تو خسارے میں کیوں کہے جائے۔ میری خواہشات اور ضروریات لامحدود نہ تھیں مگر ان محدود خواہشات کے گرد طلب ذات کی دیواریں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی دم گھٹتا اور کبھی کبھی جمود چھا جاتا۔ ایسے جیسے سمندر کی لہروں کو قید کر دیا گیا ہو اور وہ انہی میں سر پٹختے پٹختے دم توڑ دیں۔

مہربانو میری دوسری محبت تھی۔ پہلی محبت میری ماں تھی۔ وہ جو میری ہی طرح حساس اور روح کی

مصنوعی کی قیدی ہیں۔ جب بانو سے محبت میرے وجود سے ظاہر ہونے لگی تو سب سے پہلا احساس میری ماں کو ہوا کیونکہ میرا اور میری ماں کا احساس ایک ہی ڈور سے بندھا تھا۔ میری ماں نے مجھے اپنے قدم روک لینے کی محبت بھری تنبیہ کی۔ اس سے پہلے کہ یہ بات راز کی ڈور توڑ کر نکل جاتی میں اپنے قدموں کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ ویسے بھی مجھے خود کو سمجھانے رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں زن، زر اور زمین کے وجود اور ذات کو ختم کر دینے والے دنیاوی تصور سے خود کو بچانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اپنے لئے ساتھی چننے کے سارے اختیارات اپنی ماں اور دادی کے سپرد کر دیئے۔ جسم تکمیل کی حدوں کو چھونے لگا اور ذات تشنگی کی حدوں کو۔ لوگوں کی نظر میں مجھ سا خوش نصیب اور مکمل انسان کوئی نہیں تھا جس کے پاس آسائش اور ذات کی بظاہر ہر آرائش موجود تھی مگر میری نظر میں مجھ سا مجبور انسان کہیں نہ تھا۔ اپنی ذات کی زنجیروں میں جکڑا دوسروں کی خواہشات کا تابع مجبور انسان، میں نا شکرا نہ تھا مگر ایک نقطے، تکمیل کے ایک راز کا متمنی تھا۔

ذات کی یہ خلش مجھے راتوں کو جگاتی اور میں بہت روتا کیونکہ رات کے اس پہر میں صرف اور صرف ایک ہی ہستی کی توجہ کا طلبگار رہتا تھا۔ یہ راستہ مجھے میرے آنسوؤں کی تشنگی اور اپنے اندر کے خالی پن نے دکھایا تھا۔ رات کا یہی پہر میرا ہوتا جہاں میں اور میرا رب دونوں خوب باتیں کرتے جہاں دنیاوی معیار کی زنجیریں مجھے قید نہ کرتیں۔ میں اپنے اردگرد موجود رشتوں کی مجبوری اور غرض سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اپنے دیئے ہوئے دینے کے مناسب استعمال کو عمل کرنے کی تدبیریں کرتا اور اپنے اردگرد اپنے جیسے انسانوں کو ان کی ذات اور جسم کی جنگ سے آزاد نہیں تو کم از کم ان کو سکون دینے کی کوشش کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ میں کچھ بھی کر لیتا میں مرد کامل بننے کا حقدار نہ تھا اور کوئی بھی نہیں تھا جو یہ دعویٰ کرتا کہ وہ ایک کامل انسان ہے اور کامل مرد کی صف میں شامل ہے۔ اس لئے کہ کامل مرد تو ایک ہی ہستی تھی اور رہے گی اور ان کے علاوہ مرد کامل بننے کی خواہش اور کوشش بے کار اور مصنوعی ہے۔ وہ مرد کامل صلی اللہ علیہ وسلم جو تکمیل کی ساری حدوں کو خود میں سموئے ہوئے تھے، ان کی پیروی کی راہیں ہی ہمیں دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا، میرا اندر اب مطمئن تھا۔ میرے آنسوؤں کی یلغار نے مجھے منزل کے راستے کا تعین دیا۔ مجھے ان نام نہاد کاملیت کے دعویداروں سے محض ہمدردی محسوس ہوئی جو نہیں جانتے کہ ان کا دنیا میں آنے کا مقصد وہ نہیں جس کے پیچھے وہ ساری عمر بھاگتے رہتے ہیں بلکہ وہ ہے جس کو انہوں نے خود سے بہت دور کر دیا ہے۔ میں دنیادار انسان ہوں اور دنیا میں رہتے ہوئے مجھے اس کے تقاضے نبھاتے ہوئے آخرت کی راہوں کو ہموار کرنا ہے۔ مجھے ان دنیاداروں نے خود کو بچانا تھا جو آدمی زندگی چھوٹی چھوٹی کمینگیاں کرتے گزار رہے ہیں اور باقی کی آدھی زندگی ایک مکمل کمینگی کر کے فخر سے خود کو کامیاب کہتے ہیں۔ مجھے خسارے کی راہ سے خود کو اور دوسروں کو بچانا ہے۔ میری حیثیت ایک ذرۂ خاکی کی ہے اور میری یہی سوچ میری تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ میری روح میری سوچ کی گہرائی پہ مسکرائی اور میں آگے بڑھ گیا۔ دوسروں کو سہارا دینے کے لئے اس ذات الٰہی کی مدد اور اس مرد کامل کی پیروی کے سہارے اور میری نظر میں ہر وہ مرد مرد کامل ہے جو نفس کی خواہشات کو اپنے مقصد کی راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دیتا پھر وہ چاہے کوئی بھی ہو، کچھ بھی ہو اور کہیں بھی ہو۔

□▲□

ہر چالباز کے منصوبے کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اس طریقہ کار پر ہوتا ہے جو اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔ ایک عورت کی کتھا جو اپنے محبوب کو دوسری عورت کے چنگل سے آزاد کرانے کا تہیہ کرچکی تھی۔

☆ .... ریاض عاقب کوہلر

"تو تم فیصلہ کرچکے ہو؟"

"ہاں۔" پیٹر نے سر جھکالیا۔

"وجہ؟ ...... کیا وہ مجھ سے خوبصورت ہے؟ ...... یا کم عمر ہے؟"

پیٹر نے کہا۔ "وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی ہے۔"

"اور میں؟ ...... کیا میری چاہت میں کمی آگئی ہے؟"

"نہیں ...... لیکن وہ مجھے پسند ہے۔ میری وفادار ہے۔"

"کبھی میں بھی تھی۔" روز کے لہجے میں حسرت ہلکورے لے رہی تھی۔

"دیکھو میں تمھارے لیے اتنا کچھ چھوڑے جارہا ہوں کہ تمھیں معاشی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تم بینک سے ملنے والے پرافٹ سے اپنی گزر اوقات اچھی طرح کرسکو گی۔ یہ گھر بھی تمھارے نام لکھ دیا ہے۔ اور کیا چاہیے؟"

روز اسی لہجے میں بولی۔ "میں نے کچھ اور بھی مانگا تھا؟"

"اسی لیے تو آج واپس آیا ہوں لیکن ہفتہ نہیں صرف تین دن۔ فلوریڈا تین دن سے زیادہ میری دوری برداشت نہیں کرسکتی۔ اور شاید تمھیں برا لگے مگر میں اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔"

"گو یہ میری آخری خواہش تھی۔ بہرحال اب میں تمھیں صرف آج کا دن روکوں گی۔ کل تم اپنی فلورا کے

پاس جاسکتے ہو؟"

"یقیناً تم خفا ہو؟" پیٹر آج بھی اسے پسند کرتا تھا مگر فلورنیڈا نے جانے اس پر کون سا جادو کیا تھا کہ وہ دس سالہ رفاقت کو ٹھوکر مار کر جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خندہ پیشانی سے الوداع کہیں۔

"کیا فائدہ؟" روز نے کندھے اچکائے۔ "خفگی کی اہمیت اس وقت ہوتی ہے جب کسی کو ہمارے روٹھنے سے تکلیف پہنچے۔"

"روز!..... اگر آخری دن گلوں شکووں کی نذر کرنا ہے تو مجھے چلا جانا چاہیے۔ جبکہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں تمہیں کوئی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔"

"اوکے!..... ڈنر میں کیا لینا پسند کریں گے؟"

پیٹر مسکرایا۔ "رجس لائیک اے گڈ گرل۔"

☆☆☆

رات کو اس نے ایک منٹ بھی پیٹر کو سونے نہیں دیا تھا۔ محبت بھری باتوں کی تان آخر فلورنیڈا کے ذکر پر ہی آن ٹوٹی تھی۔

"تمہیں یہ خوبصورت ٹاؤن تو ہمیشہ یاد رہے گا نا؟"

"ہاں۔" پیٹر نے اعتراف کیا۔ "اور تم بھی۔"

"ڈاکٹر لارا کہہ رہی تھیں کہ اب میں ماں بن سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے نا؟..... تم شادی کر لینا۔"

"نہیں۔" روز نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ہمیشہ تمہاری واپسی کی منتظر رہوں گی۔ مجھے امید ہے جلد ہی تمہارا دل اس نئی تتلی سے بھر جائے گا اور تمہیں دوبارہ اپنی روز کی یاد آئے گی۔"

"تم جذباتی بلیک میلنگ کی کوشش کر رہی ہو نا!"

"یہ حقیقت ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ اسے صرف تمہاری آسودہ حالی سے سروکار ہے۔ پتا ہے نا وہ فقط انیس سال کی ہے اور تم اس ماہ چالیس کے ہو جاؤ گے۔"

"یہ فرق اتنا بڑا نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ سوٹ کرتی ہے۔"

"وہ یقیناً اسی واہیات ہوٹل میں تمہاری منتظر ہو گی، جہاں وہ تم سے پہلی بار ملی تھی۔"

"ہاں روز!..... تم جانتی ہو اس چھوٹے شہر میں اس کے علاوہ ڈھنگ کا کوئی ہوٹل ہی نہیں ہے۔"

"بکواس!..... اس کے علاوہ سارے ہوٹل ڈھنگ کے ہیں۔" روز نے منہ بنایا۔

"یہ تمہاری رقابت بول رہی ہے۔" پیٹر نے اس کی بات کا برا نہیں منایا تھا۔

"تو اسے یہیں لے آتے۔ جیری ہول میں کافی اچھے ہوٹل موجود ہیں۔"

"ڈیڑھ سو کلومیٹر کا سفر صرف اس لیے طے کرتا کہ وہ میری پہلی بیوی سے مل سکے۔ اسے قطعاً گوارا نہ ہوتا۔"

"بڑا خیال ہے اس کی پسند و ناپسند کا؟" وہ بدمزگی نہیں چاہتی تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی کا رنگ بھر گیا۔

"تمہارا خیال بھی تو رکھتا تھا؟" پیٹر کا جواب غیر متوقع تھا۔

"ہاں!..... اسی وجہ سے علیحدگی اتنی تکلیف دہ لگ رہی ہے۔" روز کے لیے آنسو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ذہن بٹانے کے لیے موضوع تبدیل کرنے کا سوچا مگر اس کے علاوہ اسے کوئی موضوع نہ سوجھا۔ وہ دوبارہ بولی۔

"کل لنچ کے بعد تم چلے جانا۔"

"اگر چاہو تو دو دن مزید رک سکتا ہوں۔" پیٹر نے

ہچکچاتے ہوئے آفر کی۔

''نہیں !.....'' روز نے اسے آزمائش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ ''دو دن یا ایک ہفتے سے میں کیا خوشی کشید کروں گی۔ الٹا دکھ کی شدت میں اضافہ ہوگا لمحہ لمحہ مرنے سے یک بارگی موت آسان رہتی ہے؟''

پیٹر گھبرا کر بولا۔ ''کہیں تم نے کوئی غلط تو نہیں سوچ رکھا۔ تمہاری موت بہر حال میرے لیے دکھ کا باعث ہوگی اور میں جانتا ہوں تم مجھے دکھ دینا پسند نہیں کروگی؟''

روز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں میں خودکشی نہیں کروں گی۔ میں مرتے دم تک تمہارا انتظار کرنا چاہتی ہوں۔

''شاید میں کبھی نہ لوٹوں؟''

روز مسکرائی۔ ''غلط فہمی ہے تمہاری، خیر ہو بھی سکتا ہے، اگر تم فلوریڈا کی بے وفائی کے بعد کسی اور پاس چلے گئے تو ایسا ہونا ممکن ہے۔''

''تمہیں اس کی بے وفائی کا اتنا یقین کیوں ہے؟'' پیٹر نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

''کیونکہ میں نہیں سمجھتی کہ تم آج بھی اتنے ہینڈسم ہو کہ ایک انیس سالہ دوشیزہ تم پر مر مٹے۔''

''اگر یہ ٹھیک ہے تو تمہاری خفگی کی وجہ؟..... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم اب بھی پہلے کی طرح ہو اور کوئی بھی جوان تمہیں اپنا کر خوشی محسوس کرے گا۔''

روز نے منہ بنایا۔ ''پیٹر تمہیں علم ہے کہ تم میری محبت ہو اور دس سالہ ازدواجی زندگی اس کا مظہر ہے۔''

''ویسے کیا تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟'' پیٹر نے اپنے اوپر کمبل کھینچا۔ روز جان گئی کہ وہ اس موضوع سے فرار چاہتا ہے۔

''پیٹر !.....کیا وہ تمہیں میرے جتنا ہی چاہتی ہے؟'' روز نے مزید قریب ہونے کی کوشش کی حالانکہ یہ ایک لاشعوری حرکت تھی، وہ پہلے بھی اس کے ساتھ لگ کر لیٹی ہوئی تھی۔

''شاید تم سے بھی بڑھ کر۔ اور ہاں کل لنچ میں، میں صرف رائس اور چکن لوں گا۔'' پیٹر نے اس کے سوال کا جواب اس انداز سے دیا گویا اسے وارن کر رہا ہو کہ وہ مزید اس موضوع پر گفتگو پسند نہیں کرتا۔

''سوئیٹ میں کیا لیں گے؟'' روز، اس کا موڈ دیکھتے ہوئے دوبارہ اس موضوع پر نہ آئی۔

''تمہیں بھول گیا ہے کہ مجھے کیا پسند ہے۔'' بظاہر اس کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

روز جلدی سے بولی۔ ''نہیں جانتی ہوں تمہیں آئس کریم پسند ہے۔''

''پھر پوچھنے کا مقصد؟''

''یہ بھی تو مجھے پتا ہے کہ تمہیں چکن اور رائس پسند ہیں، پھر کیوں یاد دہانی کرائی؟''

''او کے جھگڑا چھوڑو، مجھے نیند آرہی ہے۔''

''او کے ڈیئر!.....اب تم سو جاؤ۔'' سپیدۂ سحر نمودار ہوتا دیکھ کر روز بستر سے اٹھ گئی۔

''تم نے نہیں سونا؟'' پیٹر نے نیند سے بوجھل آنکھیں اس کی طرف گھمائیں۔

''نہیں، میں نے تمہیں الوداع کرنے کی تیاری کرنی ہے؟'' کہہ کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ پیٹر میں بھی مزید سوال جواب کی ہمت نہیں رہی تھی۔ یہ بات روز بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ پیٹر نیند کا کتنا رسیا ہے۔ اب لنچ سے پہلے اس کے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

واش روم سے نکل کر وہ اپنے پرانے ماڈل کی شیورلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ لمبے سفر کے لیے یہ ایک زبردست کار تھی۔ گو اسے لمبے سفر سے وحشت ہوتی تھی۔

☆......☆

پیٹر کی آنکھ روز کے جگانے پر کھلی تھی۔

''ڈیئر!.....اٹھو! لنچ تیار ہے۔''

پیٹر آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ روز کھانا لگانے چل دی جبکہ وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ جیری ہول کا پانی اسے بہت پسند تھا، نہایت ٹھنڈا اور شیریں۔ وہ کافی دیر شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ جانے پھر کب یہاں آنے کا موقع ملتا۔ اسے یقین تھا کہ فلوریڈا اسے کم از کم جیری ہول آنے کی اجازت کبھی نہیں دے گی۔ روز کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔

"اب آ بھی جاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" یہ بات اس نے باتھ روم کا دروازہ بجا کر کہی تھی۔

"بہت اچھے راگس بنے ہیں۔" ڈائننگ ٹیبل پر پیٹر نے دل کھول کر اس کی کوکنگ کی تعریف کی مگر شاید روز کو ان پھیکی تعریفوں کی ضرورت نہیں تھی۔

کھانے کے بعد روز نے اسے ایک خوبصورت ریسٹ واچ گفٹ کی۔ پیٹر اس موقع کے لیے کوئی گفٹ نہیں لے سکا تھا۔ اسے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ اور اس ندامت کا تاثر زائل کرنے کے لیے وہ بولا۔

"اصل میں میرا ارادہ تھا کہ بعد میں کوئی گفٹ دوں گا مگر تم مصر ہو کہ مجھے آج ہی چلا جانا چاہیے اس لیے نہیں خرید سکا۔ آئی ایم سوری ..... یقیناً یہ بات بھی تمہارے لیے دکھ کا باعث ہوگی؟"

"ہاں۔" روز صاف گوئی سے بولی۔ "لیکن تمہاری جدائی کے بعد میرے لیے ہر تکلیف بے معنی ہو گئی ہے۔"

"میرا خیال ہے مجھے جانا چاہیے۔" پیٹر کو جان چھڑانے کا اس کے علاوہ کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

"ضرور۔" روز اٹھ کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

"تم !..... کہاں چل دیں؟" پیٹر نے پوچھا۔

"گڈ بائی !..... میں تمہیں الوداع نہیں کہہ پاؤں گی۔" بیڈ روم میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

پیٹر نے محسوس کیا یہ اچھا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ان لمحوں میں خود کو اداس محسوس کرنے لگا تھا۔ دس سال کوئی کم عرصہ نہیں تھا۔ کار میں بیٹھ کر اس نے روز کی دی ہوئی گھڑی اتار کر ڈیش بورڈ میں رکھ لی اور دوبارہ فلوریڈا کی دی ہوئی گھڑی پہن لی۔ کیونکہ اس کی کلائی پر دوسری گھڑی دیکھ کر وہ اس کی جان کو آ جاتی اور اسے جواب دینی مشکل ہو جاتی۔

جیری ہول سے نکلتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

پیٹر ہر طرح سے ایک کامیاب شخص تھا۔ صحت، دولت، صورت ہر ایک چیز سے خدا نے اسے نوازا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہ نہایت نرم خو اور اچھے اخلاق کا مالک بھی تھا۔ دس سال پہلے اس نے روز کو پسند کیا اور وہ ساتھ رہنے لگے۔ شادی پر نہ روز نے زور دیا اور نہ اس نے ضرورت محسوس کی۔ روز کی کچھ جسمانی پیچیدگیوں کی وجہ سے ان کی اولاد نہ ہو سکی مگر یہ وجہ ان کے درمیان محبت کو کم نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ چند ماہ پہلے اس کی ملاقات فلوریڈا سے ہوئی۔ اس نے جانے کون سا جادو کیا کہ وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ اور پھر اس نے صاف الفاظ میں روز سے علیحدگی کا کہہ دیا۔ اسے پسند کرنے کے باوجود وہ اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے فلوریڈا کی چاہت میں کوئی شبہ نہیں تھا وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اس وقت وہ روز کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر فلوریڈا کے پاس جا رہا تھا۔

دو گھنٹے میں اس نے ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ یونی کان ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا شہر تھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں کار روک کر وہ اندر داخل ہو گیا۔

☆...... ......☆

کلارک نے تھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس کی ڈیوٹی گھنٹا بھر پہلے ختم ہوئی تھی مگر انتھونی کو اس نے جان بوجھ کر ڈیوٹی پر آنے سے منع کر دیا تھا۔

"تم !..... دو تین گھنٹے مزید آرام کر سکتے ہو؟" اس

سے فون پر انتھونی کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔

اس وقت وہ اپنی چھوٹی انگلی سے انگوٹھی اتارنے میں مصروف تھا مگر غلطی سے پہننے والی انگوٹھی اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ انگوٹھی کے نگینے میں جڑا سفید رنگ کا ہیرا آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہا تھا۔

اچانک اس نے پیٹر ایبنگرسن کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا وہ سیدھا لفٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ کلارک کی پیشانی پر تفکر بھری لکیریں نمودار ہوئیں انگوٹھی اتارنے کا مشغلہ مؤخر کرتے ہوئے اس نے پیٹر کو روکنے کا سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ پیٹر کہاں جا رہا ہے۔ وہ زیادہ دیر تذبذب کا شکار نہ رہا اور اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے وہ پیٹر کی طرف بڑھ گیا۔

''مسٹر ایبنگرسن!......''

''یس!......'' پیٹر نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

''سر!...... دو منٹ مجھے دیں گے؟''

''ہاں بولو۔'' پیٹر کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''نہیں سر!...... تھوڑا سائیڈ پر ہو کر بات سنیں۔''

وہ متعجب سا کلارک کے ساتھ ہو لیا۔

وہ اسے سائیڈ پہ لے جا کر بولا۔ ''سر آپ یقیناً مس فلوریڈا کے پاس جا رہے ہوں گے؟''

''ہاں تو؟'' پیٹر کے لہجے میں حیرانی برقرار تھی۔

''سر پلیز اگر آپ دو تین گھنٹے بعد تشریف لائیں۔''

''مگر کیوں؟''

''وہ...... وہ دراصل، وہ اس وقت موجود نہیں ہیں کمرے میں۔'' کلارک گڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''تو میں وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کر لیتا ہوں؟'' پیٹر نے اطمینان سے کہا۔

''نہیں سر!...... یہ مناسب نہیں ہو گا۔'' کلارک گھبرا گیا تھا۔

''مسٹر!...... سیدھے طریقے سے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟'' اس بار پیٹر کے لہجے میں سختی آ گئی تھی، حالانکہ وہ ایک نرم خو شخص تھا۔

کلارک نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اوکے...... اوکے، سر!...... بات یہ ہے کہ ہوٹل کی انتظامیہ جھگڑا نہیں چاہتی۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' پیٹر نے وضاحت چاہی۔

''اف!...... میں کیسے سمجھاؤں؟'' کلارک نے پریشان ہو کر سر پکڑ لیا۔ پیٹر کا تجسس بھی بڑھ گیا تھا۔ ''اچھا ایسا ہے کہ مس فلوریڈا اس وقت مصروف ہیں اور اس نے منع کیا ہے کہ کسی کو بھی اس کے پاس آنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

پیٹر کارل ناخوشگوار انداز میں دھڑ کنے لگا۔ ''مسٹر......؟''

''کلارک، میرا نام کلارک ہے، دوست...... کل کہتے ہیں۔''

''تو مسٹر کلارک!...... میں اس کے باوجود اس کے پاس جانا چاہوں گا۔''

''مگر سر!...... آپ نے تو کل شام کو آنا تھا؟''

''تمہیں کیسے پتا؟''

''فلوریڈا نے سر!...... شاید میں مس فلوریڈا کا راز نہیں رکھ سکا ہوں۔ اصل میں وہ اس وقت اپنے پرانے فرینڈ کی کے ساتھ مشغول ہیں۔ اس کے ساتھ وہ نو بجے تک رہیں گی۔ دس بجے اسٹیفن آ جائے گا، اس کے ساتھ انھوں نے صبح تک رہنا ہے۔ اور صبح آٹھ بجے سے دوپہر تک کا ٹائم فریڈ کا ہے۔ اس کے بعد وہ آپ کے استقبال کی تیاری کریں۔''

''ت...... تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' پیٹر کا دم گھٹنے لگا۔

''سر!...... پلیز میرا نام نہ لینا مگر حقیقت یہی

ہے۔ اور اس وقت میں نے اسی لیے آپ کو روکا ہے کہ آپ کی کسی کے ساتھ لڑائی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اپنے علاوہ فلوریڈا کے کسی دوسرے عاشق سے واقف نہیں۔ اور آپ سے جسمانی لحاظ سے خاصا تگڑا ہے۔ فسٹ ہال کے کھلاڑی یوں بھی لڑائی جھگڑے کے ماہر ہوتے ہیں۔ سب بڑھ کر اس جھگڑے سے ہوٹل کی نیک نامی پر دھبا لگے گا اور میں ایسا کسی صورت میں نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ یہ ہوٹل اکیلے میکلوف کی ملکیت نہیں میں بھی اس کا شیئر ہولڈر ہوں۔"

"اگر میں جھگڑا نہ کرنے کا وعدہ کر دوں تو؟......"

"مشکل ہے۔ یہ وعدہ آپ کر رہے ہیں کسی نہیں۔ اس کی ذمہ داری کون لے گا؟"

"اوکے!......" پنبر اپنی سے کے لیے مڑا۔

"سر اگر آپ فلوریڈا کے نام کوئی پیغام چھوڑنا چاہیں تو میں اس تک پہنچا دوں گا۔"

پنبر کو محسوس ہوا فلوریڈا کی وجہ سے اس کی بہت انسلٹ ہو چکی ہے۔ اگر وہ اس بات کو جنبار بنا کر قطع تعلق کرتا تب بھی اس کی تسلی تھی کہ کسی اور نے اس کی محبوبہ چھین لی۔ اس کے بجائے اپنی انا اور خودداری برقرار رکھنا ضروری تھا۔ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، یوں کسی سے شکست کھانا اسے قبول نہیں تھا۔

"ہاں!...... مجھے کاغذ چاہیے ہوگا۔"

کلارک نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس کے سامنے پیڈ رکھ دیا۔

ایک لمحہ سوچ کر پنبر نے لکھا۔ "سوری مس فلوریڈا!...... میں اپنی روز سے علیحدہ نہیں ہو سکتا، آج ہم شادی کر رہے ہیں، یقیناً تم شامل ہونا پسند نہیں کرو گی اس لیے میں نے تمہیں دعوت نامہ بھجوانا ضروری نہیں سمجھا۔"

کلارک کو پیڈ واپس کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس کے دماغ میں روز کے کہے الفاظ گونجے۔

"کیونکہ میں نہیں سمجھتی کہ تم آج بھی اتنے ہینڈسم ہو کہ ایک انیس سالہ دوشیزہ تم پر مر مٹے۔"

"ہاں روز ڈارلنگ!...... تم نے سچ کہا تھا۔" اس نے دوبارہ روز کی دی ہوئی ریسٹ واچ دیکھی اور اس کی نئی جگہ اور آمد کی رطوفان کی طرح جیری ہول کی طرف روانہ ہو گئی، گو اسے یقین تھا کہ روز کبھی بھی خودکشی یا اس قبیل کا کوئی غلط کام نہیں کرے گی۔ مگر اس کے باوجود جلد از جلد روانی روز کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

"ارے!...... کوئی چیز بھول گئی تھی کیا؟...... مجھے فون کر دیتے تو میں پہنچا دیتی، اس بہانے آپ کی فلوریڈا سے بھی مل لیتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔ "روز!...... آئی لو یو ڈارلنگ۔"

"آئی لو یو ٹو پنبر!" روز سسکی۔ "مگر اب کیا فائدہ؟"

"چلو میرے ساتھ۔" وہ اس سے علیحدہ ہوا۔

"کہاں؟"

"ہم ابھی شادی کر رہے ہیں۔"

"ہم...... مگر شادی...... پنبر میں کچھ نہیں؟"

"تم نے شادی کے لیے کب سے نیا لباس سلوا کر رکھا ہوا ہے؟"

"جب سے تمہارے ساتھ رہنے لگی اس وقت سے۔"

"تو بس فٹافٹ لباس بدلی کرو۔ اور تمہیں شاید پتا نہ ہو میں نے بھی چند ماہ پہلے سلوایا تھا مگر درمیان میں فلوریڈا صاحبہ آن ٹپکیں، اسے جواب دے کر ابھی آ رہا ہوں، ہونہہ!...... میری روز کی جگہ سنبھالنے چلی تھی۔"

روز گویا ہواؤں میں اڑتے ہوئے الماری کے پاس گئی، اور چند لمحوں بعد وہ نہا دھو کر نیا لباس پہن چکی

تھی۔ وہاں سے دو روز کو لے کر چرچ کی طرف روانہ ہوا۔ رستے میں روز جھجکتے ہوئے بولی۔

''ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے پیٹر!''

''کیا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''آپ نے جو ڈائمنڈ رنگ لے کر دی تھی وہ مجھ سے گم ہوگئی ہے۔''

''رات تک تو وہ تمہاری انگلی میں موجود تھی؟'' اس کی حیرانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

''ہاں ...... صبح ہی کہیں دائیں بائیں ہوئی ہے ...... میرا خیال ہے مارکیٹ میں کہیں گری ہے؟''

کوئی بات نہیں۔'' تجدید تعلق کے موقع پر پیٹر نے خفا ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ''ہم اور خرید لیتے ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے کار کا رخ مارکیٹ کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

دو روز کی زندگی کی سب سے سہانی صبح تھی۔ گزشتہ شب وہ پیٹر کی جدائی کا سوچ کر سو نہیں سکی تھی اور آج کی رات اسے ہمیشہ کے لیے پا لینے کی خوشی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ پیٹر بھی بہت خوش تھا۔

صبح جاگنے پر اسے پیٹر گہری نیند میں ہی نظر آیا۔ فریش ہو کر وہ کچن میں گھس گئی۔ الیکٹرک کیتلی میں کافی کے لیے گرم پانی ڈال کر اس نے پلگ سوئچ میں لگایا اور فریج کی طرف بڑھ گئی۔ مگر فریج کا دروازہ کھولنے سے قبل فون کی گھنٹی نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ لپک کر فون کے قریب پہنچی کہ کہیں گھنٹی کی آواز سے پیٹر کی نیند میں خلل نہ پڑ جائے۔ گو اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ پیٹر گھوڑے بیچ کر سونے کا عادی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ حتی الامکان کوشش کرتی کہ کوئی ایسی بات واقع نہ ہو جس سے پیٹر کی نیند میں خلل پڑے۔

''یس؟'' اس نے ریسیور اٹھالیا۔

''مسز پیٹر؟'' آواز مانوس سی تھی مگر وہ پہچان نہیں پائی تھی۔

''بول رہی ہوں؟''

''کلارک بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ!...'' روز کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ ''میرا خیال ہے میں نے تمہیں رابطہ کرنے سے منع کیا تھا مسٹر؟''

کلارک جلدی سے بولا۔ ''یاد ہے مسز پیٹر!...... میں نے بس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ ایک ڈائمنڈ رنگ کے بدلے آپ نے میرا شوہر واپس لوٹا دیا ...... اگر آپ پیٹر کو فلوریڈا کی زمینوں کے بارے نہ بتاتے تو شاید وہ کبھی واپس نہ لوٹتا۔''

''مسز پیٹر!...... آپ کی مہربانی کہ آپ نے ایسی لاجواب ترکیب کی طرف میری رہنمائی کی ...... اور بونس میں ہیرے کی انگوٹھی بھی میرے حوالے کی ...... اس طرح آپ کو اپنا پیٹر ملا اور مجھے اپنی فلوریڈا واپس مل گئی۔ کل وہ میری دلہن بن رہی ہے ...... یقین مانو جب سے اس نے پیٹر میں دلچسپی لینی شروع کی تھی میری راتوں کی نیند اور دن کا آرام کھو گیا تھا ...... تھینکس مسز پیٹر! آپ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی ...... گڈ بائی۔''

''گڈ بائی۔'' رابطہ منقطع ہوتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا ...... اس کی بلا سے فلوریڈا کلارک کی محبوبہ تھی یا نہیں وہ اسے ملتی تھی یا نہیں ...... اسے تو فقط اپنا پیٹر واپس چاہیے تھا۔ ایک ڈائمنڈ رنگ کہاں پیٹر سے قیمتی ہو سکتی تھی ...... ہیرے کی انگوٹھی تو دوسری بھی مل گئی تھی۔ مگر پیٹر چلا جاتا تو اس کا نعم البدل ملنا مشکل تھا۔

وخی زبان، ادب اور معاشرت پر ایک نظر

(ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کی وقیع لسانی تحقیق)

☆تبصرہ نگار .... پروفیسر غازی علم الدین

پاکستان کے شمالی علاقوں کا شمار دنیا کے کثیر اللسانی مقامات میں ہوتا ہے۔ یہاں بولی جانے والی اہم زبانوں میں شینا، بلتی، بروشسکی، وخی، گوجری اور کھوار شامل ہیں لیکن ان سب میں رابطے کی زبان، ہماری قومی زبان اُردو ہے۔ کتاب زیرِ بحث تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور مذہبی اہمیت کی حامل وخی زبان، اس کے ادب اور معاشرت کا عمیق تحقیقی مطالعہ ہے جو ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ وخی زبان و ادب کی تاریخ اور اس کے بولنے والوں کی معاشرت کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔ لسانیات کا موضوع ایک گہرا اور بے کار موضوع ہے جس پر وہی قلم اٹھا سکتا ہے جسے کئی زبانوں پر عبور حاصل ہو اور زبانوں کے باہمی رشتوں کا رمز شناس ہو۔ ایسی ہی ایک مثال دس سے زائد تحقیقی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کی ہے جن کے مطالعے اور تحقیق کی ایک نہیں، کئی جہتیں اور پرتیں ہیں۔ زبان و ادب، اقبالیات، تاریخ، بین الاقوامی تعلقات اور قومی سلامتی کے مطالعہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ تاریخ میں ایم۔ اے، بی، ایم فل، پی ایچ۔ ڈی اور اقبالیات میں ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں پنجابی زبان و ادب میں ایم۔ اے اور ڈیفنس سٹڈیز میں ایم۔ ایس سی کی ڈگریاں، قومی سلامتی میں پوسٹ

کو بکواینٹ ڈپلومہ بھی رکھتے ہیں۔ سیاسیات پاکستان، تحریک و تاریخ پاکستان اور بین الاقوامی تعلقات پر ان کے ستر (۷۰) سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی جو ادا لوگوں کو بہت بھاتی ہے وہ ان کی دین داری، حب الوطنی، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے ان کی والہانہ عقیدت ہے۔ آپ ایک سچے کھرے اور مخلص پاکستانی ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کو چند ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں پاکستان کے شمالی حصوں میں پائی جانے والی لسانی رنگا رنگی اور معاشرتی تنوع کے پس منظر کا جامع تحقیقی تجزیہ پیش کیا گیا ہے ..... وخی برادری کے وطن مولوف واخان کی پٹی کے جغرافیہ، آب و ہوا، تاریخ اور اس علاقے میں بسنے والی مختلف برادریوں کے بارے میں معلومات دوسرے باب میں دی گئی ہیں..... واخان کی پٹی کے علاوہ بھی پاکستان کے مختلف شمالی علاقوں مثلاً چترال اور گوجال میں وخی برادری آباد ہے۔ تیسرے باب میں ان کے احوال مرقوم ہیں..... مذہب اور مذہبی روایات براہ راست زبان پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ چوتھے باب میں وخی برادری کی مذہبی بنیادوں کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مذہب نے زبانوں کو کس طرح متاثر کیا ہے..... پانچویں باب میں وخی زبان کے لسانی ماخذ کے کھوج، رسم الخط، صوتیات، ذخیرۂ الفاظ اور علاقائی بولیوں سے متعلق تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا گیا ہے۔ وخی بولنے والوں کے درمیان دو یا دو سے زیادہ زبانیں جاننے والوں کے لسانی رویوں کے بارے میں بھی جائزہ لیا گیا ہے ...
چھٹے باب میں غیر تحریری وخی زبان و ادب کا خوب صورت اور جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ وخی شاعری کے نمونے مثلاً لوک گیت، رباعیاں، لوریاں، ضرب الامثال، کہاوتیں، پہیلیاں، محاوراتی فقرے اور کہانیاں شامل ہیں۔

وخی دراصل وادئ واخان کے باشندوں کی زبان ہے۔ اس کا تعلق پامیری زبانوں کے جنوبی گروہ سے ہے۔ ان زبانوں کا نہ تو کوئی رسم الخط ہے اور نہ ہی تحریر میں لائی جاتی ہیں بلکہ انہیں صرف بولنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ وخی بھی ابھی تک ایک غیر تحریری زبان ہے اور صوتیاتی تراکیب تک محدود ہے۔ وخی زبان پر فارسی کا بہت گہرا اثر ہے۔ چوں کہ پاکستان کی وخی برادری کا تعلق اسماعیلی شیعہ برادری سے ہے، اس لئے فارسی زبان و ادب پڑھنے اور سیکھنے کا رجحان بھی ہے۔ پاکستان میں وخی برادری کی بڑی آبادیاں چترال کے انتہائی شمالی مشرقی حصے بروغل، بالائی رشان اور اشکومن کی وادیوں میں اور ہنزہ کی وادیوں گوجال، شمشال اور چپورسن میں موجود ہیں۔ وخی آبادیوں میں خواندگی کا تناسب ساٹھ فی صد ہے۔ مرد وادی کے ساتھ اردو بھی بولتے ہیں جب کہ اس سے زیادہ خواتین بھی اردو بول سکتی ہے۔

فاضل مصنف کے مطابق وخی معاشرت کا ایک اہم پہلو علاقے میں امن وامان کی بہترین صورت حال اور ہم آہنگی کی فضا ہے۔ وخی ثقافت کے تحفظ اور علاقے کی ترقی کے لئے ثقافتی، سماجی اور مذہبی تنظیمیں قائم ہیں۔ وخی برادری کی ثقافتی زندگی میں مذہب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مذہبی طور طریقوں نے وخی لوگوں کی روزمرہ زندگی اور ثقافت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مذہبی گیت گانا اجتماعی عبادت کا مرکزی جزو ہے۔ ان مذہبی گیتوں کو گنان کہا جاتا ہے۔ وخی برادری میں کثیر اللسانیت کا رجحان موجود ہے۔ وخیوں نے وسیع رابطے کی زبانیں اختیار کرنے کی طرف ایک مؤثر اور مثبت رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ وہ ایک یا ایک سے زیادہ ہمسایہ زبانوں میں مہارت حاصل کر لیں۔ وخی

زبان کے دانش ور، مفکرین، علماء اور مذہبی پیش وا ایک سے زیادہ زبانیں مثلاً فارسی اور انگریزی وغیرہ جانتے تھے۔

فاضل مصنف کے مطابق تمام وخی ادب غیر تحریری ہے اور اسے نسل در نسل حافظے میں محفوظ کیا گیا ہے۔ اس ادب میں مختلف شاعرانہ اظہار اور کہانیاں شامل ہیں۔ وخی ذخیرۂ الفاظ کو برقرار رکھنے میں وخی شعراء، موسیقاروں اور گلوکاروں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ وخی زبان کی مردانہ اور نسائی شاعری میں ایک واضح امتیاز موجود ہے مثلاً شادی بیاہ کے گیت، عام نغمات، مذہبی گیت گانا اور داستان گوئی روایتی طور پر مردوں کا کام ہے۔ دوسری طرف بلبلک وخی لوک گیتوں کی ایک معروف قسم ہے جو صرف اور صرف خواتین کی شاعری ہے۔ گلہ بان عورتیں موسم گرما میں پہاڑی چراگاہوں پر جاتے وقت اپنے گاؤں اور اہل خانہ کو چھوڑتی ہیں تو جدائی اور تڑپ کے جذبات کا اظہار ان گیتوں میں کرتی ہیں۔ وخی شاعری کی تمام اصناف کا مرکزی خیال ماں باپ کی محبت اور خاندان سے جدائی وغیرہ ہوتے ہیں۔

فاضل مصنف کے مطابق وخی ادب کا بڑا حصہ داستان گوئی پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں میں قسمت، گناہ، جبر، وفاداری، بہادری، بزدلی، فتح اور شکست جیسی انسانی اقدار کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ تاہم وخی لوک داستانوں کی اکثریت کو ابھی تک ضبط تحریر میں محفوظ نہیں کیا جاسکا۔ وخی زبان کو اگرچہ بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے تو معدومیت کا کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں تاہم اس کے لوک ادب، ذخیرۂ الفاظ، محاوروں اور دوسرے لسانی ورثے کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

یہ کتاب اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کے لئے راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے حواشی بڑی محنت سے تحقیقی اسلوب کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ حواشی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے کس طرح تحقیق کے مشکل اور تاریک گوشوں کھدروں کو چھان مارا ہے اور اصل مصادر اور منابع تک رسائی حاصل کی ہے۔ بعض حواشی تو ایک مستقل تحقیقی مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تحقیقی پیش کش اپنے موضوع کے لحاظ سے لسانیاتی ادب میں ایک مفید، لائق تحسین اور وقیع اضافہ ہے جو فاضل محقق کی محنت شاقہ، تحقیقی مہارت اور ادبی اسلوب نگارش کی اچھی مثال ہے۔ فاضل محقق نے بکھرے ہوئے دستاویزی مواد کو بڑی محنت سے جمع کیا اور ترتیب و تہذیب کر کے اسے مربوط اور منظم انداز میں پیش کیا ہے۔

کسی کتاب کے مستند ہونے کا اولین معیار یہ ہے کہ اس کے مآخذ و مصادر کو دیکھا جائے کہ وہ کس درجے کے ہیں۔ زیر نظر کتاب یقیناً اس درجہ کی ہے کہ اسے لسانیات کے اس ذخیرے میں دیکھا جاسکے جو اہل علم و فضل کی نظر میں وقیع، مستند اور قابل قدر ہے۔ دوسرا معیار اس کا اسلوب اور انداز بیان ہے۔ یہ کتاب اس اعلیٰ معیار پر بھی پورا اترتی ہے۔ فاضل مصنف اور ادارہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد) مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے توسط سے یہ پیش کش زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

تعارف مضمون نگار:

پروفیسر غازی علم الدین

مصنف:

ا۔ لسانی مطالعے ۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۔ تنقیدی و تجزیاتی زاویے ۔ بزم تخلیق ادب، پاکستان کراچی

۳۔ میزان فکر و فن ۔ مکتبۂ جمال، اردو بازار لاہور

❖✱❖

ذہنِ لاشعور کبھی نہیں سوتا، سوانے والا ذہنِ شعور ہے۔

شعور اور لاشعور

شازیہ محسن

انسانی جسم کے بعض اعضاء مثلاً ہاتھ، پاؤں وغیرہ دماغ کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں مگر بعض مثلاً دل، نبض وغیرہ ازخود سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اگر یہ رک جائیں تو یوں کہا جاتا ہے کہ انسان فوت ہو گیا ہے۔ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے شعور اور لاشعور ہیں۔ اوّل الذکر سے ہم بحالت بیداری اور اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتے ہیں مگر موخر الذکر نیند میں بھی کام کرتا اور اپنی مرضی کے مطابق سوچتا رہتا ہے۔ ایسے عمل کو خواب کہتے ہیں۔

لاشعوری دماغ اصل میں ایک بہت بڑی قوت ہے، یہ نا صرف شعوری دماغ کا ممد و معاون ہے بلکہ اپنے طور پر بھی سوچنے سمجھنے اور مسائل کے حل کرنے کی

اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جو کچھ پڑھتے یا سیکھتے ہیں لاشعوری دماغ اسے اپنے ہاں محفوظ کر لیتا ہے اور بہ وقتِ ضرورت شعوری دماغ کے حوالے کر دیتا ہے۔ مثلاً شروع میں ہمیں ٹائپ سیکھنے میں دقت پیش آتی ہے مگر بعد میں لاشعور ازخود یا شعوری دماغ سے تھوڑی سی مدد لے کر باآسانی ٹائپ کر لیتا ہے۔

یاد رہے کہ لاشعوری دماغ کو من یا جی یا نفس بھی کہتے ہیں۔ جب ہم سوتے ہیں تو شعوری دماغ بھی سو جاتا ہے مگر لاشعوری برابر اور مسلسل بیدار رہتا ہے اور کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے چونکہ بحالتِ خواب اسے شعوری دماغ کی معاونت حاصل نہیں ہوتی اس لئے اسکی سوچ بچار کا بیشتر حصہ بیدار ہوتے ہی روپوش ہو جاتا ہے۔ تاہم طاقتور لاشعوری دماغ بحالتِ خواب بہت کام کی باتیں سوچتا اور انہیں انسان کے بیدار ہونے پر شعوری دماغ تک پہنچا دیتا ہے۔

آپ کے ذہنِ شعوری کا کام لاشعور کے ہاتھ میں ہے۔ لاشعور میں بچپن کی تمام باتیں اور یادیں محفوظ رہتی ہیں۔ جب تک آپ کا جسم زندہ ہے، آپ کے ذہنِ لاشعور میں آپ کی پیدائش کے وقت تک کی یادیں محفوظ رہیں گی۔ لاشعور میں آپ کی دبی ہوئی خواہشیں، ارادے اور ولولے زندہ رہتے ہیں۔ ذہنِ لاشعور ایک قوت ہے جو آپ سے ہر کام کراتی ہے، آپ کو زندگی کی ڈگر پر چلاتی اور آپ کی منزل کا تعین کرتی ہے۔

ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ جونہی معلم جماعت کے کمرے سے ذرا باہر جاتا ہے تو طالب علم کام کو چھوڑ کر اپنی من مانی کرنے اور شور شرابہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں مگر جونہی معلم واپس آتا ہے سب پھر سے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے تربیت یافتہ اور سمجھدار استاد کمرے سے باہر جانے سے پیشتر بچوں کو کام دے کر تاکید کر دیتا ہے کہ اسے ابھی اور اچھی طرح کرو، میں جلد واپس آ کر دیکھتا ہوں۔ اس پر وہ شرارتوں کی طرف مائل ہونے کی بجائے اپنے کام کی تکمیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی حال ہمارے لاشعور کا ہے۔ وہ ہمارے سوتے ہی اپنی من مانی کارروائیوں میں مصروف ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو غیر ضروری اور خطرناک موضوعات پر غور و فکر کر کے ہمیں ڈرا دیتا ہے۔ دانا لوگ اپنی اس عظیم خداداد قوت سے بڑے بڑے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ آپ بھی اس سے بطریقِ ذیل استفادہ کیجئے۔

☆ پاکیزہ ماحول میں سوئیں، آپ کا جسم اور لباس و بستر پاک صاف بلکہ معطر ہو۔

☆ نماز پڑھ کر اور اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے سوئیں۔

☆ کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ ہوں آپ اسے سپردِ پروردگار کر کے اپنے آپ کو تسلی دیں کہ میرا خالق یقیناً میرا حامی و ناصر ہے، وہ مسبب الاسباب ہے، وہ یقیناً میری از غائب مدد کرے گا یا مجھے اس تکلیف کے برداشت کرنے کی توفیق دے گا۔

☆ دن بھر کام کرنے کی وجہ سے آپ کے ہاتھ یقیناً میلے ہو جاتے ہیں مگر آپ آخر میں انہیں دھو کر پھر سے پاک صاف کر لیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح دن بھر کام کاج کے دوران آپ کو کئی خوشگوار اور کئی ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں جن سے آپ کا دماغ خاصا متاثر ہوتا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ سونے سے پہلے آپ اپنے دماغ کو پریشانیوں سے آزاد کر کے سوئیں۔ اس مقصد کے لئے آپ اپنے دوست سے جی بہلائیں۔ امید افزا تصورات کو اپنے ذہن میں لائیں اور کچھ بھی نہ ہو سکے تو طربیہ اشعار گائیں اور لطیفے پڑھیں۔ الغرض آپ لاشعور پر آلام کا بوجھ ڈال کر سونے کی بجائے اسے خوش خوش رخصت کریں۔

☆ اس سے پہلے کہ آپ پر نیند کا غلبہ طاری ہو آپ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کا

شکریہ ادا کریں اور اس اپنی ضرورت کی چیزوں کو اس طرح طلب کریں جیسے ایک بچہ اپنے والدین سے کوئی چیز طلب کرتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے لاشعور یا اپنے آپ سے تین دفعہ مخاطب ہو کر کہیں کہ وہ ضروریات کو پورا کرنے اور مسائل کو سلجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگے اور سوچ کر مفید اور قابل عمل تجاویز بتائے۔ آپ کے اس عمل سے آپ کا لاشعور اپنی من مانی کارروائیاں کرنے اور غلط سلط سوچنے کی بجائے آپ کے حکم کے مطابق مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہو جائے گا۔ مثلاً آپ مکان بنوانا چاہتے یا کوئی چیز یاد کرنا چاہتے ہیں تو یہ مسئلہ لاشعور کے حوالے کر کے سو جائیں۔ وہ ساری رات اس پر غور کرے گا اور صبح سویرے مطلوبہ وسائل، تجاویز اور طریقے بتائے گا۔ اسی طرح اگر آپ کہیں رقم رکھ کر بھول گئے ہیں تو پریشان ہونے کی بجائے اس مشکل کو لاشعور کے حوالے کر کے سو جائیں وہ صبح سویرے آپ کے شعوری دماغ کو اس جگہ کی نشاندہی کر دے گا۔

یاد رہے کہ آپ کو ہمیشہ وقت مقررہ پر سونا چاہیے کیونکہ دیر کی صورت میں نیند اڑ جاتی ہے اور پھر یہ مشکل واپس آتی ہے۔ بڑے بڑے موجد اور مفکر اس قوت سے بہت فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ سوتے وقت اپنے مسائل خوشگوار انداز میں لاشعور کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جب وہ خود بے فکر ہو کر گہری نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں تو لاشعور اپنے کام میں مصروف ہوتا اور مسئلے کے حل کو تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ لاشعور کو رام کرنا اور اس سے مفید مطلب کام لینا کافی صبر آزما ہے۔ اس میں خاصی مشق اور باقاعدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع میں یہ عمل آپ کو بے سود بلکہ فضول معلوم ہوگا مگر مشق و ورزش کے بعد آپ کو کامیابی کی روشنی بفضل تعالیٰ یقیناً دکھائی دے گی۔ اس کا بہت گہرا اور عمدہ اثر ذہنی قوت، یکسوئی اور ثابت قدمی پر بھی ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ نیوٹن نا صرف رات کو بلکہ دن کو بھی اکثر خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتا تھا۔ ایک دفعہ نوکر اس کے سامنے کھانا رکھ کر چلا گیا وہ کچھ دیر بعد خالی برتن واپس لینے کے لئے آیا تو دیکھا کہ نیوٹن اسی طرح بے خبری کے عالم میں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا ہے اس پر اسے خیال آیا کہ کھانے کو کیوں ٹھنڈا اور باسی ہونے دوں۔ خود ہی کیوں نہ کھا لوں۔ یہ سوچ کر سارا کھانا نیوٹن کے سامنے بیٹھ کر کھا لیا اور برتن وہیں چھوڑ کر کسی اور کام میں مصروف ہو گیا۔ نیوٹن جب لاشعوری کے عالم سے شعوری عالم میں واپس آیا تو پس خوردہ کو دیکھ کر یہ باور کر لیا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ اسے بھوک کی شدت ذرا محسوس نہ ہوئی۔

نیوٹن اگرچہ کھانے کی نعمت سے محروم ہو گیا تھا مگر اس نے اس عالم میں (کشش ثقل) جیسے مسئلے کو حل کر کے دنیا کے نامور ترین سائنس دانوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لیا تھا۔ اسی طرح کئی مفکر اسی قوت کے طفیل کئی کئی دن بھوکے پیاسے رہتے اور آخر وجدان سے ہمکنار ہونے لگتے۔ وجدان وہ قوت ہے جو انسانی سوچ کو جلا دیتی اور مسائل کے حل کرنے کے طریقے از غائب مگر لاشعور کے ذریعے بتاتی ہے۔

اہل دل لوگ اپنے رب تک پہنچنے کے لئے مراقبہ کرنے یعنی یکسوئی اور خلوص دل سے اللہ کے ساتھ لو لگانے اور آخرکار وجدان حاصل کرنے اور اس کی قدرت کے اسرار معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

موجد، مفکر اور سائنس دانوں کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے وہ بھی مایوس ہونے کی بجائے مسئلہ کو لاشعور کے حوالے کر کے اطمینان سے سو جاتے ہیں۔ لاشعور بحالت خواب مسئلے پر غور کرتا اور بار بار سوچتا ہے اور فجر صبح تک اس کا ایک کامیاب حل پیش کر دیتا ہے۔

☐❖☐

آخری شب

(پشاور سکول حملہ کے المناک پس منظر میں)

دستگیر شہزاد

میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے'

سرد سناٹوں کے موسم میں

تمہارا نام کیا ہے؟

تم کہاں کے رہنے والے ہو

تمہاری بدنمائی، زردیاہی کا سبب کیا ہے؟

میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے

میں کہتا ہوں میرا نام گل خان ہے، پشاور کا باسی تھا

مگر اب تو میرا پہاڑ مسکن ہیں

میں کہتا ہوں میرا نام ہے نور الٰہی

اور وطن ہوشیار پور تھا پہلے مگر اب تو میرا لاہور مسکن ہے

یہ سب کذب دریا ہے جھوٹ ہے ہمزاد کہتا ہے

میرا ہمزاد مجھ سے پوچھتا ہے

تمہارا نام گل خان ہے تو پھر

تمہارے نام سے کیوں لوگ پتھرا گئے سارے

مدرسے کیوں اب نہیں کھلتے ؟

تمہارا نام غلام رسول ہے تو اتنا بتلا دو

تمہارے نام سے کیوں شہر کانپ اٹھتے ہیں

شبد ساکت ہوئے کب کے

تمہارا نام ہے نور الٰہی تو یہ سچ کہنا

اذان پانچوں پہر تو مسجدوں میں اب بھی ہوتی ہے

نمازی کیوں نہیں ہوتے ؟

میرا ہمزاد مجھ کو گھورتا ہے خون آلود نگاہوں سے

وہ کہتا ہے

تمہارا نام گل خان، غلام رسول یا نور الٰہی ہے

تو پھر یہ آستینوں میں لہو آلود خنجر کس لئے ہیں؟

دہائی کیوں تمہارے نام کی دیتے ہیں یہ اٹھتے جنازے

سرنگوں سر پیٹتی مائیں

تڑپ کر چیختا ہے، مجھ سے پھر ہمزاد کہتا ہے

غلط ہے تم کہ گل خان، غلام رسول یا نور الٰہی ہو

مجھے تو ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے ان ناموں کے پردوں میں

وہ جس نے مدرسوں، شہروں اور مسجدوں کو

قتل گاہوں میں بدل ڈالا، تم ہی نے نسل آدم کو خدا کے نام پر

ایسے تشدد ریز خانوں میں سمویا ہے

تمہاری رُوسیاہی، بدنمائی کا سبب یہ ہے

کہ تم تخریب کے بیٹے ہو، تم مغرب کے ساکن ہو

تمہارے خونچکاں اس مرگ آسا کھیل کی

یہ آخری شب ہے، میرا ہمزاد کہتا ہے یہ چپکے سے

بھلا دو تم یہ کہ گل خان، غلام رسول یا نور الٰہی ہو

صبح کی یہ آنکھوں میں آج اپنا نام تم پڑھ لو

تمہارے مرگ آسا کھیل کی، یہ آخری شب ہے

☆○☆

دُعا اور بددُعا

شاہو ایک سکھ ڈاکو کے منہ سے اتنی کھری اور سامنے کی بات سن کر شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ واقعی اگر اس ہندو لڑکی کی بددعا میں کچھ اثر ہوتا تو اب تک اس کو اندھا ہو جانا چاہیے تھا مگر اسے اس کے رب نے بچائے رکھا۔

عبدالحفیظ بشر

والدین نے اس کا نام شاد دین رکھا تھا۔ آگے چل کر وہ شاہو کے نام سے پکارا جانے لگا۔ وہ ذات کا بھٹی راجپوت تھا۔ وراثت میں اس کے حصے میں دس بارہ ایکڑ اراضی تھی۔ کھیتی باڑی سے اس کی گزر اوقات ہوتی۔ اچھا وقت گزر رہا تھا۔ ایک دفعہ بارشیں کم ہوئیں۔ اس وقت نہری پانی کا انتظام تک نہ تھا۔ کنوؤں کے پانی سے فصلیں کاشت کی جاتیں۔ بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے کنوئیں بھی خشک ہو گئے اور خشک سالی نے آن گھیرا۔ لوگ اور مال مویشی بھوک پیاس سے مرنے لگے۔ کچھ لوگ نو وقتی طور پر نقل مکانی کر گئے اور کچھ خشک سالی کا مقابلہ کرنے لگے اور کچھ لوگ ساہوکاروں سے سود پر رقم لے کر گزر اوقات کرنے لگے۔ شاد دین نے بھی زندہ رہنے کے لئے پانچ سو روپے کی رقم ساتھ والے گاؤں کے ایک ساہوکار لالہ سوہن چند سے سود پر لی کہ جونہی حالات سازگار ہو گئے وہ رقم بمعہ سود ساہوکار کو واپس کر دے گا۔

سال دو سال اسی طرح گزر گئے۔ شاد دین قرض واپس نہ کر سکا۔ لالہ سوہن چند کو اصل رقم کی بجائے سود سے دلچسپی تھی۔ اس لئے وہ شاد دین سے سود کا تقاضا کرتا۔ شاد دین وعدے کے مطابق سود کی رقم اس کو کسی نہ کسی طرح ادا کرتا رہا۔ اب بارشیں شروع ہوئیں اور قحط سالی کا بحران بڑی حد تک ٹل گیا۔ لوگوں نے زمین پر کاشت کاری شروع کر دی۔ بازی سونے کی فصل پابندی سے زمین اگلنے لگی اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

جب بھی فصل تیار ہوتی۔ ساہوکار پابندی سے آتا اور شاد دین سے اپنے حصے کی فصل اٹھا لیتا۔ پانچ سال کا عرصہ یوں ہی بیت گیا لیکن ساہوکار کی رقم ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ ایک مرتبہ جب ساہوکار کھیت سے فصل اٹھانے لگا تو شاد دین نے روک لیا۔

''لالہ جی! میں تو سود دیتے دیتے تھک گیا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''آخر تمہاری رقم کب پوری ہو گی؟''

''میں نے تو اب تک صرف سود ہی وصول کیا ہے''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''اصل رقم تیری طرف پانچ سو روپیہ جوں کی توں ہے''۔

لالے کی زبانی اصل رقم کا سن کر شاد دین پریشان ہو گیا۔

''لالہ جی! یہ تو سراسر ناانصافی اور ظلم ہے''۔ شاد دین نے غصے سے بھڑک کر کہا۔ ''اب میں مزید ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔ آئندہ میری زمین پر فصل اٹھانے کے لئے قدم نہ رکھنا ورنہ تمہاری اور تمہارے آدمیوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ پورا گاؤں تمہارا حشر دیکھے گا''۔

لالہ سوہن چند نے یہ سنا تو پریشان ہو گیا۔

''آج تو تم بڑا بڑھ چڑھ کر بول رہے ہو شاد دین!'' لالہ نے کہا۔ ''جب قرضہ لینے آئے تھے تو اس وقت بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔ کیا میں نے تمہیں اس وقت دعوت نامہ بھیجا تھا کہ آؤ اور قرضہ لے جاؤ۔ یاد رکھو، میری رقم مبلغ پانچ سو روپیہ تمہاری طرف واجب الادا ہے اور وہ تمہیں ہر حالت میں ادا کرنا ہو گا۔ رقم کا اسٹامپ میرے پاس محفوظ ہے۔ اگر رقم یہاں نہیں دو گے تو کورٹ کچہری اور تھانے تک تمہیں لے جاؤں گا۔ کسی غلط فہمی میں نہ رہنا''۔

''دیکھا جائے گا''۔ شاد دین نے کہا۔ ''بس اتنا کرو کہ یہاں سے تم اپنے ساتھیوں کو لے جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے میں طیش میں آ کر کچھ کر نہ بیٹھوں''۔

''رام رام''۔ لالہ سوہن چند بولا۔ ''کیا تم جبر دا کو ہو؟ یا پھر کوئی بہت بڑے بدمعاش ہو۔ اپنی اوقات میں رہو۔ مجھے خواہ مخواہ ڈرا دھمکا رہے ہو۔ میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ دیکھو لوگو کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ایک چوری اوپر سے سینہ زوری''۔

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں لالہ!'' شاد

ربن نے گرج کر کہا۔ "جو کہا ہے اس کو سمجھو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ چور اچکا کہیں کا، غریبوں کا خون چوسنے والا بنیا۔ تم تسلی دے کر حویلی پر قبضہ جما لینے ہو۔ تم نے مجھے قرضہ دے کر کوئی احسان نہیں کیا اس کے عوض اصل زر سے بھی زیادہ وصول پا لی ہے۔ اس کے باوجود تمہارے کھاتے میں رقم میرے ذمہ بدستور ہے۔ جاؤ جو مرضی چاہے کرلو اب تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا"۔

شاہ دین نے اپنے اندر کا غبار اور غصہ نکالتے ہوئے ساہوکار سے کہا۔

"تم نے جتنی بکواس کرنی تھی کر لی"۔ لالہ مول چند نے کہا۔ "تمہارا غرور گھمنڈ بہت جلد اتار دوں گا۔ جس شخص نے بھی میری رقم واپس کرنے سے انکار کیا ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہوا اور اسے جیل کی ہوا کھانا پڑی ہے۔ لگتا ہے تمہارا بھی جیل کی یاترا کرنے کو جی چاہ رہا ہے"۔

باتوں باتوں میں تلخ کلامی بڑھ گئی اور نوبت گالی گلوچ کے بعد لڑائی جھگڑے تک آن پہنچی۔

"اس کے ڈنگر کھول کر ساتھ لے چلو اوئے!" لالہ مول چند نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "جب یہ رقم واپس کرے گا تو اپنے مال مویشی واپس لے لے گا"۔ لالہ جی نے اپنی گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

لالہ جی کے کہنے کی دیر تھی کہ ان کے آدمیوں نے جو تعداد میں پانچ تھے، شاہ دین کے رسے سے مال مویشی کھولنا شروع کر دیئے۔ ابھی وہ ڈنگر کھول ہی رہے تھے کہ شاہ دین کے اندر سویا ہوا اکھڑ راجپوت بیدار ہو گیا اور اس نے حسب بروقت ضائع کئے بغیر لالہ جی کے ایک آدمی سے ڈانگ چھین لی اور پہلا وار لالہ جی پر کیا جو گھوڑی پر بیٹھا حکم دے رہا تھا۔ وار لالہ جی کی کمر پر لگا اور وہ الٹ کر گھوڑی سے زمین پر آن گرا اور چیخنے چلانے لگا۔ اس کے بعد شاہ دین نے اس ڈانگ سے لالہ جی کے سارے آدمیوں کو زخمی کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہاں سے چیختے چلاتے زخمی حالت میں بھاگ نکلے۔ افراتفری میں لالہ جی کی گھوڑی وہاں رہ گئی۔ اتنے میں ارد گرد کھیتوں میں کام کرنے والے بھی لوگ شاہ دین کی مدد کو آ گئے لیکن لالہ جی اور اس کے آدمی وہاں سے جا چکے تھے۔ لوگوں نے شاہ دین کو حوصلہ تسلی دی کہ اب لالہ جی کے آدمی آئے تو ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

لالہ مول چند کو بھی اس بات کا رنج تھا کہ اس کی بڑی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس طرح لوگوں پر سے اس کا رعب ختم ہو جاتا۔ وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے پہنچا۔ تھانیدار بھی ایک ہندو تھا۔ وہاں رپورٹ درج کروائی کہ ایک مسلا جس کا نام شاہ دین ہے اور اس کا مقروض ہے۔ رقم دینے سے انکاری ہے۔ دوسرے اس نے قرض دینے کی بجائے لڑائی جھگڑا کیا ہے اور ہمارے آدمیوں کو مار پیٹ کر کے لہولہان بھی کیا اور میری گھوڑی بھی اس نے چھین لی ہے۔

لالہ مول چند نے تھانیدار کی مٹھی گرم کر دی اور واضح سے کہا کہ اس بچ کو سبق سکھانا ہے۔

تھانیدار نے لالہ جی کی رام کہانی سنی اور پھر اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایف آئی آر درج کی۔ جس میں لڑائی جھگڑا، مار کٹائی، رقم کی عدم ادائیگی اور گھوڑی چھین لینے چوری چکاری کی دفعات شامل کر کے شاہ دین کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

شام کو تھانیدار پولیس کی نفری لے کر شاہ دین کے ڈیرے پر پہنچا جو اپنے مال مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔

شاہ دین اچانک پولیس کی نفری دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ سب کچھ لالہ جی کی انتقامی کارروائی ہے۔ تاہم شاہ دین گھبرایا بالکل نہیں اور گرفتاری دے دی۔ تھانیدار ہندو تھا اور اس نے لالہ سے سازباز کر کے

رشوت لے لی تھی۔ اس نے پی الف آئی آر درج کر کے اور موقع پر موجود شہادتیں قلمبند کر کے اسے زیر حراست رکھا۔ دوسرے دن شاہ دین کے حواری اور گاؤں کا نمبردار شاہ دین کی حمایت کے لئے تھانے پہنچے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ تھانیدار نے کہا۔ آپ لوگ عدالت میں جا کر ضمانت کرا سکتے ہیں۔ پولیس اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ ضمانت کے لئے وکیل کی خدمات حاصل کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

دراصل تقسیم ہند سے پہلے یہ چیز اکثر دیکھنے کو ملتی تھی کہ ہندو پولیس آفیسر ہندو کی حمایت کرتا اور مسلمان پولیس آفیسر مسلمان کی مدد کرتا۔ سکھ آفیسر تقریباً تقریباً اس قسم کے مقدمات میں غیر جانبداری اختیار کرتا۔ آگے چل کر یہی وجہ دو قومی نظریے کا باعث بنی کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ ان کا مذہب تہذیب اور نظریات الگ الگ ہیں۔

بہرکیف کچھ دیر مقدمہ عدالت میں زیر سماعت رہا۔ دونوں طرف سے وکلاء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مقدمہ چونکہ ہر لحاظ سے لالہ سول چند کے حق میں تھا۔ عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور شاہ دین کو پانچ سال کی سزا سنا دی گئی اور اسے جیل بھیج دیا گیا۔

یہاں جیل میں شاہ دین کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا اور اس کے اندر انتقام کی آگ صبح و شام جلنے لگی کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور وہ اس ناانصافی کا بدلہ ہر حالت میں لے گا۔

جیل میں شاہ دین کو طرح طرح کی مشکلیں پیش آئیں کیونکہ جیل کی بھی ایک اپنی دنیا ہوتی ہے۔ وہاں جیل میں ہر قماش کا آدمی چور ڈکیت اور نامی گرامی قاتل جمع ہوتے ہیں اور وہ ہر نئے آنے والے قیدی پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے دادا گیری کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو جیل کا عملہ ہوتا ہے وہ جیل میں قیدیوں کے لئے ایک طرح کے جلاد ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں شاہ دین کو بھی جیل میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ تاہم آگے چل کر اس کی دوستی ایک سکھ قیدی سردار بہرام سنگھ سے ہو گئی جو قتل اور ڈکیتی جیسے جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہا تھا۔ اس نے شاہ دین کو جیل میں ہر قسم کا تحفظ فراہم کیا۔ سردار جی کے ملاقاتی ہر ہفتہ اسے ملنے آتے جاتے رہتے اور کھانے پینے کی چیزیں بہ کثرت اسے جیل میں دے جاتے۔ اب شاہ دین کو کھانے پینے اور مشقت کرنے کی فکر نہ رہی۔ سردار بہرام سنگھ اور شاہ دین کی پکی دوستی ہو گئی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگے کہ جیل سے رہائی کے بعد دونوں مل جل کر اپنے اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

ابھی جیل میں آئے شاہ دین کو دو ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ اسے خبر ملی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کی والدہ بھی اپنے بیٹے کے غم میں سخت علیل ہے۔ اس خبر نے شاہ دین کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا۔ اب اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ والدہ کا بھی خیال رکھتا تھا۔ جیل میں شاہ دین نے اس غم کو دور کرنے کے لئے اپنے اللہ سے ناطہ جوڑ لیا۔ وہ اب پانچ وقت کا نمازی بن گیا اور صبح کے وقت جیل کی مسجد میں امام صاحب سے قرآن پاک کا درس بھی لیتا۔ اب وہ قدرے مطمئن حال ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کا چھوٹا بھائی بھی اس سے ملاقات کرنے جیل آتا تو شاہ دین کو گاؤں اور اپنے گھر کے حالات سے آگاہ بھی کر دیتا۔ شاہ دین اپنے بھائی کو کہتا کہ وہ ہمت سے کام لے اور اپنی ماں کا خیال رکھے۔ ان شاء اللہ سزا ختم ہونے پر وہ واپس گاؤں پہنچ جائے گا۔

صبح و شام کا عمل جاری رہا اسی دوران شاہ دین کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ خبر بھی شاہ دین پر بجلی بن کے گری لیکن اس صدمے کو بھی اس نے بڑی ہمت اور صبر

سے برداشت کیا اور اس کو اللہ کی رضا سمجھا۔ اب جیل میں شاہ دین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اب اس نے جیل سے رہائی کے بعد لالہ موتی چند سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ساری مصیبتیں اس پر اور اس کے خاندان پر لالہ جی کی وجہ سے آئی تھیں۔ جب بھی اسے جیل سے رہائی ملی سب سے پہلے وہ لالے سے بدلہ لے گا اور اسے قتل کر دے گا۔ جس جس نے بھی اس سے قرضہ لے رکھا ہے۔ سارے کے سارے بہی کھاتے وغیرہ جلا دے گا۔ اسی دوران شاہ دین جیل میں ایک اور صدمے سے دوچار ہوا۔ اس کے جگری دوست سردار بہرام سنگھ کی سزا ختم ہوئی اور اسے جیل سے رہائی ملی۔ سردار بہرام سنگھ جیل سے جاتے وقت شاہ دین سے گلے لگ کر ملا۔

"میں تو جیل سے رخصت ہو رہا ہوں یارا" اس نے کہا۔ "لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جونہی تمہاری سزا ختم ہو گی جیل سے رہائی ملنے پر سیدھا میرے گاؤں آنا۔ جب آؤ گے تو تمہارے دشمن سے دو دو ہاتھ کریں گے۔ یہ دیکھو میرے گاؤں کا پتہ۔ میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ اس دوران میں یا میرے آدمی تمہاری ملاقات کرنے آتے رہیں گے۔ میں نے جیل کے داروغہ کو بھی تاکید کر دی ہے کہ میری عدم موجودگی میں میرے دوست شاہ دین کو جیل میں کوئی تنگ نہ کرے۔ میرے پاس کچھ رقم بھی ہے یہ بھی اپنے پاس رکھ لو شاید تمہارے کام آئے۔ خاص کر جب تم جیل سے رہا ہو گے دیکھو!"

شاہ دین نے یہ صدمہ بھی بڑے حوصلے سے برداشت کیا کیونکہ سردار بہرام سنگھ کی وجہ سے اُسے جیل میں بہت آرام تھا۔ تاہم مجبوری تھی۔ ابھی شاہ دین کی جیل سے رہائی کے لئے ایک سال کا عرصہ باقی تھا لیکن اب اس کے لئے ایک دن بھی ایک سال کے برابر نظر آتا وہ جلد از جلد جیل سے رہائی چاہتا تھا۔ اب وہ جیل سے فرار کی سوچ فکر کرنے لگا۔

اسی دوران ایک ہندو جیل سپرنٹنڈنٹ تعینات ہو کر آیا وہ جیل باہر مندر بنانے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا کیونکہ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی اور اس نے دس بارہ قیدیوں کو جیل کے مندر کی تعمیر کے لئے مزدوری کرنے کے سلسلے میں بھیجا کیونکہ جیلوں میں ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی قیدی کی سزا ختم ہونے کو ہوتی ہے تو اسے بے دول پر کام کاج کے سلسلہ میں جیل سے باہر حکومتی مجاز آفیسر اپنی صوابدید پر بھیج دیتا ہے اور شام کو پہرے دار کی نگرانی میں واپس جیل لایا جاتا ہے۔

شاہ دین کو بھی جانے کے لئے کہا گیا لیکن شاہ دین نے کہا وہ ایک مسلمان ہے مسجد کی تعمیر کے لئے جا سکتا ہے لیکن مندر کی تعمیر کے لئے ہرگز نہیں جائے گا۔ جب جیل حکام کو خبر ملی تو انہوں نے حکم عدولی کا بہانہ بناتے ہوئے شاہ دین کو پانچ کوڑے لگانے جو اس نے جواں مردی کے ساتھ برداشت کئے۔ وہ ہر کوڑا کھانے پر "اللہ اکبر" کی آواز بلند کرتا۔

جیل میں دیگر مسلمان قیدی اس کے اس طرز عمل پر بہت خوش ہوئے اور اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ اب جیل میں اس کو ہر کوئی عزت کی نظر سے دیکھتا اور تھوڑی بہت اس کی مالی مدد بھی کرتے۔ اب اس کے پاس چار پانچ سو روپے کی رقم جمع ہو گئی تھی جو جیل سے فرار ہونے کی صورت میں اس کے کام آ سکتی تھی۔ اس طرح دو ہفتے گزرے کہ چند قیدیوں کو جیل سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی میں صفائی کے لئے بھیجا گیا۔ شاہ دین بھی ان قیدیوں میں شامل تھا اور وہاں جانے کے لئے رضامند بھی تھا۔ دراصل اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ جونہی اسے موقع ملا وہ جیل سے فرار ہو جائے گا اور سیدھا اپنے دوست سردار بہرام سنگھ سے رابطہ قائم کرے گا۔ شاہ دین نے سردار بہرام کا پتہ سنبھال کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔

پہلے دن وہ کوٹھی میں صفائی وغیرہ کرتا رہا اور وہاں

سے فرار ہونے کے راستے دیکھتا رہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کیسے نکلے گا۔ شام کو واپس جیل آ گیا۔ دوسرے دن جب روانہ ہوا تو اس نے جیل کی وردی کے اندر ایک کھدر کی سفید قمیص پہن لی اور ایک لنگی اپنے سر پر باندھ لی۔ ضروری ضروری چیزیں بھی اس نے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس دن اس نے کوٹھی سے فرار ہونا تھا۔ وہ معمول کے مطابق صبح سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا، ساتھ ساتھ وہاں سے فرار کا موقع بھی دیکھنے لگا کہ کون سا وقت مناسب ہوگا۔ دوپہر کو جیل سے قیدیوں کا کھانا آیا ان کی نگرانی کے لئے جیل کا ایک کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ ہر کوئی دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد ایک آدھ گھنٹے کے لئے آرام کرتا اور ہلکی پھلکی نیند میں چلا جاتا۔

شاہ دین نے دیکھا یہ وقت اور موقع مناسب ہے۔ اس نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا پھر ہر ایک نے ایک آدھ سگریٹ کے کش لگانے۔ نگرانی پر مامور کانسٹیبل بھی کھانا کھانے کے بعد بندوق ایک طرف رکھ کر برآمدے میں سو گیا۔ دوسرے قیدی ادھر ادھر کام کاج میں مصروف تھے۔ یہ وقت شاہ دین کے فرار کے لئے موزوں تھا۔ وہ وہاں سے پیشاب کرنے کے بہانے صحن سے ذرا ہٹ کر ایک کچے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی اپنی جیل کی وردی بدلی اور قمیص اور لنگی پہن کر بڑی رازداری سے کانسٹیبل کے پاس آیا جو گہری نیند سویا ہوا تھا۔ شاہ دین نے اس کی بندوق پکڑی اور ساتھ گولیوں والی پیٹی بھی اپنی گرفت میں لی اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ کوٹھی سے باہر چلا آیا۔ باہر سڑک سنسان تھی، اس نے وہاں سے ایک گلی کا رخ کیا۔ ایک دو فرلانگ پیدل چلتا رہا، آگے چل کر اسے ایک تانگہ نظر آیا اس میں بیٹھ کر سیدھا لاری اڈا پہنچا۔ وہاں اس نے کچھ کھانے پینے کے لئے سامان اور ایک چادر خریدی جو اس کے حلیہ بدلنے اور بندوق کو چھپانے کے لئے ضروری تھی۔

لاری اڈے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ جلدی جلدی اس نے بس پکڑی اور اپنی منزل کو چل دیا۔ مغرب کے وقت بس نے اسے اس کی منزل تک پہنچا دیا۔ شہر سے آگے اس نے سردار بہرام سنگھ کے گاؤں جانا تھا۔ دریا کا کنارہ تھا، جنگل بیلا تھا، رات اس نے شہر میں ایک ہوٹل میں گزاری۔ صبح سویرے وہ پیدل سردار بہرام کے گاؤں کی طرف چل نکلا۔ ٹھیک دوپہر بارہ بجے کے قریب شاہ دین بخیریت سردار بہرام سنگھ کے گاؤں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ بہرام اپنے گاؤں کبھی کبھار آتا ہے۔ وہ جنگل میں اس کا ڈیرہ ہے۔ سردار بہرام سنگھ کے گھر والوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی کیونکہ اس نے اپنے گھر والے کہہ رکھا تھا کہ جیل میں اس کا ایک دوست شاہ دین تھا شاید وہ کسی وقت گاؤں اسے ملنے آئے۔ گھر والوں نے گھوڑی پر بٹھا کر اس کو سیدھا سردار جی کے پاس اس کے ڈیرے پر لے گئے۔ اچانک جب جنگل میں شاہ دین کو سردار جی نے اپنے سامنے دیکھا تو خوشی سے اس کا استقبال کیا اور بغلگیر ہو گیا۔ "ہوئے شاہ دینا! تیری قید ختم ہو گئی؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی کہاں سردار جی!" شاہ دین نے بتایا۔ "میں فرار ہو کر یہاں پہنچا ہوں"۔

"اسے بڑے ہور وی چنگا کیتا ای"۔ جواباً بہرام سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔ "جی خوش کر دتا ای۔ اسے میرا ڈیرا اے۔ آرام دے نال رہو۔ ایتھے تیری ہوا نوں وی کوئی نہیں پہنچ سکدا"۔

یہ جگہ شاہ دین کے لئے بہت زیادہ محفوظ تھی۔ شاہ دین نے بہت عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا اگر وہ جیل سے سیدھا اپنے گاؤں کا رخ کرتا تو اس کے لئے پریشانی اور مشکل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ جب قیدی فرار ہو کر جاتا ہے تو سیدھا اپنے گھر کی راہ لیتا ہے اور پولیس بھی سب سے

پہلے وہاں چھاپہ مارتی ہے۔ وہاں پتہ چلا کہ شاہ دین سپاہی کی بندوق لے کر کہیں فرار ہو گیا ہے۔ فوراً جیل حکام کو اطلاع دی گئی۔ جیل حکام حرکت میں آ گئے۔ فرائض میں غفلت برتنے کی پاداش میں سپاہی کو معطل کر دیا گیا۔ فوراً پولیس میں رپورٹ درج کی گئی اور پولیس پارٹی اسی وقت شاہ دین کے گاؤں پہنچی۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ شاہ دین گاؤں نہیں آیا۔ تاہم پولیس نے وہاں کے نمبردار کو تاکید کی کہ جونہی شاہ دین اپنے گاؤں آئے فوراً پولیس کو مطلع کرے۔

نمبردار اور گاؤں کے لوگوں کی ہمدردیاں شاہ دین کے ساتھ تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ساہوکار کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل جانا پڑا جو سراسر ناانصافی تھی۔ اگر وہ وہاں آتا بھی تو انہوں نے شاہ دین کی مخبری ہرگز نہ کرنا تھی کیونکہ گاؤں کے لوگ تو پہلے ہی ساہوکار سے ناخوش تھے۔

رات کو شاہ دین بڑے سکون سے وہاں سویا۔ صبح ہوئی تو سردار بہرام سنگھ نے ایک بکرا منگوایا اور شاہ دین سے کہا کہ اسے اپنے ہاتھوں سے ذبح کرے۔ وہ اپنے دوست کی آمد پر جنگل میں ایک پرتکلف پارٹی کرے گا۔ سردار جی کے اور بھی کچھ دوست وہاں پہنچ گئے۔ دوپہر کا کھانا ہر ایک نے پیٹ بھر کے کھایا۔

وسکی شراب کا بھی اہتمام تھا لیکن شاہ دین نے انکار کیا کہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ سردار بہرام سنگھ بھی اپنے دوست کی طبیعت اور عادت کو سمجھ گیا لہٰذا اس نے شاہ دین کو زیادہ مجبور نہیں کیا کہ وہ شراب پیئے۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا، سردار کے کارندے اکثر رات کو چوری چکاری اور ڈاکہ زنی کرنے نکل جاتے۔ صبح کو جنگل میں سردار کے ڈیرے پر پہنچ جاتے۔ لوٹا ہوا مال سردار ان میں تقسیم کر دیتا اور کچھ مال اپنے پاس رکھ لیتا۔

ایک ہفتہ بعد شاہ دین نے سردار جی سے کہا کہ وہ اپنے گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اس کا دل اپنے بھائی کو ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ سردار بہرام سنگھ نے کہا۔ ٹھیک ہے لیکن وہ اسے اکیلے ہرگز نہیں جانے دے گا۔ نہ جانے گاؤں کے لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھیں۔ سب سے پہلے سردار جی نے شہر اپنے ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ وہاں سے ایک سر کی وگ اور داڑھی خرید لائے۔

دوسرے دن سردار جی کا آدمی شہر سے ایک مصنوعی داڑھی اور بالوں والی ایک وگ خرید لایا۔ سردار بہرام سنگھ نے شاہ دین سے کہا یہ دونوں چیزیں رکھ لو، صبح سویرے تمہارے گاؤں ہم دونوں جائیں گے اور وہاں کی صورت حال کا جائزہ لیں گے۔

ایک سکھ کے حلیئے میں جب تم جاؤ گے، ساتھ میں ہوں گا تو وہاں گاؤں کے لوگ تمہیں ایک سکھ کے روپ میں دیکھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ اگر تم شاہ دین کے روپ میں وہاں جاؤ گے تو ہو سکتا ہے کوئی تمہاری مخبری پولیس کو کر دے تو اس صورت میں تمہیں دوبارہ جیل ہو سکتی ہے۔

شاہ دین کو سردار بہرام سنگھ کا مشورہ پسند آیا۔ وہ صبح سویرے پروگرام کے مطابق نیند سے بیدار ہوا۔ نماز ادا کی، اللہ کو یاد کیا اور اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ اب وہ ایک سکھ کے روپ میں تھا۔ ادھر دونوں سردار بہرام سنگھ نے بھی اپنی تیاری مکمل کی اور دونوں دوستوں کے لئے علیحدہ علیحدہ گھوڑے بھی تیار کئے گئے اور وہ ان پر سوار ہو کر اللہ اور گورو کا نام لے کر اپنی منزل کو چل دیئے۔ دوپہر کو ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر کر کے شاہ دین کے گاؤں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے شاہ دین نے اپنے گاؤں کو ایک نظر دیکھا اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

دونوں نے گھوڑوں پر سوار گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ لوگ انہیں راہگیر سکھ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ کسی بھی آدمی نے انہیں پہچانا نہیں۔ وہاں سے شاہ دین اپنی

زمینوں پر آ گیا جہاں اس کا چھوٹا بھائی کام کاج میں مصروف تھا۔ انہوں نے شاہ نواز سے سلام دعا لی۔ شاہ نواز نے دیہاتی روایت کے مطابق ان کو ڈیرے پر بٹھایا اور لسی پلائی۔ شاہ دین بھائی سے ملنے کو بے چین تھا۔ آخر شاہ دین سے نہ رہا گیا وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر جذبات میں آ گیا۔ اندر کمرے میں گیا۔ اپنی پگڑی اور مصنوعی داڑھی اتاری اور شاہ دین کے روپ میں کمرے سے باہر آیا اور فوراً چھوٹے بھائی کے گلے لگ کر رو دیا۔ شاہ نواز بھی یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ یااللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ دونوں بھائی دیر تک آپس میں گلے لگ کر ملتے رہے۔ سردار بہرام سنگھ نے دونوں بھائیوں کو حوصلہ دیا اور وہ تندرست حال ہو گئے۔ شاہ دین نے شاہ نواز سے گھر کے حال احوال ماں باپ کی خیریت کے متعلق پوچھا اور گاؤں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ بہرام سنگھ نے شاہ دین کے چھوٹے بھائی کو بتایا کہ وہ کسی سے ہماری آمد کا گاؤں میں ذکر نہ کرے ہم یہاں تمہیں ملنے آئے ہیں کیونکہ تمہارا بھائی جیل سے فرار ہو کر تمہیں ملنے آیا ہے اگر اس بات کی خبر گاؤں والوں کو ہو گئی تو ہو سکتا ہے کوئی پولیس کو خبر کر دے۔ شاہ نواز بھی سمجھ گیا۔

"آپ مطمئن رہیں"۔ شاہ نواز نے کہا۔ "میں کسی کو بھائی کی آمد کا نہیں بتاؤں گا"۔

پھر وہ ان سے اجازت لے کر گھر گیا۔ ان کے لئے کھانا تیار کر کے لایا۔ دونوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ دودھ لسی سے بھی خوب تواضع کی اور کہا کہ وہ لوگ کچھ دن یہاں قیام کریں۔ اس نے بھائی سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔

"آج رات ہم نے یہاں سے ہر حالت میں کوچ کرنا ہے"۔ بہرام نے شاہ نواز سے کہا۔ "ہمیں ایک ضروری نوعیت کا کام ہے۔ اب ہم گاہے بگاہے تمہیں ملنے آیا کریں گے"۔

شاہ دین نے جب اپنا گاؤں اپنے کھیت دیکھے اور اپنے بھائی سے ملاقات کی تو انتقام کی آگ میں جلنے لگا کہ لالہ موتی چند کی وجہ سے اسے یہ وقت اور حالات دیکھنا پڑے۔ آج رات ہر حالت میں لالے سے بدلہ لے گا۔ اس کا علم پہلے سے بہرام سنگھ کو بھی تھا کیونکہ جیل میں ساری کہانی شاہ دین نے اس کو سنا رکھی تھی اور بہرام سنگھ نے اس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ جب جیل سے آزادی ملے گی تو لالے کو جہنم رسید کریں گے۔

"آج رات لالہ موتی چند سے حساب چکتا کرنا ہے سردار جی!" شاہ دین نے آگ اگلتے لہجے میں کہا۔ "میرے سینے میں آگ بھری ہوئی ہے۔ جب تک اس سود خور سے بدلہ نہیں لوں گا یہ آگ سرد نہیں ہو گی"۔

"ٹھیک ہے شاہو!" بہرام سنگھ نے گالی دے کر کہا۔ "آج اس کا کام تمام کر دیتے ہیں فکر کس بات کی"۔

رات کا کھانا انہوں نے شاہ نواز کی ڈھاری پر کھایا۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر اپنی نیند پوری کی ٹھیک آدھی رات کے قریب انہوں نے شاہ نواز سے اجازت لی اور لالہ موتی چند کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ لالہ کے گاؤں پہنچے۔ لوگ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ گاؤں میں لالہ جی کا پکا چوبارے والا مکان دور سے نظر آ رہا تھا۔ ویسے شاہ دین بھی قرضہ لینے وہاں آ چکا تھا اور گاؤں سے واقف تھا۔

شاہ دین اور بہرام سنگھ آتشیں اسلحہ سے لیس تھے۔ شاہ دین آج انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ لالہ موتی چند نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ لالہ کے مکان سے کچھ دوری پر انہوں نے اپنے گھوڑے باندھے، بندوقیں ہاتھ میں لیں، دیوار پھلانگ کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔

نیچے صحن میں لالہ کی بیوی اور بچے سو رہے تھے۔ لالہ وہاں نہیں تھا۔

"لالہ کدھر ہے؟" انہوں نے اس کی بیوی کو جگا کر پوچھا۔

"وہ اوپر چوبارے میں سویا ہوا ہے"۔ بیوی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بہرام سنگھ اس کے بیوی بچوں پر بندوق تان کر کھڑا رہا جبکہ شاہ دین بڑی دلیری کے ساتھ اوپر چوبارے میں جا پہنچا۔ دیکھا لالہ بڑے سکون کی نیند سویا ہوا ہے۔ شاہ دین نے اسے جگایا۔ لالہ جی نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں بندوق لئے کھڑا ہے۔

"لالہ جی! اب اٹھ بیٹھو"۔ شاہ دین نے قہر بھری آواز میں کہا۔ "بہت کچھ کھا لیا۔ اب بھگوان کے پاس جانے کے تیاری کرو"۔

"مجھے معاف کر دو"۔ لالہ خوف کے مارے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "جو مال سونا، روپیہ پیسہ لینا ہے لے لو لیکن مجھے جان سے نہ مارو"۔

"لگتا ہے تمہیں جان بڑی پیاری ہے لالہ!" شاہ دین نے کہا۔ "ٹھیک ہے لاؤ کدھر ہے مال روپیہ پیسہ سونا چاندی"۔

لالہ جی نے اپنے تکیے سے چابیوں کا گچھا پکڑا۔ "یہ لو نیچے کمرے میں الماری ہے۔ سب کچھ وہاں ہے، لے لو لیکن جان بخش دو"۔ لالہ نے کہا۔

"ایسے نہیں لالہ!" شاہ دین نے کہا۔ "مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں، تم مکار ہو۔ غریبوں کا ساری عمر خون چوستے رہے ہو آج تمہارا آخری وقت ہے۔ میرے ساتھ نیچے کمرے میں چلو اور اپنے ہاتھوں سے الماری کھولو"۔

"چلتا ہوں، مہاراج! ابھی چلتا ہوں"۔ لالہ نیچے اتر کر صحن میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اور خوفزدہ ہو گیا کہ ایک خوفناک ڈھاٹا پوش مسلح ڈاکو اس کے بیوی بچوں پر بندوق تانے کھڑا ہے۔ لالہ سمجھ گیا کہ اس کے گھر ڈاکو آ گھسے ہیں۔

لالہ جی نے الماری کا تالا کھولا۔ سونا، چاندی، روپیہ پیسہ سب کچھ وہاں موجود تھا۔ بڑی تسلی کے ساتھ ایک تھیلے میں سب کچھ ڈال لیا گیا۔

"اب بتاؤ وہ بہی کھاتے کہاں ہیں؟" شاہ دین نے کہا۔ "جن کے ذریعے تم غریب لوگوں کا خون چوستے ہو"۔

الماری کے اندر ہی ایک چھوٹا سا صندوق تھا جس پر قفل لگا ہوا تھا۔ لالہ نے وہ کھولا تو وہ بہی کھاتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاہ دین نے اس صندوق کو بھی اپنے قبضے میں لیا۔ آناً فاناً اس کے گھر کو آگ لگائی اور دو فائر لالہ جی پر کئے۔ وہ موقع پر دم توڑ گئے۔

لوٹا ہوا مال انہوں نے پکڑا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر رات کی تاریکی میں بھاگ نکلے۔ گاؤں کے لوگوں نے جب فائر کی آواز سنی اور لالہ جی کے مکان کو آگ لگی دیکھی تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ دیکھا کہ لالہ جی کے گھر ڈاکہ پڑا ہے اور لالہ جی خون میں لت پت دم توڑ چکا ہے لیکن جلدی جلدی اور گھبراہٹ میں شاہ دین کی داڑھی اور مونچھ اس کے چہرے سے اتر کر وہیں مکان کے صحن میں کہیں گر گئی جس کا خیال شاہ دین کو بعد میں آیا۔

پہر کنیف لوگوں کا لالہ جی کے گھر ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لوگوں نے مل کر آگ بجھائی۔ نمبردار نے آدمی بھیج کر پولیس کو اطلاع کر دی کہ اس کے گاؤں میں ڈاکہ زنی اور قتل کی واردات ہوئی ہے۔ اطلاع ملتے ہی پولیس جائے وقوعہ پر پہنچ گئی۔ لاش قبضہ میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی۔ نمبردار اور گواہوں کی موجودگی میں ایف آئی آر درج ہوئی جائے وقوعہ سے پولیس کو مصنوعی داڑھی اور مونچھ بھی ملی۔

پولیس نے تفتیش جاری رکھی۔ اس وقت اس

علاقے میں سردار بہرام سنگھ کی بڑی دھوم تھی۔ اس کے آدمی لوٹ مار کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی لوگوں کا شک سردار بہرام سنگھ پر تھا کہ یہ کارروائی بھی اسی کی ہو سکتی ہے لیکن پولیس کو جو دازھی اور مونچھ ملی اس پر پولیس نے اپنی تفتیش جاری رکھی کہ یہ کون شخص ہو سکتا ہے جو یقیناً یہ سکھ نہیں بلکہ کوئی ہندو یا مسلمان ہے۔

یہ خبر اردگرد کے دیہات میں بھی گردش کرنے لگی۔ شاہ نواز کو جب پتہ چلا تو اس کا دھیان بھی رات کو جو مہمان اس سکھ یار کے ساتھ ان کی طرف گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ...... یہ کارروائی ان کی ہو سکتی ہے کیونکہ باتوں باتوں میں شاہ دین لالہ جی کا بار بار پوچھتا رہا۔ دوسرے اس کے پاس سے وہ لالہ جی کے گاؤں کی طرف نکلے تھے۔ پھر سب سے بڑی شک والی بات یہ بھی کہ لوگوں نے بتایا کہ ایک ڈاکو سکھ نہیں تھا بلکہ وہ سکھ بنا ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں ڈاکہ ڈالنے اور قتل کرتے وقت اس کی اپنی داڑھی مونچھ لالہ جی کے گھر میں گر گئی تھی۔ شاہ نواز سمجھ گیا کہ یہ واردات اس کے بھائی اور اس کے ساتھی سردار نے کی ہے لیکن شاہ نواز نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھی۔

وہ ساہوکار کے گاؤں گیا تاکہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے اور اگر بھائی شاہ دین کے لئے کوئی خطرہ ہو تو اسے خبردار کر سکے لیکن حتمی نتیجے پر کوئی بھی پہنچ نہ سکا کہ کارروائی کس کی ہے۔ دوسری طرف پولیس نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور اردگرد دیہات میں اپنے مخبروں کا جال پھیلا دیا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق دو گولیاں ایسی بندوق سے فائر کی گئیں جو اس وقت تھانوں میں استعمال ہوتی تھیں۔ اب پولیس کڑی سے کڑی ملانے لگی کہ کچھ عرصہ پہلے شاہ دین پولیس کانسٹیبل کی بندوق لے کر فرار ہوا تھا۔ کھوجی نے کھرے اٹھائے تو اس نے نشاندہی کی کہ قاتل دو تھے اور گھوڑوں پر بیٹھ کر آئے تھے۔ یہ دونوں گھوڑے ساتھ والے گاؤں کی طرف سے آئے تھے۔ جو مفرور شاہ دین کا گاؤں تھا اور مقتول لالہ مول چند نے شاہ دین کو جیل بھجوایا تھا یعنی قتل کا باعث بھی واضح تھا۔ لالہ اور شاہ دین کی دشمنی چلی آ رہی تھی۔

پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ کارروائی شاہ دین کی ہو سکتی ہے اور سکھ سردار اس کا ساتھی ہے لیکن ثبوت کوئی نہیں تھا۔ اس شک کی بنا پر پولیس نے شاہ دین کے بھائی شاہ نواز کو حراست میں لے لیا۔

اس بات کا علم جب شاہ دین کو ہوا تو وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اس بات کا ذکر بہرام سنگھ سے کیا کہ اسے پتہ چلا ہے کہ قتل اور ڈاکہ زنی کیس میں اس کے بھائی کو پولیس نے پکڑ رکھا ہے۔

''مجھے ہر حالت میں اسے پولیس کی حراست سے آزاد کروانا ہے''۔ شاہ دین نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''چاہے اس کے عوض میری اپنی جان چلی جائے۔ سردار جی اس مشکل گھڑی میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر میں آج شام ہی اکیلا اس تھانے میں چلا جاؤں گا اور اس تھانیدار کو بھی قتل کر دوں گا۔ جس نے میرے بھائی کو حراست میں لے رکھا ہے۔ میں پورے تھانے کو آگ لگا کر مٹی کا ڈھیر بنا دوں گا۔ میرے دل میں اب خوف ڈر نام کی کوئی چیز نہیں''۔ سردار بہرام سنگھ نے اپنے دوست کی بات جنونی اور مسکرانے لگا۔

''حوصلہ رکھ یار!'' اس نے شاہ دین کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''میں ہر حالت میں تیرے بھائی کو پولیس کی حراست سے آزاد کراؤں گا۔ یاراں دی یاری تے جان وی قربان اے یارا!''

سردار بہرام سنگھ کو معلوم تھا کہ اس تھانے کا انچارج ایک سکھ ہے اور وہ اس کا جاننے والا تھا۔ لڑائی بھڑائی کی بجائے صلح جوئی سے کام لیتے ہیں۔ سردار نے اسی وقت اپنے ایک ساتھی کا انتخاب کیا اور اسے پیغام دے کر سردار

سنگرام سنگھ کے پاس جو متعلقہ تھانے کا انچارج تھا، کچھ انعام اکرام دے کر اسے بھیجا کہ جو ملزم شاہ نواز شک کی بنا پر پکڑ رکھا ہے اسے ہر حال میں آزاد کرو۔ بصورت دیگر میں خود آ کر اسے لے جاؤں گا۔ سردار جی! میری تھوڑی بات کو زیادہ سمجھنا۔

جب سردار سنگرام سنگھ نے سردار بہرام کا پیغام سنا تو وہ پریشان ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سردار بہرام سنگھ جو کہتا ہے وہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے لہٰذا اس نے شاہ نواز کو تھانے سے باعزت گھر جانے کی اجازت دے دی اور واپسی پیغام سردار بہرام سنگھ کو بھیجا کہ تمہارا کام ہو گیا ہے وقت پڑنے پر میرا بھی خیال رکھنا۔

سردار بہرام سنگھ اور شاہ دین کو جب خبر ملی کہ اس کے بھائی کو پولیس نے آزاد کر کے گھر باعزت بھیج دیا ہے تو دونوں بہت زیادہ خوش ہوئے۔ شاہ دین نے فوراً شکرانے کے نفل ادا کئے۔ اب شاہ دین نے یہ معمول بنا لیا کہ وہ ہر ہفتہ پندرہ دن بعد کسی نہ کسی ہندو زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالتا۔ وہ شاہو ڈاکو کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ جہاں بہرام سنگھ ڈاکو کی ارد گرد دیہاتوں میں خوف دہشت تھی اب شاہو ڈاکو کا نام سے لیا جانے لگا۔ جو بھی لوٹ مار کا مال اس کے ہاتھ آتا سب سے پہلے وہ سردار بہرام سنگھ کے سامنے رکھتا۔ بہرام آدھا مال خود رکھ لیتا اور آدھا مال شاہ دین کو دے دیتا۔

شاہ دین بڑی پابندی سے اپنا نصف مال ارد گرد دیہات میں جو غریب مسکین ہوتا کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر بھجوا دیتا۔ ہر گاؤں کے کسی غریب کی لڑکی کی شادی بیاہ کے سارے اخراجات ان کے گھر بھجوا دیتا۔ کچھ رقم کسی آدمی کے ذریعے اپنے بھائی شاہ نواز کو بھی بھیج دیتا۔ جب اسے موقعہ ملتا وہ خود بھی مل لیتا۔

علاقے کی پولیس شاہ دین کی گرفتاری کے لئے جہاں بھی اطلاع ملتی چھاپے مارتی لیکن شاہ دین ہاتھ نہ آتا جس جگہ سردار بہرام سنگھ نے جنگل میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا مسکن بنا رکھا تھا۔ وہاں پولیس جاتے ہوئے خوف کھاتی تھی۔ ایک دو دفعہ پولیس پارٹی ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے وہاں گئی بھی لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ ملی بلکہ پولیس کے دو تین اہلکار ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بن کے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ اس لئے پولیس پارٹی وہاں جنگل بیلے میں جانے سے کتراتی تھی۔

پولیس کو اب یہ یقین ہو گیا تھا کہ جیل سے مفرور قیدی شاہ دین اب شاہو ڈاکو کے نام سے علاقے میں ڈاکہ زنی اور قتل گری کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔ اب پولیس نے اس کو اشتہاری قرار دے دیا تھا اور اس کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لئے نقد انعام مقرر کر رکھا تھا۔ شاہو ڈاکو نے واردات کرنے کا اپنا ایک اصول بنا رکھا تھا۔ وہ امیروں، ساہوکاروں کو لوٹتا اور لوٹا ہوا مال علاقے کے غریب غرباء میں تقسیم کرتا۔ یہی وجہ تھی وہ علاقے میں ہر دل عزیز تھا اور لوگ اس کی مخبری ہرگز نہ کرتے بلکہ اسے اپنا غمخوار سمجھتے۔ ساہوکار اس کے نام سے ڈرتے تھے۔ ڈاکہ کے لئے وہ بعض اوقات پچاس کوس تک وہ اکیلا ہی گھوڑے پر چلا جاتا۔

یہاں شاہ دین المعروف شاہو ڈاکو کی زندگی میں ایک موڑ آیا۔ ایک رات اکیلا ہی کسی ساہوکار کو لوٹنے اس کے گاؤں چلا گیا۔ گھوڑی کو گاؤں سے تھوڑی دور ایک درخت سے باندھ کر کسی نہ کسی طرح ساہوکار کے گھر داخل ہو گیا۔ صدر دروازے کی بجائے شاہو حویلی کے عقب سے دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر میں پوری طرح اندھیرا تھا صرف ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ دیکھا کہ ایک لڑکی آنکھیں بند کئے بیٹھی رام رام جپ رہی ہے۔ باقی وہاں پوری طرح سناٹا ہے۔ شاہو نے بندوق کی

نابینا لڑکی کی کنپٹی پر رکھ کر کہا۔ ”بتاؤ تمہارے گھر والے کدھر ہیں؟“

”گھر والے سب ایک ہفتہ کے لئے یاترا کرنے بنارس گئے ہیں“۔ لڑکی نے جواباً کہا۔ ”شاید ایک دو دن تک واپس لوٹ آئیں“۔

”مال سونا چاندی روپیہ پیسہ کہاں ہے؟“ شاہو نے پوچھا۔ ”اور چابیاں کس کے پاس ہیں؟“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ تم ڈاکو ہو“۔ لڑکی نے کہا۔ ”آدھی رات کو ڈاکو ہی کسی کے گھر لوٹنے آ سکتا ہے۔ بہرکیف مجھے موت کا ڈر نہیں۔ میں تو اندھی ہوں، میری بینائی ایک عرصہ سے ختم ہو چکی ہے۔ میرے پتا نے الماری کی چابیاں قالین کے نیچے چھپا رکھی ہیں تم لے سکتے ہو“۔

شاہو نے چابیاں پکڑیں اور کونے میں پڑی ہوئی الماری کو کھولا۔ ڈھیر سارے سونے چاندی کے زیورات اور خاصی کرنسی لوٹ لے۔ خوشی خوشی اس نے ایک چادر میں سب کچھ محفوظ کر کے باندھ لیا اور چابیاں واپس لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیں اور لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ آج خوش اس لئے بھی تھا کہ ڈاکہ ڈالتے وقت کسی نے اس کی مزاحمت نہیں کی۔

”میرے پتا کی دولت تم نے لوٹ تو لی ہے“۔ لڑکی نے شاہو سے کہا۔ ”لیکن یاد رکھو، ڈاکہ ڈال کر دوسروں کی کمائی لوٹ لینا اور راتوں کو دوسروں کے گھروں کا آرام سکون برباد کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ میں اپنے بھگوان کی پرارتھنا کر رہی تھی، تم میرے گیان دھیان میں خواہ مخواہ مخل ہوئے۔ میرے سکون کو برباد کیا، ہمارے گھر ڈاکہ ڈالا، میں تمہیں کچھ کہہ نہیں سکتی بس یہی بددعا دیتی ہوں کہ بھگوان تمہیں بھی میری طرح اندھا کر دے اور یہ دولت تمہارے کسی کام نہ آئے“۔

شاہو نے جب لڑکی کی باتیں سنیں تو اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لڑکی نے اپنی مجبوری اور بے بسی کا رونا رویا تھا۔ یہ معمول تھا کہ ڈاکہ زنی کے وقت اہل خانہ رونے چیختے اور بددعائیں دیتے تھے۔ وہ بڑے سکون سے لوٹا ہوا مال لے کر دیوار پھلانگ کر حویلی سے باہر آیا۔ چاندنی رات تھی وہ گھوڑے پر بیٹھا اور وہاں سے نکل آیا۔

وہ وہاں سے آ تو گیا لیکن اس کا دھیان وہیں اٹکا رہا۔ بار بار اس کے دماغ میں نابینا ہندو لڑکی کے الفاظ گونجتے۔ ”میں تمہیں بددعا دیتی ہوں کہ تو بھی میری طرح اندھا ہو جائے اور یہ لوٹ کا مال تیرے کسی کام نہ آئے“۔

اس کے ذہن پر اس بددعا کا خوف بیٹھ گیا اور اسے ہر لحہ یہ خوف ستانے لگا کہ وہ کسی بھی وقت اندھا ہو سکتا ہے۔ کوئی حادثہ ہو سکتا ہے جس میں اس کی بینائی جا سکتی ہے۔ یہ خوف واہمہ بن کر اس کو چمٹ گیا۔ وہ کہیں آتے جاتے، کوئی کام کرتے ڈرنے لگا کہ اس کی آنکھوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ وہ خاصے دنوں سے کسی واردات کے لئے نہیں نکلا تھا۔

اس کی یہ پریشانی اور احتیاط پسندی بہرام سنگھ سے چھپی نہ رہ سکی اور اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جو وہ پریشان شکل بنائے پھرتا ہے۔ شاہو نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹلنے والا نہیں تھا۔

”اے یاری دا اصول نئیں شاہو سیاں!“ بہرام سنگھ نے شکوہ کناں لہجہ میں کہا۔ ”یار کولوں کی چھپانا۔ سانوں دس کی مسئلہ اے، یار لئی جان وی حاضر اے“۔

بہرام سنگھ کی باتوں سے شرمندہ ہو کر شاہو نے اسے ساری بات سنا دی۔ یہ سن کر بہرام سنگھ نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔

”جھلا نہ ہووے تے!“ اس نے شاہو کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”توں رب نوں منن والا اک

ہندو کڑی دی بددعا تو ڈر گیا ایں۔ کیسا اودا بھگوان تیرے رب توں وڈا ہو گیا اے؟"

سنا ہوا ایک سکھ! اکو کے منہ سے اتنی گہری اور سامنے کی بات سن کر شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ واقعی اگر اس ہندو لڑکی کی بددعا میں کچھ اثر ہوتا تو اب تک اس کو اندھا ہو جانا چاہیے تھا مگر اسے اس کے رب نے بچائے رکھا۔

وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس ایک ہندو لڑکی کی بددعا کے مقابلے میں کتنے غریب لوگوں کی دعائیں اس کے ساتھ ہیں جن کی وہ مدد کرتا رہتا ہے۔

"رب نے تجھے بچا لیا مگر تو مسلسل رب کی نافرمانی کرتا چلا جا رہا ہے"۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔ "اگر اس نے پکڑ میں لے لیا تو اس سے تجھے کون چھڑائے گا؟"

"مگر میں تو صرف اپنا انتقام لے رہا ہوں"۔ اس نے بودی سی دلیل دی۔ "میرے ساتھ ظلم ہوا تھا"۔

"جتنا ظلم ہوا اتنا ہی بدلہ بنتا ہے"۔ اس کے ضمیر نے کہا۔ "تو پہلے ہی اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لینے میں حد سے زیادہ گزر گیا ہے.... اب جو کچھ تو کر رہا ہے اس کی کیا توجیہہ کرو گے۔ یہ اپنی حد سے تجاوز نہیں ہے؟ یاد رکھو! اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے"

یہ سوچ کر شاہو پر خوف خدا طاری ہو گیا اور حق جان سے لرز گیا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ وہ آئندہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور بے جا لوٹ مار سے اجتناب کرے گا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو بدلنے اور شریفانہ زندگی گزارنے کی کوشش شروع کر دی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ تو مسلک کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر مسلک اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اب پولیس اس کو چین نہیں لینے دے رہی تھی اور اس کی گرفتاری کے لئے اس نے مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا جو کیر کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

جہاں شاہو کے چاہنے والے اور اس کے ہمدرد بہت سارے تھے وہاں کچھ لوگ اس سے حسد کرنے والے اور اس کی جان کے گاہک بھی تھے۔ سرکار کی طرف سے شاہو کی زندہ یا مردہ گرفتاری کے لئے ایک مربع اراضی اور نقد انعام مقرر کر رکھا تھا۔ کئی لوگوں کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونا قدرتی بات تھی کہ وہ یہ انعام حاصل کر لیں۔ یہی وجہ تھی کہ شاہو کو ہر جگہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔

اس کے ایک بڑے ہی جگری یار کی شادی تھی۔ شاہو بڑی رازداری سے اس شادی میں شرکت کے لئے اس کے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ گاؤں میں کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ پولیس کو مطلوب شاہو ان کے گاؤں میں موجود ہے۔

اس گاؤں میں مقتول ساہو کار لالہ مول چند کا ایک قریبی رشتہ دار رگھو ناتھ بھی رہتا تھا۔ اس کے دل میں شاہو کے خلاف انتقام کا لاوا ابلتا رہتا تھا مگر وہ اس سے بدلہ نہیں لے سکتا تھا اور وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ وہ شاہو کی مخبری کر سکے۔

جب کسی کا مرکا ہونا قدرت کی طرف سے طے پا جاتا ہے تو قدرت اس کے اسباب بھی پیدا کر دیتی ہے۔ جس دوست کے گھر شاہو ٹھہرا تھا وہاں ایک غریب سی ہندو عورت چھوٹے موٹے کام کرتی تھی۔ اس کو کسی طرح بھنک پڑ گئی کہ شاہو ڈاکو اس گھر میں مہمان ہے۔ پھر اس نے شاہو کو کسی نہ کسی طرح دیکھ بھی لیا۔ اس عورت نے وہاں سے آ کر سیدھا رگھو ناتھ کے گھر کا رخ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ رگھو شاہو کے خون کا پیاسا ہے۔ اس نے رگھو سے انعام کے لالچ میں یہ اطلاع اسے دے دی۔ یہ سن کر رگھو بڑا خوش ہوا اور اس نے عورت کو اچھا خاصا نقد انعام اور چاولوں کی بوری خوش ہو کر دی۔

اس کے بعد رگھو ناتھ علاقہ تھانیدار کے پاس جا پہنچا اور شاہو کی مخبری کر دی۔ تھانیدار یہ سنتے ہی پولیس کی بھاری نفری لے کر گاؤں پہنچ گیا اور ناکہ بندی کر لی۔ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ تھانیدار نے اس ڈیرے کو گھیر لیا جہاں شاہو کو ٹھہرایا گیا تھا۔ تھانیدار نے گاؤں کے چوکیدار کو بلا لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شاہو نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد گیا ہے۔

تھانیدار اطلاع ملنے پر سیدھا مسجد کے باہر ایک کونے میں چھپ کر گھات لگائے بیٹھ گیا۔ جونہی شاہ دین عرف شاہو ڈاکو نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر آیا اسے بھی کچھ شک گزرا کہ مسجد کے ارد گرد کچھ نئے نئے چہرے ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ڈیرے پر جانے کی بجائے ایک طرف بندھی گھوڑی کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پیشتر اس کے وہ گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ جاتا، پولیس نے پیچھے سے فائر کھول دیا اور شاہ دین موقع پر دم توڑ گیا۔ لاش کو نمبردار کی موجودگی میں تھانے لے جایا گیا اور ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے اسے دفنا دیا گیا۔

شاہ دین یوں اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ حکومت نے بھی سکھ کا سانس لیا اور انیس انچ اونچ کو ترقی دے کر ڈی ایس پی کا عہدہ دے دیا۔ دوسری طرف رگھو ناتھ جس نے مخبری کی تھی وہ انعام میں ملنے والی زمین کے حصول کی خاطر بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ ادھر جب بہرام کو پتہ چلا کہ رگھو ناتھ نے اس کے دوست کی مخبری کر کے انعام حاصل کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ سیدھا ایک دن اس کے گاؤں آیا۔ اسے کہا کہ تیار ہو جا گولی کھانے کے لئے۔ پیشتر اس کے کہ تم زمین بطور انعام حکومت سے حاصل کرو، میں تمہارا کریا کرم کر دیتا ہوں۔ یوں بہرام ڈاکو کے ہاتھوں وہ قتل ہوا۔ اس طرح بہرام نے اپنے دوست کا بدلہ لے لیا۔

◆✻◆

کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں سات تاج محل موجود ہیں؟

☆ .... عبداللہ چغتائی

دنیا میں ایسی عمارات کی کمی نہیں جو تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اپنے اپنے ملک کی پہچان بھی ہوتی ہیں۔ مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ امریکی مجسمہ آزادی سے لے کر ایفل ٹاور تک ان کی نقول کی بھی کمی نہیں مگر ان کاپی کیٹس کا سب سے بڑا ہدف تاج محل ہی بنا ہے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ اصل تاج محل 1631ء سے 1648ء کے درمیان مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں سفید سنگ مرمر سے ان کی اہلیہ کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ خوبصورت و عالیشان عمارت دنیا کی چند سب سے زیادہ مشہور عمارات میں سے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے عجائب میں بھی شامل ہے۔ تاہم ہندوستان کے علاوہ کئی مقامات پر اس کی ہو بہو نقل ہو سکتا ہے کہ آپ کے ہوش اڑا کر رکھ دے۔

1- تاج آف دکن — (اورنگ آباد ہندوستان)

ہو سکتا ہے کہ پہلی نظر میں آپ کو یہ آگرہ میں واقع تاج محل ہی لگے مگر نہیں جناب ایسا بالکل نہیں، یہ تاج آف دکن (بی بی کا مقبرہ) درحقیقت شاہ جہاں کی تعمیر کردہ یادگار عمارت کی انتہائی خوبصورت نقل ہے جسے مغل بادشاہ اورنگزیب کے بیٹے اعظم شاہ نے 17ویں صدی کے آخر میں اپنی ماں کی یاد میں تعمیر کرایا تھا۔ تاج محل سے مشابہت کی بناء پر اسے غریبوں کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے جبکہ مغل طرز تعمیر کی وجہ سے یہ واقعی حقیقی تاج محل جیسا ہی لگتا ہے۔

جس طرح مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اپنی محبوبہ ممتاز محل کی یاد میں آگرہ میں تاج محل تعمیر کروایا اسی طرح مغل شہزادے اعظم شاہ نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک تاج محل تعمیر کروایا جسے "بی بی کا مقبرہ" کہا جاتا ہے۔ ریاست مہاراشٹرا میں واقع یہ عظیم الشان عمارت ہو بہو تاج محل جیسی نظر آتی ہے۔ اس کا سفید گنبد، بلند مینار باغات اور فوارے بالکل آگرہ کے تاج محل جیسے ہیں۔

اگرچہ اس کی شان و شوکت شاہ جہاں کے تاج محل جیسی تو نہیں لیکن اس کی خوبصورتی اور طرز تعمیر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ وسعت اور بلندی میں آگرہ کے تاج محل سے قدرے کم ہے اور ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ آگرہ کے تاج محل کو مکمل طور پر سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے جبکہ اورنگ آباد کے تاج محل کی عمارت کی دیواروں پر سنگ مرمر کی ایک تہہ چڑھائی گئی ہے۔ اس کا شمار بھی دنیا کی اہم ترین تاریخی عمارات میں کیا جاتا ہے۔

2- تاج ہاؤس بوٹ

یہ تاج محل کی نقل پر بنی ہاؤس بوٹ 20 لاکھ ڈالرز سے زیادہ مالیت کی ہے جسے 1970 کی دہائی کے وسط میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر کا خیال جی ہاولین نامی ایک کاروباری شخصیت کو ہندوستان جا کر اصل تاج محل دیکھ کر آیا تھا اور اب یہ کیلیفورنیا میں لوگوں کے ہوش اڑا رہی ہے۔

3- تاج عربیہ- (دبئی)

چند لاکھ ڈالرز سے تاج محل کی نقل بنانا تو عام ہے مگر ایک ارب ڈالرز سے یہ کمال کر دکھانا واقعی دیوانہ پن لگتا ہے لیکن دبئی میں واقعی ایسا ہونے جا رہا ہے جہاں تاج محل کے مقابلے میں تاج عربیہ تعمیر کیا جا رہا ہے جو حقیقی عمارت کی نقل تو نہیں ہو گا مگر کافی حد تک اس جیسا ہی ہو گا۔ یہ کسی مقبرے کی بجائے شادیوں کا مرکز ہو گا اور یہ 2016 میں مکمل ہو کر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے گا۔

4- ٹرمپ تاج محل

اٹلانٹک سٹی کو یوں تو بلند و بالا عمارات کی وجہ سے جانا جاتا ہے مگر ٹرمپ تاج محل کی شان ہی الگ ہے جو اصل تاج محل جیسا تو نہیں بلکہ اس میں کئی رنگ بھی استعمال کیے گئے ہیں مگر نقشہ بادی النظر میں محبت کی یادگار سے مشابہہ ہونے کی وجہ سے اسے تاج محل کی ہی ایک نقل مانا جاتا ہے۔

5- تاج محل اپوہ- (ملائیشیا)

محبت کی اس یادگار کا جادو ملائیشین عوام پر بھی چل چکا ہے جہاں اپوہ ریلوے اسٹیشن کو ہی تاج محل کا نام دے دیا گیا ہے جس کی وجہ اس کی منفرد عمارت ہے حالانکہ اصل یادگار سے اس کی شکل کچھ خاص نہیں ملتی، تاہم آرکیٹیکٹ کو یہ اس جیسی ہی لگی اور اب یہ اس نام سے معروف بھی ہو گئی ہے۔

6- تاج محل- (بلند شہر، یوپی)

شاہ جہاں نے اپنی بیوی کی یاد میں تاج محل تعمیر کر کے محبت کی ایک داستان کو جنم دیا مگر اسی ملک میں ایک اور شخص نے کچھ چھوٹے مگر اسی کی ہوبہو نقل کے ذریعے اپنی مرحوم بیوی کو انوکھے انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ اتر پردیش میں بلند شہر میں فیض الحسن قادری نامی شخص نے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں تاج محل کی یہ نقل تعمیر کی جو زیادہ بڑی نہیں اور کافی حد تک خوبصورتی سے بھی محروم ہے مگر محبت کا یہ جذبہ اس کی کشش بڑھا دیتا ہے۔

7- تاج محل- (بنگلہ دیش)

بنگلہ دیش میں ایک فلم ساز نے اپنی فلم کی تیاری کے سلسلے میں تاج محل کی نقل تیار کرائی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ یہ خوبصورت عمارت دنیا بھر سے سیاحوں کو بنگلہ دیش کی جانب کھینچ کر لائے گی اور اس کا ملک دنیا میں نمایاں حیثیت حاصل کر سکے گا۔

لالہ جی اور ابا اس معاملہ میں انتہائی ذہنی کرب کا شکار تھے۔
ان کو کال کوٹھڑی اور جیل کی پُر مشقت زندگی نظر آ رہی تھی۔

قسط: 3 ☆ .... محمد رضوان قیوم

کو ادھر اُدھر بہت تلاش کیا گیا۔ اس کے دوستوں سے پوچھا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔

کلدیپ

اب تو سنتو تائی کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کو غشی کے دورے پڑنے لگے۔ لالہ جی پر کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ آخر سنتو تائی میرے ابا کے پاس آئی۔

"عظیم بھائی! لالہ نے میرا سکون برباد کیا ہوا ہے"۔ اس نے روتے ہوئے فریاد کی۔ "لالہ تمہارا جگری دوست ہے، تمہیں اپنے خدا کا واسطہ تم اس کو کہو کہ اپنے جوان بیٹے سے ضد نہ لگائے اور جہاں وہ کہتا ہے اس کی شادی کر دے۔ اس نے غصے میں آ کر بیٹے پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ وہ جوان خون باپ سے باغی ہو کر جانے کہاں چلا گیا ہے۔ مجھے ہول پڑ رہے ہیں میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ نہ جانے میرا لعل کہاں گیا ہوگا۔ اس نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا بھوکا ہوگا۔ کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے"۔

"بھاوج! تو پریشان نہ ہو"۔ ابا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو میرے ساتھ اپنے گھر چل"۔

"نہیں نہیں میں آپ کے ساتھ گھر نہیں جا سکتی"۔ تائی سنتو نے گھبرا کر کہا۔ "اگر آپ میرے ساتھ گھر گئے تو لالہ مجھ پر شدید برہم ہوگا۔ آپ ایسا کریں کہ میرے گھر جانے کے تھوڑی دیر بعد آئیں لیکن آنا ضرور"۔

تھوڑی دیر بعد ابا لالہ جی سے ملنے گئے۔

"مجھے پہلے تیری دماغی حالت کے بارے میں شک تھا کہ تو نیم پاگل ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے"۔ ابا نے لالہ جی کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ "اولاد کے معاملات میں اتنا کٹھور دل نہ بن۔ آج کل کی اولادیں زندگی اپنی مرضی سے گزارتی ہیں، وہ بھلا کہاں اپنے بڑوں کے کہنے پر چلتی ہیں"۔

"یار عظیم! تو مجھے سمجھانے آ گیا ہے"۔ لالہ جی نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو دیکھ کلدیپ جہاں شادی کرنا چاہتا ہے کیا وہ لوگ اس قابل ہیں ان سے رشتہ جوڑا جائے؟ بھلا شہد کی بوتل میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈالا جا سکتا ہے؟"

"کلدیپ نے اپنی زندگی ان لوگوں کے ساتھ گزارنی ہے یا تو نے؟" ابا نے لالہ جی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لالہ میری بات مان اپنی ضد چھوڑ دے۔ یاد رکھ! اگر تو اپنی ضد پر اڑا رہا تو نہ صرف تو برباد ہوگا بلکہ تو اپنے بیٹے کلدیپ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا"۔

"ارے اسے دو چار دن اس حویلی کے آرام و عیش سے باہر رہنے دے"۔ لالہ جی نے بڑے رعونت بھرے انداز میں کہا۔ "اسے جب باہر دنیا میں بھوک کی مار پڑے گی تو وہ خود ہی دیہات شادی کی اپنی ضد چھوڑ کر میرے جوتوں کے تلوے چاٹے گا... وہ آ جائے گا۔ عظیم تو کلدیپ اور اس کی زندگی کی فکر نہ کر"۔

ابا نے لالہ کے ساتھ بڑا مغز کھپایا مگر لالہ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھا ہی رہا۔

اگلے دو تین دن تک کلدیپ کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ لالہ کو اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چار دن دھکے کھا کر خود ہی واپس آ جائے گا مگر کلدیپ کی ماں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں بے چینی سے اسے ڈھونڈنے کے لئے پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر چکراتی پھرتی تھی۔

ابا نے مجھے کہا کہ تم اور شریف الدین (میرا کزن) اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کلدیپ کو ہر طرف تلاش کرو۔ جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان ہے وہاں جاؤ۔

میں، شریف اور محلے کے چند لڑکوں نے مل کر کلدیپ کو اردگرد دور دراز علاقوں میں تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ دو روز بعد کلدیپ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ایک جوگی کے ڈیرے میں بیٹھا چرس کے کش کھینچ رہا ہے۔ اسے شریف الدین نے ڈھونڈا تھا۔

لالہ جی کو جب کلدیپ کی اس حالت کے بارے

میں جلایا گیا تو اس نے غصے سے کہا کہ میرا دل کرتا ہے کہ میں اس خبیث کو گولی مار دوں۔

"تو تو اسے گولی مار کر پھانسی کے پھندے پر چڑھ جائے گا"۔ ابا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تو تیرے پیچھے تیرے گھر والے سڑکوں پر کتے بلیوں کی طرح دھکے کھائیں گے۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھ اور عقل سے کام لے۔ فوری طور پر اپنی ضد چھوڑ کر کلدیپ کو پیار سے منا کر سے نا اور اس کی شادی کے سلسلے میں اپنی اکڑ چھوڑ دے"۔

"نہ جانے یہ نالائق کمینہ مجھے کہاں کہاں ذلیل و خوار کروائے گا"۔ لالہ غصے میں بڑبڑایا۔

"اگر تو نے اس کی ضد نہ مانی تو لازماً مزید ذلیل و خوار ہوگا"۔ ابا نے لالہ کو سمجھایا۔

"میں تیرے عاشق بیٹے کی شادی چند شرائط پر کروں گا"۔ لالہ نے ہنستو تالی کو کہا۔ "اگر کمیش کو یہ شرائط منظور ہیں تو میں اس کام کے لئے جیون اقدم اٹھاتا ہوں۔ اگر نہیں تو بے شک کلدیپ ... کی لت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے مجھے کسی کی پروا نہیں ہے"۔

"تیری کون سی شرائط ہیں؟" ابا نے ... سے پوچھا۔

"میں کلدیپ کی بارات کسی قیمت پر بھی اس کوبر نزدہ گاؤں میں نہیں لے کر جاؤں گا"۔ لالہ نے جواباً کہا۔ "اس کے بیاہ سے متعلق تمام رسمیں برٹش کلب میں ہوں گی اور لاسا گاؤں سے کمیش کے خاندان کے چند لوگ ہی اس میں شامل ہوں گے۔ اگر تجھے زیادہ ہی اپنے مجنوں عاشق بھتیجے اور بھاوج سے ہمدردی ہے تو تو ہی اس معاملہ کو سنبھال۔ میں صرف تم لوگوں کو اس بے جوڑ زبردستی کی مسلط سرکاری کا خرچہ دوں گا"۔

"اچھا میں سنبھال لوں گا"۔ ابا نے لالہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو فی الحال اپنے گرم ذہن کو ٹھنڈا رکھ"۔

ابا نے شریف الدین اور محلے کے چند ہمسائیوں کو لیا اور وہ سیدھے اس ذیرے پر پہنچے جہاں کلدیپ بیٹھا ہوا تھا۔ چرس کے پے در پے کش لگا کر اس کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہوئی تھی۔ اس کے کپڑوں سے انتہائی ناگوار بدبو پھوٹ رہی تھی۔ انہوں نے اس اڈے سے اٹھا کر سیدھا حویلی لایا گیا۔ کئی روز تک اسے مقوی غذائیں کھلائی گئیں۔ مرکز صاف کیا گیا۔ اس کے جب وہ ہوش ٹھکانے ہوئے تو اس نے ایک بار پھر یہ دھمکی دی کہ اگر اس کی شادی دیپا سے نہ ہوئی تو وہ اس بار چرس نہیں پیئے گا بلکہ زہر پی کر موت کو گلے لگائے گا۔

"مرنے کی باتیں نہ کرو بیٹا!" ابا نے کلدیپ سے کہا۔ "میں نے تیرے باپ کو اس شادی کے لئے رضامند کر لیا ہے۔ تیری شادی دیپا سے ہی ہوگی"۔

کلدیپ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ ناقابلِ یقین نظروں سے ابا کی طرف دیکھنے لگا۔ تاہم ابا نے اسے لالہ جی کی ان شرائط کا ذکر نہ کیا جو کہ اس نے اس معاملہ میں لگائی تھیں۔

لالہ جی نے ابا کو خصوصی طور پر لاسا گاؤں بھیجا کہ دیپا اور کلدیپ کی مشروط شادی کے سلسلے میں بات چیت کر کے آئیں۔ ابا نے دیپا کے باپ کو یہ شرائط بتائیں تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"ہم اتنی ذلت آمیز شرائط پر ہرگز شادی نہ کریں گے"۔ دیپا کے باپ نے کہا۔ "ہماری بیٹی ہم پر بھاری نہیں ہے"۔

"اگر تم اور لالہ جی اپنی ضد پر اڑے رہے تو کسی کی جان چلی جائے گی"۔ ابا نے کمیش کی منت سماجت کرتے ہوئے التجا کی۔

ابا کافی دیر تک اسے مناتے رہے لیکن وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ ابا ان کے گھر سے مایوس ہو کر واپس آنے لگے۔

"آپ رکیں"۔ دیپا نے ابا کو روکتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ واقعی کسی کی زندگی موت کا سوال ہے تو میں

کلدیپ سے ہر قیمت، ہر شرط پر شادی کرنے کو تیار ہوں"۔

"تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تو کیوں ہم غریبوں کی رہی سہی عزت کی ارتھی نکالنے پر تلی ہوئی ہے"۔ مکیش نے سرخ نگاہوں سے جلاتے ہوئے کہا۔

"پتا جی! جو شخص میری محبت میں اپنے باپ سے بغاوت کر کے اپنی جان دینے کو تیار ہو سکتا ہے تو وہ لازمی مجھے اچھی بہو کی حیثیت سے رکھے گا"۔ دیپا نے اپنے باپ سے کہا۔ "اگر آج آپ میرے دل سے پوچھیں تو مجھے بھی کلدیپ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ اسے مجھ سے ہے۔ اگر وہ میری خاطر جان دے سکتا ہے تو میں بھی اس کی خاطر اپنی جان دے سکتی ہوں"۔

"بکواس بند کر اپنی"۔ مکیش نے دھاڑ کر کہا۔ "میں تیری زبان کھینچ لوں گا"۔

"پتا جی! آخر آپ نے میری کبھی شادی تو کرنی ہی ہے"۔ دیپا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تو میری سگائی اس جگہ کیوں نہ کریں جہاں میں چاہتی ہوں"۔

"لعنت ہے ایسی لڑکی پر جو اپنے منہ سے اپنا بر مانگتی ہے"۔ دیپا کا بھائی درمیان میں کود پڑا۔ "پتا جی! اگر آپ نے کانپور شہر جا کر دیپا کی شادی میں شرکت کرنی ہے تو کریں۔ میں کسی صورت بھی وہاں نہیں جاؤں گا"۔ پھر اس نے اپا جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جی! اپنے یار لالہ سے کہو کہ اگر وہ رواج کے مطابق ہمارے گاؤں میں بیٹے کی بارات لے کر آئے گا تو یہ شادی ہو سکتی ہے ورنہ لالہ جی اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش"۔

بیٹے کی بات سن کر دیپا کی ماں رونے لگی۔ مائیں بیٹیوں کی ہمدرد، ہمراز ہوتی ہیں۔ اس کو اس بات کا علم تھا کہ اس کی بیٹی بھی کلدیپ سے شادی میں خوش ہے مگر اب سارا معاملہ بگڑ رہا تھا۔

"دیپا کے پتا!" اس نے روتے ہوئے اپنے خاوند سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ لالہ جی کی اکڑ کے پیچھے اس کا بیٹا ہاتھ سے جائے اور تمہاری ضد کی آگ تمہاری بیٹی کو جلا کر بھسم کر دے"۔

"پتا جی! ادھر وہ مرے گا تو ادھر میں زہر کھا لوں گی"۔ بیٹی نے شرم بالائے طاق رکھ کر اپنے باپ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو سوچو کیا ہو گا؟" اپا نے مکیش کے کان میں کہا۔ "ہر طرف تیری بیٹی اور کلدیپ کی محبت کے افسانے پھیل جائیں گے۔ لوگ بات کا بتنگڑ بنائیں گے پھر تمہاری کیا عزت رہ جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ عزت سے بیٹی کو بیاہ دو۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ لالہ جی تمہاری جانب سے ہونے والا خرچہ خود برداشت کریں گے۔ تمہاری بیٹی حویلی میں راج کرے گی اور تمہارا اس کام میں ایک دھیلا بھی نہ خرچ ہو گا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے گا چوکھا"۔

مکیش نے جب یہ بات سنی تو وہ بے چین ہو گیا۔

"لالہ اس کام کے لئے کتنا خرچہ بھیج دے گا؟" اس نے اپا سے پوچھا۔ "وہ دراصل آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے۔ آپ لالہ سے کہیں کہ وہ مجھے کچھ روپے بطور قرضہ دے۔ میرا جب کچھ ہاتھ کھلے گا تو میں اسے قرض کی رقم یکمشت ادا کر دوں گا"۔

"تیری پتنی اور بیٹی تو شادی پر راضی ہیں۔ اب تو مجھے بتلا کہ تو کیا چاہتا ہے؟" اپا نے کام بنتا دیکھ کر خوش ہو کر پوچھا۔

"ارے صاحب! میری اب نارضامندی کی کیا حیثیت رہ گئی"۔ مکیش نے دانت نکال کر کہا۔ "اب تو میرے سامنے وہی مثل ہے کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ میری طرف سے ہاں ہے لیکن ابھی تک آپ نے یہ بات واضح نہیں کی کہ لالہ جی کتنا روپیہ ادھار دے دیں گے؟"

"تمہیں تمہاری توقع سے زیادہ روپیہ ملے گا"۔ ابا نے کہا۔ "اتنا کہ تم کانپور کے برٹش کلب میں آکر بڑے ٹھاٹ سے شادی کرسکو گے۔ میں جب تمہیں شہر بلاؤں تو شادی کے بقیہ معاملات کو طے کرنے آ جانا"۔

اور پھر ابا نے واپس آکر لالہ جی کو اپنی کامیابی سے آگاہ کیا تو انہوں نے اگلے دن کیشن کو بلا لیا اور اس کے ساتھ شادی کی ساری تفصیلات طے کرلیں۔

"یہ پورا ایک لاکھ روپیہ ہے"۔ آخر میں لالہ جی نے کیشن کو ایک بڑا لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ "اس رقم سے بٹی کے لئے زیور، کپڑے اور دوسرا سامان خریدلو اور ہماری بارات کا شاندار استقبال کرنا اور کھانا بھی بڑھیا ہونا چاہئے۔ کوئی کمی نہ رہ جائے"۔

"جو سرکار کی آگیا ہو"۔ کیشن نے لالہ کے ہاتھوں سے روپے لیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میرا جب ہاتھ کھلے گا تو میں یہ رقم لوٹا دوں گا"۔

"مجھے معلوم ہے کیشن تیری اتنی پہنچ نہیں ہے کہ تو اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کرسکے"۔ لالہ جی نے اپنی مونچھوں کو بڑے مغرورانہ انداز میں مروڑ دیتے ہوئے طنزیہ آواز میں کہا۔ "تیرا میرا کوئی لین دین نہیں، میں یہ رقم تجھے کاروبار زندگی میں نقصان سمجھ کر بطور تاوان دے رہا ہوں"۔ پھر لالہ جی نے اس کو شادی کی تاریخ دیتے ہوئے کہا کہ "تو اس دن برٹش کلب میں ہماری بارات کا شان و شوکت کا لبادہ اوڑھ کر سواگت کرنا"۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب کلدیپ کی بارات جانی تھی۔ موٹر گاڑیوں، بسوں اور بگھیوں پر مشتمل کلدیپ کی شاندار بارات برٹش کلب پہنچی تو دیپا کے باپ نے دیسیوں کی سطح کی شادیوں کے انداز میں پوری بارات کا استقبال کیا۔ برٹش کلب کے باہر کلدیپ کے منچلے دوستوں نے کافی دیر تک کان پھاڑ پٹاخوں، آتش بازی کی پھلجھڑیوں، ڈھول باجوں کے رقص وغیرہ سے خوب شغل میلہ لگایا۔ کلدیپ پھولے نہ سما رہا تھا۔

گہرے سرخ رنگ اور بھاری کام سے مزین لہنگے غرارہ دلہن کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اسے جب شادی کی رسموں کے لئے لایا گیا تو اس محفل میں شریک ہر ایک فرد حسد بھری نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"ارے لگتا ہے تو تو آسمان پر سے چاند کا کوئی ٹکڑا توڑ لائی ہے"۔ محلے کی ایک بڑھیا نے جب یہ جملہ اپنے منہ سے نکالا تو کلدیپ کی چچی جل بھن کر رہ گئی۔

"اری سوجن! لگتا ہے تیری نگاہوں کی لو مرجھا گئی ہے"۔ اس نے حسد بھری آواز میں کہا۔ "ذرا اگر اسے میری نگاہوں سے دیکھے تو یہ لولی اتنی حور پری بھی نہیں ہے"۔

"ارے جا! جا، بندر کیا جانے ادرک کا سواد"۔ سوجن نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تجھے کیا معلوم حسن کیا ہوتا ہے۔ دلہن واقعی کسی حور پری سے کم نہیں"۔

پھیروں کے بعد جب دولہا دلہن کی ہندو رواج کے مطابق رسمیں شروع ہوئیں تو کلدیپ کی چچی سے مزید برداشت نہ ہو۔ وہ بد زبان نے سر میں درد کا بہانہ کر کے کھانا بھی نہ کھایا اور دو بربیا کے ہاتھ میں سلامی دے کر چلی گئی۔

ادھر کلدیپ کا چچا شنکر راما کیشن کے قریب ہو کر اس سے الٹے سیدھے طنزیہ چبھتے سوال و جواب کر رہا تھا۔ میرے ابا نے کیشن کے کان میں کہا کہ تم موقعے کی نزاکت کے تحت اس فسادی آدمی کی باتوں کو نظرانداز کرتے جاؤ۔ یہ تو چاہتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو کہ ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔

دیپا کی رخصتی تک شنکر راما اور اس کی بیوی حیلے بہانے کوئی نہ کوئی ایسی جلی کٹی باتیں کرتے رہے کہ انہیں لالہ جی اور کیشن کے خاندان والوں نے بڑی مشکل سے

برداشت کیا۔

ادھر لالہ جی نے بھی اپنی حویلی کو رنگین قمقموں، دیگر آرائشی اشیاء سے خوب سجایا تھا۔ بالخصوص دلہن دیا کا عروسی کمرہ تو تازہ خوشبودار پھولوں اور گلاب، چنبیلی کی پتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دلہن کے حسن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دور دراز کی بن بلائی عورتیں امڈ آئیں۔

لالہ نے چوتھی کی رسم کے لئے بھی کلدیپ کو اس کے سسرال نہ بھیجا۔ دونوں کی شادی کے چوتھے دن ہم لوگوں نے دیا اور کلدیپ کی رات کے کھانے کی دعوت کی۔ ابا نے لالہ کی پوری فیملی کو اس میں مدعو کیا تھا۔ اماں نے ان لوگوں کے لئے کئی قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا تھا۔

دیا سب مہمانوں کی نسبت اتنے تیکھے شرمیلے ڈرے انداز سے کھانا کھا رہی تھی کہ بالآخر اماں کو درمیان میں اُسے ٹوکنا پڑا۔ "ارے بیٹی اب تو اتنے تیکھے ڈرے انداز سے نہ رہو۔ تو لالہ جی کے خاندان کا حصہ اور بڑی بہو ہے"۔

"یہ گھر میں بھی تو بت کی طرح خاموش بیٹھی رہتی ہے"۔ کلدیپ نے کہا۔ "یہ مجھ سے بھی بہت کم اور ادھوری بات کرتی ہے"۔

کلدیپ نے جب یہ جملہ کہا تو ابا نے مزاقاً اس کے کان کھینچتے ہوئے کہا۔ "ارے تمہارے گھر میں آئے ہوئے چند روز ہی تو ہوئے ہیں۔ تمہارا ماحول اپنانے اپناتے کچھ مدت تو لگے گا۔ پھر دیکھنا کیسے کوئل کی مانند کائیں کائیں کرے گی"۔ پھر دلہن سے کہا۔ "ارے بیٹی تو لالہ کی حویلی میں دب کر نہ رہا کر عزت سے رہ"۔

"ارے بھائی عظیم! میری بہو کو نہ بگاڑئیں"۔ سنتو تائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ اماں کی طرف جھک کر سرگوشی کرنے لگی۔ "یہ دیکھنے میں خاموش شرمائی صورت نظر آتی ہے لیکن بڑوں میں رہنے والی مائی کہہ رہی تھی کہ یہ بہت گھنی، چالاک لڑکی ہے۔ چند روز بعد دیکھنا اسے"۔

"تو خود کم گھنی چالاک ہے"۔ اماں نے اُسے ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔

"میں تم دونوں کی باتیں سن رہا ہوں"۔ ابا نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "تم عورتیں جس محفل میں بیٹھ جاؤ ایک دوسرے کی برائیوں کے سوا تمہارا کوئی کام نہیں ہوتا"۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں لالہ جی کی حویلی کا ملازم بابا انتہائی گھبرائی حالت میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ حویلی کے دروازہ پر ایک عدالتی اہلکار کچھ نوٹس لے کر آیا ہے۔ یہ سنتے ہی لالہ جی اپنی حویلی کی طرف دوڑے۔

"بھگوان خیر کرے"۔ تائی سنتو نے گھبرا کر ابا جی سے کہا۔ "آپ ذرا لالہ جی کے پیچھے جائیں اور دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے"۔

ابا اور لالہ حویلی پہنچے تو دروازے پر ڈسٹرکٹ کورٹ کا بیلف حویلی خالی کرنے کا عدالتی نوٹس لئے کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ محکمہ ہنود والے اس حویلی کا کیس جیت چکے ہیں اور آپ اس حویلی سے بے دخلی کا عدالتی حکم وصول کریں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" لالہ جی نے حیران ہو کر کہا۔ "اس حویلی کی ملکیت کا کیس ابھی عدالت میں چل رہا ہے۔ یہ فیصلہ کیسے ہو گیا؟"

"عدالت میں تمہاری مسلسل عدم حاضری کی وجہ تمہارے خلاف یکطرفہ فیصلہ ہو گیا ہے"۔ عدالتی اہلکار نے کہا۔ "تمہارا وکیل کسی پیشی پر حاضر نہیں ہوا ہے"۔

"لیکن میں نے تو وکیل کو اس کی منہ مانگی فیس دے دی تھی"۔ لالہ کیدار ناتھ نے تفکرانہ انداز میں کہا۔ "اور اس نے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ کیس خواہ مخواہ آپ کو تنگ کرنے کے لئے تھوپ دیا گیا ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گا"۔

"اچھا یہ کیس سنبھالا ہے"۔ ریڈر نے طنزیہ

مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس نے تو آپ کی نوری لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ لالہ جی! آپ اس عدالتی نوٹس کو وصول کر کے اپنے وکیل کے پاس جا کر اس کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ اس نے آپ کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا؟"

"لیکن اگر میں نے اسے وصول کرلیا تو میں سرکاری طور پر اس نوٹس کی تعمیل و تکمیل کے لئے پابند ہو جاؤں گا"۔ لالہ جی نے فکرمندی سے کہا۔

اہلکار نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پین لالہ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا کہ آپ میرا وقت برباد نہ کریں، میں نے ابھی اور بہت سرکاری کام نمٹانا ہے۔

لالہ کیدار ناتھ نے ابا کی جانب پریشان کن سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کہ کیا کروں؟

"ارے سرکار جی! تمہیں اور تمہاری زیرلی تو ہوتی رہے گی"۔ ابا نے اہلکار کو کہا۔ "لیکن تم اس وقت ہمارے مہمان ہو، آؤ اندر آؤ تمہاری کوئی سیوا کرلیں"۔

"سیوا کیسی؟" اہلکار نے لالچی انداز میں اشارتاً پوچھا۔

"آپ اندر تو آئیں ہم آپ کی توقع سے زیادہ سیوا کریں گے"۔ ابا نے کہا۔

"آپ مجھے اچھے انسان لگتے ہیں، آپ کہتے ہیں تو کچھ ٹھنڈا گرم پی لیتے ہیں"۔ اہلکار نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا شروع کیا۔

"ارے آپ بھی تعاون والے اچھے انسان ہیں"۔ ابا نے اہلکار کو مکھن لگاتے ہوئے کہا اور اس کو حویلی کے اندر کمرے میں لے آئے۔

"جی آپ کا نام کیا ہے؟"

اہلکار نے اپنا نام کمار بتلایا۔

لالہ خاموشی سے بت بنا دائیں جانب کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابا نے جیب سے پچاس روپے نکالے اور انہیں اہلکار کی مٹھی میں رکھتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ آپ کے ہاتھ

فرمان قائداعظمؒ

یہ شکست خوردہ ذہنیت کی انتہا ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ مسلمانوں کو ایک عظیم قوت بنانے کے لئے اپنی روحوں کو دوبارہ مسخر کر کے ان عظیم روایات اور اصولوں پر سختی سے جم جانا چاہئے جو ان کے زبردست اتحاد کی بنیاد ہیں۔

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ 15 اکتوبر 1937ء)

میں ہے، آپ ہم پر اتنی مہربانی کر دیں کہ اس نوٹس پہ لکھ دیں کہ لالہ اپنی حویلی میں موجود نہیں ہے"۔

"میں آپ کا کام تو کر دوں گا" کمار نے اپنی مٹھی میں پکڑا ہوا نوٹ دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ جس قیمت پر مجھ سے یہ کام کروانا چاہ رہے ہیں وہ قیمت تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ یہ نوٹس حویلی کی بے دخلی کا ہے۔ اگر یہ کوئی عدالتی طلبی کا عام نوٹس ہوتا تو میں ان روپوں کے عوض آپ کا یہ کام کر دیتا"۔

"کمار صاحب! عدالت آکر میں آپ کی اور خدمت کر دوں گا"۔ ابا نے اپنی جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "فی الحال آپ مہربانی کر کے اس نوٹس کے ضمنے میں یہ لکھ دیں کہ لالہ حویلی میں موجود نہیں ہے"۔

"اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟" لالہ نے کافی دیر بعد استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت فائدہ ہوگا لالہ جی!" ابا کا جواب کمار نے دیتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے لالہ جی! آپ سے زیادہ یہ عدالتی مشینری اور قانونی ہیرا پھیریوں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ انکل یہ چاہتے ہیں کہ اگر میں اس عدالتی بے دخلی کے نوٹس پر یہ رپورٹ لکھ دوں گا کہ مذکورہ آدمی گھر میں موجود نہیں ہے تو آپ کو اس کیس کو منجمد کرنے میں اچھا خاصا مزید وقت مل جائے گا"۔

”اور اس وقت میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں“۔ ابا نے لالہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا یہ کام کر دوں گا“۔ کمار نے نوٹ جیب میں رکھ کر کہا۔ ”لیکن میں آپ کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ فی الحال یہ کام لازمی کریں کہ کل صبح اپنے وکیل سے اپنا عدالتی ریکارڈ اٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔ میں پھر آپ کو بتلاؤں گا کہ آپ نے آئندہ اس کیس کو کس طرح آگے چلانا ہے“۔

”ہو! یہ کیا ہو گیا؟“ لالہ جی نے گھبرا کر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے دشمن ذلیل انسان شنکر داس نے مجھ پر کامیاب شب خون مارا ہے اور دوسرے کمبخت وکیل نے مجھے بالکل اندھیرے میں رکھا ہے۔۔۔ یار عظیم! تو ابھی میرے ساتھ دھرم لعل وکیل کے پاس چل وہاں ذرا میں اس سے پوچھوں کہ یہ اس نے میرے ساتھ اتنا بڑا ڈرامہ کیوں کھیلا ہے؟“

ابا اور لالہ جب دھرم لعل وکیل کے پاس پہنچے تو لالہ نے اس کو کہا کہ تیری متعلقہ عدالت میں مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے میرے حویلی کیس کا فیصلہ میرے خلاف یکطرفہ ہو گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

”لالہ جی! تم نے میری جیب میں جتنا مال ڈالا تھا میں نے تمہارا اتنا کام کر دیا“۔ وکیل نے بڑے اطمینان اور ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ تو میرے ساتھ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے“۔ لالہ نے غصے سے کانپتے ہوئے اس سے کہا۔ ”یہ تو نے میرا کام کیا ہے کہ مجھے تباہ و برباد کر رہا ہے“۔

”آرام سے بیٹھو لالہ جی!“ وکیل نے آنکھیں نکال کر بڑے اجنبی لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا دفتر ہے کوئی تمہاری حویلی نہیں ہے جہاں تم مجھ پر میرے مالک بن کر حکم جما رہے ہو“۔

”آرام سے بیٹھ لالہ! ذرا وکیل صاحب کی پوری بات بھی سن لے“۔ ابا نے لالہ سے کہا۔

”مجھے اس نوسر باز بکاؤ وکیل کی کوئی بات نہیں سننی“۔ لالہ جی نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”میں اب بھی تجھے سمجھا رہا ہوں کہ تو میرے دفتر میں ہوش و حواس میں رہ کر انسانوں کی طرح بات کر“۔ وکیل نے بپھر کر کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ میری برداشت کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور میں اپنی کرنی پر آ جاؤں“۔

”تو بکواس بند کر“۔ لالہ نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تو ہی دعدالت میں میرا کیس خراب کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تو نے عدالت میں میرے کیس کی صحیح طریقہ سے پیروی نہیں کی۔ میں تیرے خلاف جوڈیشل لائر عدالت میں درخواست دائر کروا کے تیری وکالت کی رکنیت کینسل کروا کر تجھے اس کچہری کا فقیر بناؤں گا“۔

”تم میرے دفتر سے دفع ہو جاؤ“۔ وکیل نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اور جو تمہارا دل کرتا ہے کرو۔ میں تمہیں تمہارے مقدمہ کی فائل دوں گا اور نہ ہی اس کا پرچانبہ چاہے اس راہ میں میرا وکالت کا لائسنس ہی کیوں نہ کینسل ہو جائے۔۔۔ تو مجھے اس کچہری کا فقیر کیا بنائے گا۔ تو دیکھنا میں تجھے سڑک چھاپ بناؤں گا“۔

لالہ کسی زخمی شیر کی طرح غصے میں لال پیلا ہو کر وکیل دھرم لعل پر دست اندازی کرنے لگا۔ ابا نے اسے لاکھ سمجھایا کہ یہ وکیل کا دفتر ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھے لیکن لالہ اس وقت اتنا بپھرا ہوا تھا کہ اسے سنبھالنا ابا کے لئے انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ لڑائی کا شور سن کر دھرم لعل کے دفتر کے باہر دیگر وکلاء اور سائلوں کا ہجوم لگ گیا۔ لالہ کے چنگل سے دھرم لعل کو بڑی مشکل سے بچایا گیا۔

ابا اور لالہ کو گھر آئے ابھی بمشکل دو گھنٹے ہی ہوئے ہوں گے کہ دونوں کے گھر پولیس کی بھاری نفری آ گئی۔ پولیس نے ابا اور لالہ کو برے طریقے سے مار پیٹ کے گرفتار کر لیا۔

آخری سلام

مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے

تحریر: آفتاب احمد

1958ء اور 1971ء نے پاکستان [illegible] کے وقت [illegible] سبب [illegible] قوم کی [illegible] دولت کی یا حیثیت [illegible] اس کی نظروں میں گرا دیا۔ [illegible] حکمران کو خوف [illegible] انہوں نے اپنے [illegible] ایک اور تلخی اور [illegible] مزاحمت کی [illegible] استحصال [illegible] ناقابل یقین [illegible] کے مستحق [illegible] کے بعد [illegible] بھی انہیں تین سال [illegible]

میری اماں اور سنتو تائی نے مجھے اور کلدیپ کو تھانہ وزیرآباد۔ میں اور کلدیپ جب تھانے پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ابا اور لالہ کو متعلقہ تھانیدار نے زمین پر بٹھایا ہوا ہے اور وہ دونوں کو مسلسل ننگی گالیاں دیے جا رہا ہے۔

"میرے ابا اور چاچا کو زمین پر کیوں بٹھایا ہوا ہے؟"
کلدیپ نے تھانیدار سے پوچھا۔

"تو اور کیا ان دونوں عادی بدمعاشوں کو تخت طاؤس پر بٹھاؤں؟" تھانیدار نے چلاتے ہوئے کہا۔

"یہ غیر قانونی ہے"۔ کلدیپ نے دلیری سے کہا۔
"آپ ان دونوں کو یہاں کس جرم میں لے کر آئے ہیں؟"

"تو مجھے قانون پڑھائے گا دو بالشت کے چھوکرے!" تھانیدار نے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیرے باپ اور اس کے بھائی نے اس شہر کے مشہور قابل عزت وکیل دھرم لعل کے دفتر میں گھس کر نہ صرف ان کے ساتھ ہاتھا پائی کی ہے بلکہ ان کے دفتر میں موجود سائلوں کے قیمتی ریکارڈ پھاڑ دیے ہیں اور دھمکیاں لگائی گئی ہیں۔ اب ان دونوں کی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور عدالتوں، تھانوں کے دھکے کھاتے ہوئے گزرے گی۔"

"تایا جی اور اباجی بے ضرر انسان ہیں"۔ میں نے بھی ہمت کی اور تھانیدار سے کہا۔ "یہ بے قصور ہیں۔ آپ انہیں چھوڑ دیں"۔

"چلو اوئے، تم دونوں اس تھانے سے دفع ہو"۔
تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا۔

اسی دوران وکیل دھرم لعل اپنے چند وکیل ساتھیوں کے ساتھ تھانے میں آیا۔ اس کے بائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ ہیں ان دونوں بدمعاشوں کے چھوکرے"۔
تھانیدار نے ایک سینئر وکیل کی توجہ ہماری طرف دلواتے ہوئے کہا۔

"چلو اوئے دونوں اپنی اماؤں کو کہہ دو کہ وہ دوسرے دن دلہن"۔ اس بڈھے وکیل نے خباثت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ دونوں تو اب تا عمر سرکاری مہمان ہیں"۔

اس بڈھے وکیل نے یہ دل جلا جملہ کہا تو اباد نے اسے بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"دیکھو یہ پاگل ہو گیا ہے"۔ اس خبیث نے اپنے ساتھیوں سے کہا پھر لالہ سے کہنے لگا۔ "جتنا تیرا دل کرے ہمیں گالیاں دے ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا"۔

میں اور کفد یہ اس تھانے سے خوار، پریشان ہو کر گھر آ گئے۔ محلے کے چند لوگوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ تھانے میں بند دونوں کو چھڑوانے کے لئے تھانیدار کی مٹھی گرم کرو۔ تھانیدار کو اس زمانہ میں دو ہزار روپے رشوت دینے کی بھی کوشش کی لیکن نہ جانے ان وکلا نے اس تھانیدار پر کیا دباؤ ڈالا یا جادو کیا تھا کہ اس نے دونوں کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔

دوسری پریشانی یہ ہو رہی تھی کہ ان دونوں کو پولیس اور عدالت کے چنگل سے چھڑانے کے لئے کوئی وکیل دھرم لعل کے خلاف کیس نہیں لے رہا تھا۔ لگتا تھا سب نے ایکا کیا ہوا تھا۔ بہر حال جس دن تک ابا اور لالہ کی ضمانت نہ ہوئی کبھی ایک تھانے سے فلاں تھانے، فلاں کورٹ سے دوسری عدالت یعنی کسی گیند کی طرح پھرائے جاتے رہے۔ بڑی مشکل سے بیس روز بعد ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سے ان کی 30 دن کی عبوری ضمانت کروائی گئی۔ اس زمانہ میں ابا اور لالہ کی عبوری ضمانت پر خاصے روپے خرچ آئے۔

تھانہ کچہریوں میں ہاتھ ذلت انگیز سلوک اور دھکے کھانے کے باوجود لالہ کا وکیل دھرم لعل کے خلاف غصہ کم نہ ہوا۔ ابا اُسے سمجھاتے رہے کہ لالہ اس معاملہ پر صبر شکر کر کے مال و زر اور جان کی قیمت پر اپنی حویلی کو ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے ہتھے لگنے سے بچا۔ لالہ کیدار ناتھ نے ابا کی باتوں کی کوئی پروا نہ کی اس نے اپنے طور پر دوسرے شہر کے ایک بڑے

کھوٹے وکیل پنچال کو حویلی کے دونوں کیسوں اور دھرم لعل کے خلاف جھوٹے کیس بنانے کے لئے راضی کر لیا۔

پنچال نے بڑی مشکل سے عدالت سے حویلی کے چلنے والے دونوں کیسوں کا ریکارڈ نکلوایا (اس کام میں خفیہ طور پر اس عدالتی اہلکار نے بہت مدد کی جو حویلی کی بے دخلی کا عدالتی نوٹس لے کر آیا تھا)۔ پنچال نے دن رات انتھک محنت کر کے دھرم لعل کے خلاف ہرجانہ اور ابا، لالہ کی مختلف مقدمات سے بریت کے کئی کیس دائر کر دیے۔

دھرم لعل نے عدالت میں ثابت کر دیا کہ اس نے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے مقدمہ میں لالہ کی پیروی میں بھرپور جیتیاں بھگتی تھیں (اس نے اپنی فریبانہ وکالت کے بل بوتے پر اپنے حق میں ثبوت فراہم کیے تھے) وہ عدالت سے ہرجانہ کے کیس میں بڑی صفائی سے بری ہو گیا۔

دھرم لعل ہرجانہ کے کیس سے بری تو ہو گیا لیکن ابا اور لالہ کے خلاف اب بھی دھرم لعل کو مار پیٹ کرنے کی کوشش کرنے کے خلاف دو کیس قائم تھے۔ ان دونوں کیسز کے لئے متعلقہ جج نے دو گواہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ پنچال نے لالہ کو کہا کہ آپ لوگوں کی ان دونوں کیسز میں بریت میں آپ کی جانب سے پیش کیے گئے گواہان کی بڑی مرکزی اہمیت ہو گی اور ان کی بنیاد پر تم دونوں بری بافیہ ہو سکتے ہو۔ نیز یاد رہے کہ ان کیسوں کے لئے بڑے وفادار، پکے اور دلیر گواہان چاہئیں جو عدالت میں تمہارے حق میں گواہی دے سکیں۔

لالہ اور ابا کو درج بالا خصوصیات کے حامل دو گواہان تو کیا ملتے تھے یہاں تک ہوا کہ اردگرد اور قریبی رشتہ داروں نے وکیل دھرم لعل کے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیا۔ مقررہ تاریخ قریب سے قریب آ رہی تھی۔ لالہ جی اور ابا اس معاملہ میں انتہائی ذہنی کرب کا شکار تھے۔ ان کو کال کوٹھڑی اور جیل کی پُرمشقت زندگی نظر آ رہی تھی۔

(جاری ہے)

چوک کی طرف موڑ لی۔

24 سالہ عامر چوہدری پراپرٹی ڈیلر ہونے کے ساتھ پاکستان پارٹی کا صوبائی سیکرٹری تھا۔ عامر چوہدری کے باپ وحید چوہدری حاجی پورہ سیٹ سے ایم پی اے رہ چکے تھے۔ وہ کئی محکموں کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ سیاست کا پٹا مہرہ ہونے کے باوجود حاجی پورہ میں وحید چوہدری کا خاصا اثر تھا۔

علی حسن موقع واردات پر پہنچا تو وہاں علاقائی تھانہ شہر کے تھانہ انچارج طاہر اقبال ضروری کورس کے سلسلے میں گئے ہوئے تھا۔ علی حسن نے دیکھا موقع پر سیاہ رنگ کی ہنڈا بائیک گری پڑی تھی اور پاس ہی ایک بدحواس نوجوان کھڑا تھا۔ بائیک کے پاس ہی لہولہان عامر چوہدری پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر میں گولی لگی تھی۔ علی حسن نے اسے پولیس جیپ سے صدر ہسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد بدحواس کھڑے نوجوان سے پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا اس کا نام ارحم نذیر ہے۔ وہ عامر چوہدری کا سالا تھا۔ اس نے بتایا بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو انہوں نے بھیا جی کو فون کر کے دوا لانے کو کہا تھا۔ وہ دوا لے کر دکان سے گھر آئے تھے۔ وہ پیدل تھے سو میں عامر بھائی کو چھوڑنے ان کے گھر جا رہا تھا۔ بائیک میں چلا رہا تھا۔ عامر بھائی پیچھے بیٹھے تھے۔ ہمیں پر پیچھے سے ایک بائیک پر سوار دو نوجوان آئے اور لات مار کر انہیں گرا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسلحہ نکالا اور عامر بھائی پر دو گولیاں چلائیں۔ ایک فائر مس ہو گیا جبکہ دوسرا ان کے سر میں لگا۔ اس کے بعد ہی عامر بھائی بے حرکت ہو گئے اور حملہ آور فرار ہو گئے۔

"تم نے بائیک کا نمبر نوٹ کیا؟" علی حسن نے اس سے پوچھا۔

"سر! میں اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ نمبر نوٹ کرنا تو دور، میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ بائیک کس کمپنی کی اور کس رنگ کی تھی۔" ارحم نذیر نے بتایا۔

"اور دونوں نوجوانوں کے چہرے مہرے کیسے تھے؟"

ابھی علی حسن ارحم نذیر سے پوچھ گچھ کر ہی رہا تھا کہ تبھی صدر ہسپتال سے خبر آئی کہ ابتدائی معائنے میں ہی ڈاکٹرز نے عامر چوہدری کو مردہ قرار دے دیا۔ مقتول عامر چوہدری کا مکان ڈاک بنگلہ روڈ پر تھا۔ حادثہ کی خبر وہاں پہنچی تو اس کے گھر والے روتے بلکتے ہوئے آ گئے۔ مقتول کا باپ سابق وزیر وحید چوہدری اس قدر غصے میں تھا کہ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ وہ چلا چلا کر حاجی پورہ کے ممبر صوبائی اسمبلی عاشق حسین راٹھ کو ملزم ٹھہرا رہے تھے۔ وحید چوہدری نے جو کچھ پولیس کو بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

ایم پی اے عاشق حسین راٹھ کرلان پورہ کالونی کے اصل باشندے ہیں۔ وہیں ان کے گھر کے سامنے کلثوم اختر کی زمین تھی۔ کلثوم اختر گلاب پورہ گاؤں کی رہنے والی ہے۔ ان کے شوہر کا نام مرزبان چوہدری ہے۔ چونکہ عامر چوہدری پراپرٹی ڈیلنگ کا کام کرتا تھا اس لیے اس نے کلثوم اختر سے ان کی تقریباً دو ایکڑ زمین خریدی تھی۔ اس کا سودا 8 نومبر 2011ء کو ہوا تھا۔ وحید چوہدری نے الزام لگایا کہ عاشق حسین راٹھ کی نظر اس زمین پر تھی۔ جب کلثوم اختر نے عامر چوہدری سے زمین کا سودا کر لیا تو عاشق حسین اس زمین پر قبضہ کی کوششوں میں جت گئے۔ اس کوشش میں انہوں نے مذکورہ زمین پر ناجائز طور سے جھونپڑی بنائی تھی اور فرصت کے اوقات میں وہاں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ عامر پر دباؤ بھی ڈال رہے تھے کہ جتنا پیسہ کلثوم اختر کو دیا ہے اتنا پیسہ ان سے لے کر زمین کے سودے سے ہٹ جائے۔ عامر زمین چھوڑنے پر راضی نہیں تھا۔ سو عاشق حسین راٹھ اس سے رنجش رکھنے لگے تھے۔ اس کے نتیجے میں

عامر چوہدری کا قتل ہوا ہے۔

تم اس کی زندگی پر رحم نہیں کھا سکے تو اس کی موت پر کیا افسوس کرو گے؟

وحید چوہدری نے جو الزام عائد کئے اس کی بنیاد پر ابتدائی رپورٹ بھی درج کرا دی۔ مقدمہ قتل کے تحت تھانہ صدر میں درج کیا گیا۔ اس کیس کی تفتیش طاہر اقبال نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی۔

9 جون کو صبح ہوتے ہی عاشق حسین راجے کو ملزم بنانے کے نتیجے میں عوام نے شہر بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ دکانوں کے شٹر گر گئے۔ مشتعل ہجوم سڑکوں پر نکل آیا۔ پولیس و انتظامیہ کے خلاف نعرے بازی ہونے لگی۔ پولیس نے عوام کی آواز دبانے کی کوشش کی تو دیگر مقامات پر ہجوم مشتعل ہو کر توڑ پھوڑ اور آتش زنی پر آمادہ ہو گیا۔ اعلیٰ پولیس افسران نے مشتعل ہجوم کے سامنے چوبیس گھنٹوں میں حقیقی ملزموں کی گرفتاری کا وعدہ کیا۔ تب کہیں جا کر ہجوم پرسکون ہوا۔

تہہ تک پہنچنے کے لئے پولیس نے اپنی پوری صلاحیت جھونک دی۔ دراز تک تحقیق اور سرولانس کی مدد لی۔ پتہ کیا جانے لگا کہ حادثہ کے وقت کن کن نمبر کے موبائل فون ڈاک بنگلہ چوک ٹاور علاقے میں سرگرم تھے۔ اس سمت سرولانس سیل کو کامیابی بھی ملی۔ پتہ چلا کہ ارحم نذیر اور عامر چوہدری کے ساتھ دو دیگر موبائل نمبر مدینہ کالونی سے ڈاک بنگلہ چوک ٹاور تک ان کے برابر چل رہے تھے۔ اندازہ لگانا آسان تھا کہ عامر اور ارحم بائیک پر جا رہے تھے اور دو موبائل نمبر جن کے پاس تھے دو بائیک سے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ پھلاں والا چوک اور ڈاک بنگلہ چوک کے درمیان انہیں مناسب موقع ملا اور انہوں نے عامر کا قتل کر دیا۔ پولیس نے ان موبائل نمبروں کے مالکوں کا پتہ لگایا اور ان کی لوکیشن ٹریس کرائی تو ملزموں تک پہنچنے کی تیاری ہو گئی۔

9 جون کو ہی آدھی رات کو پولیس نے لاہور میں واقع شاہدرہ سے راجو کو گرفتار کر لیا۔ راجو کو تھانہ صدر لا کر اعلیٰ سطحی پوچھ گچھ کی گئی تو واردات کے پیچھے زمین کا تنازعہ نہیں بلکہ ایک خوبصورت بیوی کی خونی سازش نکلی۔

> انسان کی شہرت اس کی پرچھائیں ہے۔ جب آگے ہوتی ہے تو بہت بڑی نظر آتی ہے اور جب پیچھے ہوتی ہے تو سکڑ جاتی ہے۔ (بشیر شہزاد)

وحید چوہدری کے کنبے میں بیوی کے علاوہ گیارہ اولادیں تھیں، سات بیٹے اور چار بیٹیاں۔ بیٹیوں کے بیاہ ہو گئے تھے جبکہ چھ بیٹے بال بچوں والے ہو کر روزگار سے لگ گئے تھے۔ ساتواں سب سے چھوٹا بیٹا عامر چوہدری تھا۔ عامر کو بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ سکول اور کالج میں ڈراموں میں حصہ لینے کے علاوہ وہ باہر کے سٹیجوں پر بھی پرفارم کرنے میں سرگرم تھا۔ اس کا شمار اچھے اداکاروں میں ہوتا تھا۔

ایسے ہی ایک ڈرامے کی ریہرسل کے دوران عامر کی ملاقات کاشفہ سے ہوئی۔ کاشفہ آفیسر کالونی کے باشندے نذیر احمد کی بیٹی تھی۔ جو چشمہ جہلم بیراج پاور میں ملازم تھے اور ان کی آمدنی سے ہی کنبے کا گزارا چلتا تھا۔ کاشفہ کی ایک بڑی بہن اریبہ اور چھوٹی بہن سدرہ تھی۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا ارحم نذیر۔ کنبے میں سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ کینسر سے نذیر احمد کی موت ہو گئی۔ کمانے والا ایک تھا اور کھانے والے پانچ۔ کمانے والا نہ رہا تو کنبے کے ممبران نے اپنی اپنی ذمہ داری سنبھال لی جس کا جو شوق تھا اسے ہی پیسہ کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔

کاشفہ کو شروع سے سٹیج پر اداکاری کا شوق تھا۔ اس کی اداکاری اور ڈائیلاگ ڈلیوری سبھی کو اچھی لگتی تھی۔ دیکھنے میں بھی وہ بے حد خوبصورت تھی۔ گھر میں کمانے والا کوئی نہیں رہا تو کاشفہ اپنے فن سے پیسہ کمانے لگی۔

گھر کے اخراجات کے ساتھ وہ اپنی پڑھائی کا خرچ بھی نکالتی تھی۔ وہ بی اے کی طالبہ تھی۔

غم جس قدر زیادہ ہوگا یقین اتنا ہی ضعیف ہوگا۔
(دستگیر شہزاد)

انہی دنوں ایک تنظیم نے ''خوبصورت سپنا'' نامی ڈرامہ پیش کرنے کا پروگرام بنایا تو ہیرو کے طور پر عامر اور ہیروئن کے کردار کے لئے کاشفہ کا انتخاب کیا۔ دونوں کا ہی رول جاندار تھا۔ اس لئے دونوں راضی ہو گئے۔ اس ڈرامے کے ذریعے ہی عامر اور کاشفہ کی آمنے سامنے ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ کچھ عرصہ وہ پیار کی پینگیں بڑھاتے رہے اور پھر انہوں نے شادی کی سمت قدم بڑھایا۔ کاشفہ کے گھر والوں کو اس رشتے پر اعتراض نہیں تھا مگر عامر جانتا تھا کہ اس کے گھر والے غیر برادری کی کاشفہ کو قبول نہیں کریں گے۔ کوئی ان دونوں کو جدا نہ کر سکے اس لئے عامر نے گھر والوں کو اعتماد میں لئے بغیر ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی ملامت کی پروانہ کرو کیونکہ داغ اجلے دامن پر ہی نمایاں ہوتا ہے اور لوگ اپنا میلا کچیلا دھونے کے لئے صرف صاف پانی کا انتخاب کرتے ہیں۔ (دستگیر شہزاد)

2006ء میں عامر نے بذریعہ فیملی کورٹ کاشفہ سے شادی کر لی اور پھر اسے اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ کنبے کا کوئی بھی فرد کاشفہ کو کنبے کی بہو قبول کرنے کو راضی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اسے گھر میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ عامر اور کاشفہ نے بے حد مشکل سے وہ شام اور رات گھر میں گزاری اور صبح ہوتے ہی عامر کاشفہ کے ساتھ اس کے میکے چلا گیا۔ کاشفہ بھی وہیں رہتی رہی اور عامر بھی گھر داماد بن گیا۔ کاشفہ کے کنبے کا سارا خرچ عامر اٹھانے لگا۔ جب کچھ عرصہ بعد گھر والوں سے عامر کا سمجھوتہ ہو گیا تو وہ اپنے گھر میں جانے لگا مگر کاشفہ کا سسرال میں داخلہ ممنوع ہی رہا۔

اسی دوران کاشفہ کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ عامر کوئی بڑا کام کرنا چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے طے کیا کہ جو کام اسے آتا ہے اسی میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس لئے وہ اداکاری کے میدان میں قسمت آزمانے کراچی چلا گیا لیکن وہاں اسے جلد ہی حقیقت کا علم ہو گیا کہ اپنی شناخت بنانے کے لئے اسے موقع ملا بھی تو اس میں برسوں لگ جائیں گے جبکہ ذمہ داریاں منہ کھولے سامنے کھڑی تھیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے عامر کو پیسہ چاہئے تھا۔ اس لئے اس نے تعمیر کاری کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد رہنے کا مناسب انتظام کر کے کاشفہ کو بھی کراچی بلا لیا۔

کاشفہ کی زچگی کا وقت قریب آیا تو عامر نے دیکھ بھال کے لئے ساس شکیلہ بیگم، سالی اریبہ اور سالے ارحم کو کراچی بلا لیا۔ 2007ء میں کراچی میں ہی کاشفہ نے بیٹے شایان کو جنم دیا۔ زچگی کے بعد اس کے سسرال والے عاکف کو لے کر واپس چلے گئے۔ دو سال بعد عامر کا دل کراچی سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر [illegible] لوٹ آیا اور یہاں آکر اس نے پراپرٹی ڈیلنگ کا کاروبار شروع کر دیا۔ وہ زیادہ تر اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے برعکس کاشفہ کا ٹھکانہ میکا ہی رہا۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ اسی دوران اریبہ کی شادی ہو گئی اور سب سے چھوٹی سدرہ کا رشتہ بھی آفتاب احمد سے ہو گیا جو پوسٹ آفس میں ملازم ہو گیا تھا۔ آفتاب سے چھوٹا بھائی بائیس سالہ عادل زرعی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی پڑھائی کر رہا تھا۔

25 جون 2012ء کو آفتاب کی شادی سدرہ سے ہو گئی۔ بھائی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے عادل دلہن کی رخصتی پر زرعی یونیورسٹی سے لوٹ آیا تھا اور

شادی کے پروگرام میں اس کی ملاقات کاشفہ سے ہوئی تھی۔ ایک ہی جھلک میں خوبصورت اور حسین کاشفہ عادل کے دل کو اس قدر بھا گئی کہ وہ اس کے آگے پیچھے منڈلانے لگا۔ صدرہ کو لے کر بارات رخصت ہوگئی تو عادل کاشفہ کو لاہور سے فون کرتا رہا۔ اس کی باتیں بہت ہی لچھے دار ہوتی تھیں اس لئے کاشفہ بھی باتیں کرنے کے لئے اس کے فون کی منتظر رہتی تھی۔

> زندگی کا سہارا اگر محض امید ہی ہے اور عمل نہیں ہے تو موت کا سبب مایوسی ہوگی۔ (دلکش شہزاد)

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد عادل راولپنڈی یونیورسٹی لوٹ گیا تو وہاں سے بھی کاشفہ کو فون کرتا رہا۔ اس کی باتیں دیوانگی سے پر ہوتی تھیں۔ وہ کاشفہ سے پیار کا دعویٰ کرتا تھا اور اس سے شادی کرنے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں بھی کھاتا تھا۔ ہر لڑکی کی طرح کاشفہ نے بھی اپنے گھر سنسار کا خواب دیکھا تھا۔ ایک زمانے کے لئے اسے سپنوں کا گھر ملا بھی لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی دھتکار کر وہاں سے بھگا دی گئی تھی۔ اس گھڑی کے بعد سسرال کی چوکھٹ پار کرنے کی خوشی نصیب نہیں ملی تھی۔ شادی کے دوسرے ہی دن سے وہ میکے میں پڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ عامر اس کے سارے خرچے برداشت اٹھاتا تھا مگر وہ زیادہ تر اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ اس سے کاشفہ کو کبھی کبھی لگتا کہ وہ بیوی نہیں رکھیل ہے۔ اسی لئے وہ عادل کی پیشکش پر سنجیدگی سے غور کرنے لگی۔ اسے لگتا تھا کہ ان کی شادی میں ذات پات کوئی مسئلہ نہیں بنے گی۔ یہی سوچ کر اس نے عامر کا دامن جھٹک کر عادل کو زندگی کے سفر کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد کاشفہ اس کے پیار کا جواب پیار سے دینے لگی۔

کاشفہ نے عادل کی محبت قبول کی تو وہ فوراً حاکی پور آ گیا۔ اتفاق سے کاشفہ گھر میں اکیلی تھی۔ جو کی

> بعض پرندے اونچی پرواز کے اس مرحلے میں پہنچ جاتے ہیں کہ ہوا ان کے راستے میں مزاحم ہونے کے بجائے ان کے پروں کا سہارا بن جاتی ہے۔ (اشتیر شہزاد)

محبت میں دونوں قابل اعتراض حد تک قریب ہو گئے اور پھر تہذیب کی دیوار گرنے میں دیر نہیں لگی۔ کچھ ماہ بعد عادل کو انجینئرنگ کی ڈگری مل گئی اور وہ لاہور لوٹ آیا۔ کاشفہ سے ملنے کے لئے وہ حاکی پورہ جاتا رہا اور کاشفہ بھی بہن سے ملنے کے بہانے لاہور آتی رہی۔ کاشفہ اور عادل کے پاس باتوں اور ملاقاتوں کے لئے مواقع ہی مواقع تھے۔ عادل نوکری مل جانے کے بعد کاشفہ سے شادی کرنے کے لئے بالکل تیار تھا لیکن کاشفہ کہتی تھی۔ مجھ سے شادی کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ عامر مجھے طلاق دے گا نہیں اور میں تم سے شادی کر نہیں سکوں گی۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس کے بعد دونوں سر جوڑ کر بیٹھے تو عامر کے قتل کا منصوبہ بن گیا۔ طے ہوا کہ کسی پیشہ ور قاتل سے عامر کا کام تمام کروا دیا جائے۔ کاشفہ کے پاس پچاس ہزار روپے تھے۔ شوہر کے قتل کے لئے وہ یہ رقم خرچ کرنے کو تیار ہو گئی۔

عادل کا ایک ماموں زاد بھائی رئیس سالار راجو تھا۔ وہ بی اے کا طالب علم تھا اور اپنے کنبے کے ساتھ شاہدرہ میں رہتا تھا۔ عادل نے راجو کو اپنی داستان محبت سنا کر اسے عامر کے قتل کی بات کہی تو راجو نے اسے اپنے واقف کار حمزہ سے ملوا دیا۔ حمزہ ابھی حال ہی میں جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ وہ انہیں ندیم عرف لالہ کے پاس لے گیا جو مشہور ارشد چوہدری گروہ کا ممبر تھا اور علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتا تھا۔ سپاری کی بات ہوئی تو لالہ نے عامر کے قتل کے لئے 80 ہزار روپے مانگے۔ مول تول کے بعد سودا پچاس ہزار میں طے ہو گیا۔ عادل نے فوراً بیس ہزار روپے پیشگی بھی

رہے دیئے۔ باقی رقم کام ہو نے کے بعد دینے کا وعدہ کیا گیا۔

اس کے بعد تینوں حاجی پورہ گئے اور ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع سینٹر پوائنٹ ہوٹل میں فرضی نام و پتے سے ٹھہرے۔ یہ 8 جون کی بات ہے۔ فون کے ذریعے کاشفہ عادل سے مسلسل رابطے میں تھی اور عامر کی سرگرمیوں کی لحہ بہ لحہ خبر اسے دے رہی تھی۔ قتل کے لئے انہوں نے رات 9 بجے سے 11 بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سڑکوں پر بھیڑ نہیں ہوتی اور واردات کرنے اور فرار ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔

عادل کی ہدایت کے مطابق کاشفہ نے عامر کو فون کر کے بتایا کہ اس کے پیٹ میں درد ہے اس لئے وہ اس کے لئے دوا لے کر آئے۔ عامر نے کسی ڈاکٹر یا میڈیکل سٹور والے سے کاشفہ کا حال بتا کر دوا لی اور سسرال پہنچ گیا۔ کاشفہ نے موقع نکال کر فوراً عادل کو فون کر دیا۔ حمزہ اور لالہ بائیک لے کر آ گئے تھے۔ عادل نے انہیں کاشفہ کے گھر کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس لئے وہ فیصل کالونی پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں پھر عادل کے موبائل پر کاشفہ کا فون آیا کہ عامر اور میرا بھائی ارحم اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ عامر کو گاڑی چلانا نہیں آتی اس لئے وہ بائیک پر پیچھے بیٹھے گا اور گاڑی ارحم چلائے گا۔ شوہر کو کہہ دو کہ پیچھے بیٹھنے والے کا کام تمام کرنا ہے۔ ارحم کو خراش تک نہیں آنا چاہئے۔ عادل نے فوراً یہ بات لالہ کو بتا دی۔

رات ساڑھے آٹھ بجے ارحم اور عامر بائیک پر سوار ہو کر نکلے تو شوٹر ان کے پیچھے لگ گئے۔ رزاک بنگلہ روڈ پر حمزہ سپیڈ بڑھا کر بالکل ان کے برابر آ گیا۔ لالہ نے لات مار کر دونوں کو بائیک سمیت گرا دیا اور پھر لالہ نے عامر پر دو گولیاں چلائیں۔ ایک نشانہ چوک گیا مگر دوسری گولی نے عامر کا بھیجا اڑا دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں موقع سے فرار ہو گئے۔

9 جون کی صبح کو عادل نے سپاری کلرز کو باقی رقم بھی دے دی تھی۔ یہ پورا پیسہ کاشفہ نے اسے دیا تھا۔ راجو کے بیان اور اس کی نشاندہی کی بنیاد پر حمزہ اور ندیم عرف لالہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اب کاشفہ اور عادل کی گرفتاری باقی تھی۔ عامر کے قتل کے بعد کاشفہ اپنی سسرال آ گئی تھی۔ وقوعہ کے حالات ایسے تھے کہ کہیں اسے جانے کو بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لئے ایس پی مغل مغل نے کاشفہ کی گرفتاری کے لئے انسپکٹر سہیل احمد کو پولیس ٹیم کے ساتھ حبیب چوہدری کے گھر بھیجا۔ پولیس کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ کاشفہ کو وہاں سے نکال لانے میں کامیاب ہو گئی۔ پوچھ گچھ میں کاشفہ نے عادل سے محبت کے تعلقات تو قبول کئے مگر عامر کے قتل کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کر رہا۔ گرفتاری کے وقت وہ تین ماہ کے حمل سے تھی۔

18 جون کو عادل نے حاجی پورہ کورٹ میں خود سپردگی کر دی۔ دوسرے روز پولیس نے ریمانڈ پر لے کر پوچھ گچھ کی تو ساری تفصیل سامنے آ گئی جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ کیس ورک آؤٹ ہونے کے بعد ایم پی اے عاشق حسین نے خود جرنلسٹوں کو بریفنگ دی۔ کاشفہ اور عادل کے ذریعے تیار کی گئی اس سازش کی گواہ ان کی فون کالز اور ایس ایم ایس تھے۔ سرالانس کے مطابق پولیس نے کاشفہ اور عادل کے موبائل فون کی کال ڈیٹیلز نکالی ہے۔ دونوں کے ذریعے ایک دوسرے کو بھیجے گئے ایس ایم ایس کا سی ڈی تیار ہو چکا ہے۔ ملزم حمزہ چار اس ہزبان ڈسٹرکٹ جیل میں تھے۔ کیس بالکل واضح ہے وجہ قتل اور ثبوت بھی صاف ہیں۔

لوگ مطلب نکال کر یوں آنکھیں پھیر لیتے ہیں جیسے زندگی زبان سیکھ کر اس کی گرامر بھول جائے۔ (دلکش شہزاد)

■✻■

ایک غلط فہمی کا ازالہ

موضوع احادیث

حدیث رسولؐ کے معاملے میں ذاتی انا کو قربان کرتے ہوئے اکابرینِ اُمت کو مشعلِ راہ بنایئے!

☆ .... 0305-6614254 .... شہزاد احمد

نومبر 2014ء کے شمارہ میں مجاہد ادیب صاحب نے احادیث موضوعہ اور ضعیفہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی جس میں انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ زیرِ نظر تحریر اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہے۔

علم دین ایسا وہ کی شان ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے آپ کو جاہل کہلانا پسند نہیں کرتا لیکن محنت طلب ایسا ہے کہ نفس پرستوں کے لیے اس کا حصول خاصا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر، انجینئر، بینکر، معیشت دان حتیٰ کہ پلمبر یا الیکٹریشن کو کوئی بھی Dictation دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ جو کہہ دیں جیسا کہہ دیں سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے۔ مگر دینی معاملات میں کوئی دینی مسئلہ چھڑ جائے ہر شخص اپنی اپنی ہانکنے لگ جاتا ہے خواہ وہ دین کی الف، بے بھی نہ جانتا ہو اور اگر مقابل کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو جواب ملتا ہے کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ عقول مختلف ہیں اگر ہر بات نفسِ عقل پر مبنی ہوتی تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری قطعاً ضروری نہ ہوتی لیکن چونکہ عقل و رہنمائی کی ضرورت تھی لہٰذا یہ مبارک سلسلہ چلا اور آخر میں ہمارے آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور دین کی تکمیل فرمائی۔ چونکہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام آخری نبی ہیں اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد نیا نبی نہ آنا ہے اور نہ ہی آئے گا لہٰذا دینی تعلیمات کے پہنچانے کا ذی شان منصب علمائے کرام، مجتہدین عظام اور محدثین زماں کے حصے میں آیا کہ وہ اُمتی ہونے کی حیثیت سے اس دین کو آنے والی نسلوں تک پہنچائیں جسے وہ لوگ احسن طریقے سے کرتے آئے ہیں۔

تیسری بات چونکہ قرآن و سنت میں بعض چیزیں صریح یا مبہم ہوتی ہیں جن میں تاویل و تطبیق کے بغیر کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور عقلِ انسانی ایک سی ہوتی نہیں نیز اُمت مسلمہ کا شیرازہ پارہ پارہ ہونے کا اندیشہ بھی موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا امت کے اتحاد و اتفاق اور اصلاح کے لیے ایک انتہائی خوبصورت اصول بیان فرمایا۔ ''چلا اُن لوگوں کے راستہ پر جن پر تیرا انعام ہوا، نہ اُن لوگوں کے راستے پر جن پر تیرا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے''

(الفاتحہ)۔ نیز ان انعام یافتہ لوگوں کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس سے مراد انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ مراد ہیں اور حدیث پاک میں فرمایا۔ البرکۃ مع اکابرکم (برکت تمہارے بڑوں کے ساتھ ہے)۔

پھر ممکن تھا کہ لوگ صالحیت کا معیار اپنی اپنی مرضی سے مقرر کر لیتے تو اس کے حل کے لئے اکثریت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ فرمایا۔ "بڑے گروہ کی پیروی کرو، جو ان سے جدا ہوا، جدا ہی جہنم میں ڈالا جائے گا"۔

(مشکوٰۃ شریف)

دوسری روایت میں فرمایا۔ "لن تجتمع امتی علی ضلالۃ" "میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی"۔ یعنی 51 فیصد اس امت کی کبھی باطل نظریات کو قبول نہیں کر سکتا اور اس حدیث پاک کی صداقت آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ امت کی اکثریت آج بھی اپنے اکابرین کے عقائد پر ہے۔

تو حاصل کلام یہ نکلا کہ انفرادی رائے کی بجائے اجتماعی رائے کو، اصاغر کی بجائے اکابر کو، اقلیت کی بجائے اکثریت کو اور جاہل کی بجائے عالم کو اور جاہل من الفن کی بجائے اہل فن کو ترجیح حاصل ہے اور عقل سلیم بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ بر خلاف عقل قبیح کے۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ "حکایت" شمارہ نومبر میں مجاہد ادیب صاحب نے ضعیف اور موضوع احادیث پر جو کلام کیا ہے کوئی بے علم شخص تو شاید سمجھے کہ موصوف نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انہوں نے اپنی ذاتی فہم سے کام لیتے ہوئے جھک مارنے کے سوا کچھ نہیں کیا جسے ہم عنقریب بیان کریں گے۔

سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حدیث صحیح اور موضوع یہ دو کنارے ہیں اور ان کے درمیان وسیع میدان ہیں۔ مثلاً صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ، اور ضعیف بضعف قریب اس حد تک کہ صلاحیت اعتبار باقی رکھے۔ جیسے اختلاط راوی یا سوء حفظ یا تدلیس وغیرہ۔ پھر درجہ ششم میں ضعف قوی مثلاً فسق راوی لیکن ابھی بھی سرحد کذب سے جدائی حاصل ہے پھر مرتبہ مطروح جس کا مدار وضاع کذاب یا متہم بالکذب پر ہے ہیں ان سب کے بعد درجہ موضوع ہے۔ لہٰذا جب صحیح اور موضوع کے درمیان اتنی منزلیں ہیں تو کسی حدیث غیر صحیح کو جھٹ پٹ موضوع قرار دینا زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے جو کہ اصطلاح محدثین کے بالکل منافی ہے لیکن مجاہد صاحب تو موضوع، من گھڑت اور بے اصل کا حکم لگانے سے قلم پر راضی نہیں بر بنائے کثیر احادیث مبارکہ جو درجہ حسن بلکہ درجہ صحیح لغیرہ بلکہ صحیح لذاتہ بلکہ متفق علیہ روایات تک کو غلط اور من گھڑت کہہ گئے۔

جس طرح نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جھوٹ جان بوجھ کر گھڑنا جہنم میں داخلے کا سبب ہے وہاں حدیث رسول کو جھوٹ قرار دینا بھی جہنم میں داخلے کا سبب ہے۔ اگر ہر حدیث غیر صحیح کو من گھڑت کہنا یا ضعیف کہنا اتنا آسان ہوتا تو محدثین کرام مذکورہ بالا اصطلاحات کے ذریعے امتیاز کیوں رکھتے اور غیر صحیح جبکہ ضعیف نہ ہو، احکام میں حجت کیوں جانتے اور ضعیف کی صورت میں فضائل میں معتبر کیوں جانتے۔

امام بدرالدین زرکشی کتاب نکت علی ابن صلاح، امام جلال الدین سیوطی لآلی مصنوعہ پھر علامہ طاہر فتنی خاتم مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں۔ "ہم محدثین کا کسی حدیث کو کہنا کہ یہ صحیح نہیں اور موضوع کہنا ان دونوں میں بڑا فرق ہے کہ موضوع کہنا تو اسے کذب و افترا ٹھہرانا ہے اور غیر صحیح کہنے سے نفی حدیث لازم نہیں بلکہ اگر کچھ حاصل تو سلب ثبوت ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق

ہے۔ اور امام ابن حجر عسقلانی "القول المسدد فی الذب عن مسند احمد" میں فرماتے ہیں۔ "حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا"۔

لیکن مجاہد صاحب آپ نے رجب، شعبان اور رمضان والی روایت کو عند امام رجب ضعیف گن دیا۔ بفرض غلط اگر یہ امام رجب کے نزدیک ضعیف بھی ہو تو فضائل میں تو باجماع محدثین ضعیف حدیث لائق اعتبار ہوتی ہے جیسا کہ امام ابوزکریا نووی "اربعین" امام ابن حجر مکی "شرح مشکوٰۃ" مولانا علی قاری "مرقاۃ" و حرز ثمین شرح حصن حصین میں فرماتے ہیں۔ "بے شک حفاظ حدیث و علمائے دین کا اتفاق ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے"۔ اور اگر آپ کے بقول عند امام رجب ضعیف بھی ہو تو ایک سند سے ضعیف ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کسی دوسری سند سے بھی ضعیف ہے اور دوسری سند سے بھی ضعیف ہو تو دو ضعیف مل کر حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں جو کہ احکام میں بھی لائق اعتبار ہیں۔ اپنی اسی بات کی تائید میں "حدیث مسواک" پیش خدمت ہے۔

"مسواک کے ساتھ نماز بے مسواک کی ستر نمازوں سے بہتر ہے"۔ ابو نعیم نے کتاب السواک میں دو جید و صحیح سندوں سے امام حمیدی نے اسے صحیح کہا، اور امام حاکم نے صحیح مستدرک بشرط مسلم پر صحیح کہا۔

امام احمد بن حنبل و ابن خزیمہ و حارث بن ابی اسامہ و ابو یعلیٰ و ابن عدی و بزار و حاکم و بیہقی و ابو نعیم وغیرہم اجلہ محدثین نے بطریق عدیدہ و اسانید متنوعہ احادیث ام المومنین صدیقہ و عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن عمر و جابر بن عبداللہ و انس بن مالک و ام الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تخریج کی۔ تو آپ کو اتنے اکابر صحابہ اور ہمہ اسناد نظر نہ آئیں اور ابن معین کا باطل کہنا نظر آ گیا حالانکہ مقاصد حسنہ میں علامہ شمس الدین سخاوی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ "امام ابن معین کا یہ کہنا کہ یہ حدیث باطل ہے اس سند کی نسبت ہے جو انہیں پہنچی"۔ ظالمی دیانت کا خون اسے ہی کہتے ہیں۔

حدیث باطل کے ساتھ بھی آپ نے یہی سلوک کیا۔ یہ سوچے بغیر کہ سیدہ زینب نصف النہار کے وقت حضور کے سایہ کا ذکر کر رہی ہیں اور نصف النہار کے وقت کبھی بھی جھکے ہوئے سائے کا وجود نہیں ہوتا کہ کسی آنے والے کے جسم سے پہلے اس کا سایہ نظر آ جائے بلکہ درست ترجمہ یہ ہے کہ "میں ایک دن دوپہر کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ ناگہاں میں نے نبی پاک کی ذات مقدسہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا"۔

لغت کی مشہور کتاب "القاموس المحیط" میں ظل کا معنی فئی (سایہ) ہے ظل صبح تو ہوتا ہے شام تو ظل کا معنی عزت، قوت، غلبہ، شخص، بدن اور کسی شے کے پردے یا لباس کو بھی ظل کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح زرقانی شریف، مدارج النبوۃ، تفسیر عزیزی، امام ابن حجر کی "افضل القریٰ" امام مجدد الف ثانی مکتوبات شریف میں، علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض میں، امام جلال الدین سیوطی خصائص کبریٰ میں صاحب سیرت حلبیہ اور دیگر اکابر امت نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ کی نفی کی ہے جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ مبارکہ ہے۔ حیرت ہے کہ آپ کو تو ظل نظر آیا مگر نقلی و عقلی و لغوی دلائل کے پہاڑ نظر نہ آئے اور وہ بھی اکابر امت جن کے ناموں کو آپ نے اپنی مطلب براری میں استعمال کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے یا شاید آپ "ظل" کا مفہوم سمجھ نہ پائے۔

حدیث معراج کہ جس میں ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "معراج کی رات میں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مفقود نہیں پایا"۔ اس کو موضوع کس نے کہا ہے اور کس بنا پر کہا ہے۔ کیا آپ نہیں

جانتے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسمانی معراج کے علاوہ کثیر تعداد میں روحانی معراج بھی ہوئی ہیں مذکورہ روایت روحانی معراج پر دلالت کرتی ہے جو کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان و عظمت پر دال ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ ہر وہ حدیث جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتوں پر دلالت کرتی ہے اور اکابرین امت کی کثرت نے ان کو قبول بھی کیا آپ قلم زد کرنے کے چکر میں دل کی کون سی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں؟

اسی طرح آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جانوروں سے کلام کرنا اور جانوروں کا آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونا کثیر روایت سے ثابت ہے جس کو خصائص کبریٰ میں امام سیوطی نے نقل کیا منجملہ ان میں حضرت معاذ بن جبل اور ابن منظور سے وہ روایت بھی ہے جس کا آپ حسب سابق انکار کر چکے ہیں یعنی ''گدھے کا اپنے آپ کو سواری کے لئے بارگاہ رسالت مآب میں پیش کرنا اور فراق رسول میں اپنی جان دے دینا تو امام ابن حجر کے بقول آپ کے بے اصل فرمانا امام سیوطی کے ذکر کرنے کو کوئی ترجیح نہیں دیتا۔

دیکھیں ملا علی قاری علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔ ''ابن جوزی نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے اس مذکورہ سند کے اعتبار سے ان کے نزدیک موضوع ہو''۔ (شرح حصن حصین) نیز موضوعات کبیر میں ہے ''ممکن ہے یہ ایک سند کے اعتبار سے موضوع ہو اور دوسری سند کے اعتبار سے صحیح ہو''۔

حتیٰ کہ متفق علیہ روایت پر بھی جہالت کے تیر چلا دیتے اور عقلی دلیل یہ دی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی حکم دیں اور حضرت عمر منع کر دیں۔ یعنی جناب کا خیال ہے کہ اگر کوئی بات نہ مانی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہ ماننے والا نافرمان ہے اور حضرت عمر نافرمان نہیں۔ نتیجتاً مفسر روایت پر نکاذ اور اسے لائق اعتبار نہ جانا۔ سبحان اللہ! اسی تحقیق پر ناز کرتے ہوئے فن حدیث پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ اپنے والد صاحب کی آمد پر کھڑے ہو جائیں۔ آپ کے والد صاحب کہیں کہ بیٹھو بیٹھو مگر آپ ان کے بیٹھنے تک نہ بیٹھیں تو آپ کے کلیے کے مطابق یہ نافرمانی میں شمار ہوگا جبکہ عقل سلیم اسے ادب گردانتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ پر ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ لکھے گئے۔ کفار نے اعتراض کیا کہ ہم اس حیثیت سے آپ کو فریق نہ مانیں گے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی سے فرمایا علی یہ لفظ رسول اللہ کاٹ دو۔ حضرت علی نے ادباً ایسے کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود یہ لفظ کاٹ دیا تو جناب اس روایت کو بھی قلم زد کر دیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ نافرمانی کریں۔ ایسے ہی نتائج نکال کر دین متین پر ہاتھ کی صفائی دکھائیں گے تو حدیث تو حدیث قرآنی آیات پر بھی معاذ اللہ قلم پھیرنا پڑ جائے گا۔

مثال کے طور پر قرآن پاک میں اللہ پاک نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا۔ "وما تلک بیمینک یموسیٰ" (اے موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' اب مجاہد صاحب کے خود ساختہ اصول کے مطابق تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اول و آخر کا جاننے والا رب ذوالجلال اپنے بندے سے کوئی بات پوچھے۔ اس سے تو آپ کے نزدیک جہل لازم آئے گا جو کہ اللہ پاک کے لئے جائز نہیں لہٰذا ہمت کر کے کہہ دیجئے کہ معاذ اللہ یہ آیت بھی صحیح نہیں۔ بھلے مانس جس طرح پوچھنا کبھی امتحاناً ہوتا ہے جیسے استاد کا شاگرد سے پوچھنا اور کبھی مکالمہ کے ذریعے تیسری ذات تک بات پہنچانا مقصود ہوتا ہے اور کبھی مقابل کے مقام عظمت کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے علیٰ ہذا القیاس۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا یہ کہنا کہ ''ہمیں

کتاب اللہ کافی ہے"۔ مقصد یہ تھا کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام آپ بیمار ہیں، زحمت نہ فرمائیں آپ نے ہمیں تکمیل دین سے مشرف کر دیا ہے اس حال میں اپنے آپ کو تکلیف نہ دیں۔ وگرنہ جو اعتراض مجاہد صاحب 1400 سال بعد کر رہے ہیں وہی اعتراض حضرت عمر فاروقؓ سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیوں نہیں کیا کہ عمر! تم نے میری بات نہیں مانی میں تم سے ناراض ہوں اور یہ اعتراض تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی جائے گا کہ آپ نے وہ بات اگر واقعتاً ضروری تھی تو چار دن بعد تک بھی کیوں نہیں فرمائی۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت عمر فاروقؓ کی بات سے مطمئن تھے لیکن آپ مجاہد صاحب ابھی تک غیر مطمئن کیوں ہیں؟ "حکایت" کے صفحات اجازت نہیں دیتے وگرنہ یہ موضوع طویل کلام کا تقاضا کرتا ہے اور کثیر روایات پر محاسبہ ابھی ضروری ہے لیکن ان چند جملوں کو قارئین، سوائے خبر ایک موضوع روایت کے، باقی روایات پر قیاس کر لیں کہ مجاہد صاحب نے اس میں بھی غلط اپنی آنکھ کو خواہ مخواہ زحمت دی ہے۔

اب آخر پہ گفتگو کو سمیٹتے ہوئے گزارش کروں گا کہ وہ روایت کہ جس میں شان فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا چمکتے سورج کی طرح عیاں ہے اس کی سند کی جرح سے قطع نظر، مجاہد صاحب نے جو غضبناک اور نچلے قسم کا تبصرہ کیا ہے سچ پوچھئے تو پہلے پہل اسی بدمزہ ریمارکس نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ لکھتے ہیں "کہ قیامت کے دن ایک منادی پردے کے پیچھے سے آواز دے گا کہ اہل محشر اپنی نگاہیں پست کر لو تاکہ فاطمہ بنت محمد گزر جائیں"۔ موضوع ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دیگر بنات اور ازواج کو بے شک لوگ دیکھتے رہیں کوئی حرج نہیں۔ مجاہد صاحب! اس طرح کے لغو مطلب سوائے شیطان کے اور کون نکال سکتا ہے۔ ورنہ بالفرض یہ موضوع بھی ہو تو کیا وجہ تصنیف میں امام نے "آپ کا بیان کردہ مطلب" بیان کیا ہے۔ اب 1400 سال میں ایسے مطلب کسی نے نہیں نکالے تو آپ کون ہوتے ہیں "مطلب مطلب" کی رٹ لگانے والے۔

موصوف کا زعم فاسد ہے کہ اگر کسی ہستی کی انفرادی فضیلت بیان کی گئی ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ دوسرے اس سے محروم ہیں۔ تو موصوف کے اس خود ساختہ قاعدے سے لازم آئے گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صدیق نہ کہا جائے کیونکہ بقول مجاہد صاحب کے مطلب یہ ہوگا کہ باقی صحابہ کرام معاذ اللہ جھوٹ بولتے ہیں اور حضرت عثمان غنیؓ کو غنی نہ کہا جائے۔ مطلب ہوگا کہ باقی صحابہ بخیل ہیں۔ حضرت علیؓ کو اسد اللہ نہ کہا جائے مطلب ہوگا کہ باقی صحابہ بزدل ہیں اور عشرہ مبشرہ کو جنتی نہ کہا جائے ورنہ مطلب ہوگا کہ باقی صحابہ معاذ اللہ جہنمی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کیوں مجاہد صاحب! ایسا ہی ہے نا؟ اگر آپ کے نزدیک نہیں ہے تو خلفائے راشدین کی امتیازی فضیلتیں جو ہیں ان سے باقیوں کا انکار لازم نہیں آتا تو سیدہ زہراؓ کے لئے یہ امتیازی فضیلت ماننے پر کیا عذر لاحق ہے، جناب کو؟ اور اس سے دیگر مقدس و مطہر ذی شان ہستیوں کی بے پردگی کیسے لازم آئی۔ باقی یہ کہ موضوع ہو تو کم از کم بیان کیا ہوتا پھر ہم اس پر مزید کلام کرتے۔ آپ نے فقط موضوع کا نام ہی سنا ہے۔ باقی چند ایک روایات ضرور موضوع ہیں جن کا ائمہ امت میں متفقہ طور پر کوئی بھی قائل نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناقابل اعتبار کے ساتھ لائق اعتبار کو بھی قلم زد کر دیا جائے۔ ہماری التجا ہے کہ حدیث رسولؐ کے معاملے میں انا کو قربان کرتے ہوئے اکابرین امت کو مشعل راہ بنائیے اور اللہ و رسولؐ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے وگرنہ یوم حساب تو قریب ہی ہے پھر بندہ چاہے گا بھی تو یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا۔

٭٭٭

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازما لکھیں

دستِ شفاء

انتڑیوں کا السر اور سوزش معدہ

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی ۔ ایچ ۔ ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب و نفسیات

سب سے پہلے تو میں اپنے معزز قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح شدت کے ساتھ وہ میرے مضامین اور کیسوں کا انتظار کرتے ہیں اور جس طرح انہوں نے پذیرائی دی وہ بہت ہی قابل تعریف ہے اور جو شخص بھی بطور مریض ہمارے پاس آتا ہے ہم اسے مریض سے زیادہ اپنا فیملی ممبر سمجھتے ہیں اور اسی طریقے سے برتاؤ کرتے ہیں اور یہاں آ کر سب لوگوں کو ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح نہ ہی ہم دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں بلکہ اپنے ہی محدود وسائل کے اندر رہ کر حسب توفیق خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ ہم اس کام کو مزید بڑھانا چاہتے ہیں جس کے لئے ہمیں آپ کی طرف سے اخلاقی مدد اور گائیڈ لائن چاہئے۔

(1) آپ کو بھی دوسرے شہروں کے مریضوں کی مشکلات کا اندازہ ہے اور ہر بندے کا لاہور آنا محال ہے جو اصحاب دیگر شہروں میں کسی کم خرچ یا بلا کرایہ (یا کم کرائے والی جگہ) کا بتا سکیں ان کی مہربانی ہوگی۔ فی الحال اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، فیصل آباد، شیخوپورہ میں شروع کریں گے بعد میں دیگر شہر بھی شامل ہوں گے۔ اگر کوئی ڈاکٹر صاحبان یا حکیم صاحبان جن کا کلینک ہو وہ بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

(2) اگر کسی صاحب کے ذہن میں کوئی اچھا پلان ہو تو وہ بھی مجھے "حکایت" کے ایڈریس پر لکھ کر ارسال فرمائیں۔

(3) اگر کسی صاحب کے پاس کوئی آزمودہ کار نسخہ ہو تو وہ بھی بھیج سکتا ہے ہم (آزمائش کے بعد) اس کو اپنی

کے نام سے رسالے میں شائع کریں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم بے حد ذہین اور لائق ہے مگر افسوس ان کی قابلیتوں کا کوئی اعتراف نہیں کرتا۔

{4} ہم یہ چاہتے ہیں کہ قابل ڈاکٹروں و حکیموں کے آزمودہ نسخہ جات اور میرے اپنے سب کو ملا کر اکٹھا شائع کر دیں۔ جو اصحاب شرکت کرنا چاہیں وہ مجھے ان فون نمبرز 0312-6625066، 0321-7612717 پر بتا سکتے ہیں۔

{5} میں اپنے قارئین اور ملنے والوں سے ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھے فون کرنا ہو تو (صبح 12 بجے سے 2 بجے) یا رات (7 سے 9 تک) کر سکتے ہیں۔ مگر پہلے اپنا تعارف بتا کر بات شروع کیا کریں اور صرف ضروری باتوں کے لئے رابطہ کریں فضول اور بے کار باتوں یا MSG سے پرہیز کریں اور آنے سے ایک دن قبل ٹائم ضرور لے کر آئیں۔ شکریہ!

اس بار کا کیس ہارون آباد ضلع بہاولنگر کے ایک محترم سکول ٹیچر کا ہے ان کا کیس نمبر P-1146 عمر 37 سال اور غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کا مین پرابلم معدہ کا تھا۔ پیٹ میں مروڑ، پیچش، جیسی نمو اور جھاگ دار مادہ کا اخراج، درد معدہ اس کے علاوہ سر درد، بی پی، کھانسی، دل کی دھڑکن کا تیز ہونا، سینے کے درمیان گھٹن، معدہ میں کھانے کے بعد جلن۔ جب وہ میرے پاس علاج کے لئے آئے تو بہت ہی مایوس اور پریشان تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مذکورہ مسائل تقریباً چودہ پندرہ سال سے جاری ہیں۔ ہر قسم کے جوشاندے، خمیرے، رنگ برنگی گولیاں اور انجکشن لگوا لگوا کر اور خرچے کر کے اب میں تمام ڈاکٹروں، حکیموں اور ہومیو معالجوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود ایک دھیلے کا بھی آرام نہیں۔ ہر وقت کی ٹینشن اور خرچے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ دنیا میں اس مسئلے کا کوئی حل ہی

عظیم لوگوں کی عظیم باتیں

- جو لوگ خود غرض ہوتے ہیں وہ کبھی اچھے دوست نہیں ہوتے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- مخلص دوست کے اندر پیار چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔ (حضرت عمرؓ)
- محبت سب سے کرو مگر اعتبار چند لوگوں پر۔ (حضرت عثمانؓ)
- اچھے لوگوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں یاد رکھنا نہیں پڑتا وہ یاد رہ جاتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

موجود نہیں۔ اتنے اتنے تجربہ کار معالجوں سے دوائیاں کھا چکا ہوں۔ کیا یہاں میرا علاج ہو جائے گا؟"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "بے شک، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کوئی مرض لا علاج نہیں سوائے موت کے لہٰذا ہم آپ کا بھی پوری توجہ سے علاج کریں گے اور اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں"۔

اس کے بعد انہوں نے کچھ اور بھی مسائل بتائے جن کے مطابق:

1- پریشانی، خوف، ڈر اکثر رہتا ہے اور یادداشت بہت کمزور ہے۔

2- پیشاب رک رک کر آتا ہے اور جلن دار ہے۔

3- شادی کو دل نہیں کرتا۔

4- کمزوری، تھکاوٹ، گرمی اور سردی دونوں زیادہ لگتی ہے۔

5- کبھی کبھی چکر آتے ہیں۔

ہوٹل کا کھانا، کچا پیاز، امرود، سیب، سموسے

ہو رہے، جانے رہی سے رمنی سے اور چڑھائی سے گھبرتی ہے۔

ان کی پیشاب کی رپورٹ چیک کی گئی جس کے مطابق رزلٹ اس طرح تھے۔

PH 6.0
Protien +
Pus Cells 3-5
EPT Cells 2-3

مزید یہ معلوم ہوا کہ مریض کی کمر اور گردن میں بھی درد رہتا ہے۔ ایک بار گلا (زکام) بگڑ گیا جس کو ان نے تیز کرایا تو سر درد شروع ہو گیا جو کہ ابھی بھی قائم ہے۔

اس کے بعد مریض نے کئی ادویات استعمال کیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ انہوں نے کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا اس کے علاوہ بھی دو چند سی کی لکھ کر لائے تھے جو کہ انہی کے الفاظ میں درج کر رہا ہوں۔

گلے کے اندر درد، گلا بیٹھ جانا اور درد، گلے کی خراش، ستمبر سے لے کر ساری سردیاں ناک کے اندر خارش، زکام ہر وقت، جب تک مخصوص اینٹی بائیوٹک استعمال نہ کروں آرام نہیں آتا۔ اینٹی بائیوٹک اور انجکشن کے استعمال سے سر درد اور گردن کے پٹھوں میں درد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ سر درد شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بخار بھی ہو جاتا ہے۔ کمزوری بے انتہا ہو جاتی ہے اور چال Stagring ہو جاتی ہے۔ دل کی گھبراہٹ اور سوتے وقت دل پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں بڑا پریشان ہو جاتا ہوں۔ درد کے نکلنے سے کچھ دیر آرام رہتا ہے پھر طبیعت میں بے چینی اور پریشانی محسوس ہوتی ہے۔

مریض کو چیک کیا گیا تو واقعی اس کو "نقرس" کا بھی مسئلہ تھا اس کے علاوہ 100F بخار اور زبان پر بھی ان امراض اور ذیابیطس کا خاصا اثر نمایاں تھا۔ کئی اور بات کا

انہیں اب تک بھی پتہ نہیں رہا۔ بہرحال انہیں 15 یوم کے لئے ادویات دی گئیں اور چند پرہیز بتائے گئے۔ جب وہ 15 دن کے بعد واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے بالکل ٹھیک طرح سے بتائیں کہ کتنا آرام ہے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کم از کم 60-70 فیصد آرام ہے۔ معدے کے مسئلے میں اور یہ کہ 14 سال سے اتنا فرق نہیں پڑا جتنا ان 15 یوم میں ہوا ہے۔ وہی ادویات پھر دی گئیں اب مزید آرام آ گیا۔ اب دوسرے مسائل کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے ادویات میں تبدیلی کیا گیا اور وہ بہت مطمئن ہیں۔ الرجی اور باقی مسائل میں بھی بہت آرام ہے۔ ان شاء اللہ امید ہے کہ مزید دو تین ماہ تک ان کا کیس بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

دراصل ان صاحب کا اصل مرض امراض معدہ کا السر اور سوزش معدہ + الرجی تھا۔ جب تک ان امراض کا علاج نہیں ہو جاتا وہ ٹھیک نہیں ہو سکتے تھے۔ جب میں نے ٹھیک طرح ان کے مرض کو Diagnose کر لیا تو پھر علاج کی ایک لائن متعین ہو گئی اور علاج آسان ہو گیا۔ اگر کسی کو کسی بات میں شک ہو تو پہلے دی گئی علامات کو دوبارہ سے پڑھے ساری بات واضح ہو جائے گی۔ باقی معالجین سے بھی گزارش ہے کہ صرف ظاہری یا آگے کی علامات کو دیکھ کر علاج کرنے کی بجائے اندرونی علامات کو بھی مدنظر رکھا کریں تاکہ مریضوں کا بھلا ہو۔

نوٹ: ان کے علاوہ دو کیس بھی تقریباً اس کیس سے ملتے جلتے زیر علاج ہیں اور رو بہ صحت ہیں۔ ان میں سے ایک پیچش Dysentery کا ہے اور دوسرا معدہ میں سوزش Chronic Chlorites اور انتڑیوں میں زخم کا ہے۔ جب وہ مطلوبہ معیار تک (60-70) فیصد پر پورے ٹھیک ہوں گے تو ان کے بارے میں بھی قارئین کرام کو مطلع کیا جائے گا۔

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی ان کہی کہانی

خطرناک تعاون

موساد کے افسروں کی ایک میٹنگ میں میکسویل کا قصہ ختم کر دینے کا فیصلہ ہو گیا۔

قسط: 10 ☆ 0300-4154083 میاں محمد ابراہیم طاہر

میکسویل، جس نے اس الزام کے تحت رابرٹ اپنے اخبار کے ایک رپورٹر کو نوکری سے نکال رہا تھا کہ اس نے اپنے اخراجات میں کچھ گڑبڑ کی تھی۔ خود اپنے اخبار کے ملازمین کے پراویڈنٹ کو خفیہ طور پر چوری کر کے موساد کی مدد کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ موساد خود ایسی بے شمار چوریوں اور خطرناک جوا بازیوں کو اپنی پالیسی کا حصہ سمجھتی تھی۔

میکسویل نے ذاتی طور پر پراویڈنٹ سے رقم باہر منتقل کرنے کے لیے فراڈ کے کئی طریقے ایجاد کر رکھے تھے اور اس نے فراڈ کے ان طریقوں کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے لاکھوں ڈالر ایک خصوصی اکاؤنٹ میں منتقل کیے تھے جو موساد نے بینک آف اسرائیل، تل ابیب میں قائم کر رکھا تھا۔ فراڈ کی ایک بڑی رقم اسرائیلی سفارت خانہ لندن کے اکاؤنٹ جو بارکلے بینک میں تھا، ٹرانسفر کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جینوا کا کریڈٹ سوئز بینک، یہ وہی بینک ہے جس کے ذریعے ملن منانے کے میکسویل کے ایما پر اور تعاون سے "ایور" کے پرافٹ کے 450 ملین ڈالر باہر بھجوائے گئے تھے۔ کبھی کبھی ملازمین کے پنشن فنڈ سے نکالی گئی رقم دنیا کے مختلف ملکوں اور بینکوں سے ہوتی ہوئی نیویارک کے کیمیکل بینک، فرسٹ نیشنل بینک، آسٹریلیا اور ہانگ کانگ اور ٹوکیو (جاپان) کے بینکوں تک پہنچی۔ صرف میکسویل کو علم تھا کہ چوری کا یہ پیسہ کسی مقررہ وقت پر کس جگہ موجود تھا۔ جس چیز نے معاملات کو بہت زیادہ الجھا دیا اور خراب کیا وہ اس کا اپنے اخبارات کو بار بار "وائٹ کالر کرائم" کے خلاف مہم چلانے کا حکم تھا۔

وکٹر اوسٹروسکی (Victor Ostrovsky) جو آسٹریلیا میں پیدا ہوا تھا اور اب اسرائیل میں تھا اور جس نے موساد میں بطور کیس آفیسر 1984ء سے 1986ء تک خدمات انجام دی تھیں، وہ پہلا شخص تھا جس نے سراغ لگایا تھا کہ خفیہ تنظیم کے اندرون خانہ کیا کیا گپ ہو رہے تھے۔

موساد یورپ میں اپنے کئی خفیہ آپریشن کے لیے میکسویل کی اپنے ملازمین کے پنشن فنڈ سے چرائی گئی رقم سے روپیہ فراہم کیا کرتی تھی۔ پنشن فنڈ پر ان کی نظر اس وقت پڑی تھی جب رابرٹ میکسویل نے موساد کی ادھار دی ہوئی رقم سے "مرر" گروپ کے اخبارات خریدے تھے اور اسرائیل کے مالیاتی ماہرین اور تجزیہ کاروں نے اپنی مشاورتی خدمات پیش کی تھیں۔ فنڈ کی چوری کے علاوہ سب سے منحوس بات یہ تھی کہ اس کے اخبارات کے گروپ کو جو بھی بندہ ڈاؤننگ اسٹریٹ کی طرف سفر کرتا تھا اور جہاں کہیں بھی جاتا تھا اُسے اسرائیل کا خفیہ ایجنٹ اور کارندہ سمجھا جاتا تھا اور ایک معمولی افواہ پر ان کی گردن جلاد کے پھندے تک پہنچ سکتی تھی۔

میکسویل جب بھی اسرائیل جاتا تھا اس سے کسی سربراہ مملکت جیسا برتاؤ اور حسن سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ وہ بحیثیت حکومتی مہمان خصوصی کا درجہ پاتا تھا اور اسے اعلیٰ اور نفیس ترین جگہ پر ٹھہرایا جاتا تھا۔ حکومتی اور سیاسی حلقوں میں میکسویل کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے موساد نے اس کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کر لیا تھا اور اچانک اس پر اپنے انعام و اکرام کی بارش سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ موساد نے یہ معلوم ہونے پر کہ میکسویل عیاشی اور رنگین بازی کا بہت دلدادہ ہے اس کی خواب گاہ میں خفیہ ویڈیو کیمرے نصب کرا دیئے اور اس کے علاوہ اسی دوران موساد نے اپنی تنخواہ دار اور تربیت یافتہ طوائفوں کے اصطبل سے خدمات مہیا کر کے سراغ کر رہی اور اس کی تمام حرکات و سکنات ویڈیو پر ریکارڈ کر کے آئندہ اسے بلیک میل کرنے کا بندوبست کر لیا۔

چونکہ رابرٹ میکسویل اکثر عیاشی کے ...

اسے آتا جاتا رہتا تھا لہٰذا کچھ ہی عرصے میں اُن کی خوابگاہ کی سرگرمیوں پر مشتمل ویڈیو ٹیپوں کی موساد کے پاس اچھی خاصی لائبریری تیار ہوگئی۔

اوسٹروسکی نے اپنے الزامات اور انکشافات کا دعویٰ اپنی دو کتابوں میں کیا تھا جنہوں نے ابھی تک اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی کو مشتعل رکھا ہے۔ کتابوں کے نام تھے ''فریب کاری کے طریقے'' اور ''دھوکہ دہی کے مزید طریقے''۔ ان کتابوں میں مصنف نے موساد کے پردے کے پیچھے کیے جانے والے مکر و فریب، دھوکہ دہی اور جاسوسی کے طریقوں کا برسر عام بھانڈا پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس نے کئی آپریشنوں کی مکمل تفصیل مع افسروں کے ناموں کے منکشف کر دی تھی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ موساد میں خدمات انجام دینے کے دوران نہ صرف اس سے بدترین سلوک روا رکھا گیا بلکہ ذلت آمیز طریقے سے نوکری سے ڈس مس کیا گیا تھا۔

اسرائیلی حکومت نے میکسویل کا یہ مشورہ محض طنز و مزاح قرار دے کر نظرانداز کر دیا تھا کہ اوسٹروسکی کے بیانات کے بارے سرکاری رد عمل کا اظہار نہ کیا جائے۔ تل ابیب میں وزیراعظم یزہاک شامیر کے ساتھ اپنی میٹنگ میں اخباری دنیا کے نواب نے مارگریٹ تھیچر کے دور کی مثال دی تھی جب کہ برطانوی حکومت نے M15 کے ایک سابق ایجنٹ پیٹر رائٹ کے برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی کے بارے میں ایسے ہی انکشافات پر مشتمل کتاب کی اشاعت رکوانے کی کوشش کی تھی۔ کتاب ''سپائی کیچر'' (Spycathor) (جاسوسوں کے شکاری) نے برطانوی خفیہ ایجنسیوں میں بھی ایسا ہی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ کتاب کے آسٹریلوی پبلشر نے برطانوی حکومت کو عدالت میں گھسیٹ لیا تھا۔ مقدمہ بازی کے دوران کتاب اور مصنف کی دنیا کے پریس میں اتنی پبلسٹی ہوگئی کہ مقدمہ ہار کر برطانوی حکومت سوائے شرمندگی کے کچھ نہ حاصل کر سکی اور کتاب ''سپائی کیچر'' دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بن گئی تھی۔

اسرائیلی حکومت کی قسمت میں بھی برطانوی حکومت جیسی بدنامی اور شرمندگی لکھی تھی۔ موساد کے حاضر سروس اور سابقہ افسران و اہلکار حکومت پر اوسٹروسکی کے خلاف ایکشن کے لئے دباؤ ڈال رہے تھے۔ ان میں پیٹر امیت، ایسر ہیرل، خصوصی طور پر سرگرم عمل تھے۔ لہٰذا شامیر (وزیراعظم) نے اپنے اٹارنی جنرل کو حکم دے دیا کہ موساد کے سابق ایجنٹ کی پہلی کتاب کی اشاعت رکوائی جائے۔

اس زور کے پیچھے شامیر کی امریکہ کے خلاف دیرینہ نفرت بھی شامل تھی کیونکہ اُسے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ جرمنی میں یہودیوں کی ہلاکت (ہالوکاسٹ) کے پیچھے امریکہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر امریکی صدر روزویلٹ ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ مڈل ایسٹ میں طاقت کا توازن جرمنی کی بجائے برطانیہ کے حق میں کر دیتا جو پہلے ہی وہاں کافی اثر و رسوخ رکھتا تھا، اس کے بدلے میں ہٹلر پر دباؤ ڈال کر جرمن یہودیوں کو فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دلوا سکتا تھا اور اس طرح ''ہالوکاسٹ'' کی بھی نوبت ہی نہ آتی۔

امریکہ کے خلاف شامیر کی بے معنی سوچ اور خیالات نفرت کی حدوں کو چھو رہے تھے۔ اس نے اظہار خیر سگالی کے طور پر امریکہ سے چرائی گئی پانچ ہزار صفحات پر مشتمل خفیہ دستاویزات روس کے حوالے کر دی تھیں جس سے اس کے خیال میں ماسکو سے تعلق بہتر بنانے میں مدد مل سکتی تھی۔ ان دستاویزات میں روس کے دفاعی نظام کی جاسوسی پر مشتمل کاغذات اور سی آئی اے کی طرف سے روس کی جنگی صلاحیت بارے سالانہ تجزیہ بھی شامل تھا۔ ایک دستاویز میں خلائی تصویریں، پیغامات کے ترجمے،

را اور سسٹم کی جاسوسی اور روس کے اندر موجودگی اُنی اے کے جاسوسوں کی رپورٹیں بھی شامل تھیں۔ جب موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی نے وزیراعظم کو بتایا کہ ان دستاویزات کی مدد سے روس یقیناً اپنے ملک کے اندر موجود امریکی جاسوسوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو شامیر صرف کندھے اچکا کر رہ گیا۔

میکسویل کے ساتھ اپنی میٹنگ میں شامیر نے اُسے بتایا جیسا کہ وہ دوسروں کو بھی اکثر بتاتا رہتا تھا کہ وہ دنیا سے امریکی اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لئے آخری حد تک جانے کو تیار ہے۔ اس کو پکا یقین تھا کہ واشنگٹن نے اوسٹروسکی کی کتاب کی اشاعت کے لئے حوصلہ افزائی کی ہے تاکہ وہ اپنی نوکری سے برخاستگی کا انتقام لے سکے۔

شامیر نے میکسویل سے کہا کہ وہ اوسٹروسکی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اپنے مضبوط ذرائع ابلاغ کا استعمال کرے۔ میکسویل نے اشارۃً اُسے بتایا کہ موساد نے اسے نوکری دینے سے قبل یقینی طور پر اُس کا پس منظر چیک کیا ہوگا۔

تاہم اوسٹروسکی، میکسویل کے طاقتور میڈیا کے نشانے پر آ گیا۔ اس میں کل اسبب کا ایک چیتھڑا اخبار "معریب" بھی شامل تھا جسے میکسویل نے خرید لیا تھا۔ اس کے اخبارات و جرائد میں اُسے مخبوط الحواس جنونی دروغ گو اور اسرائیل کا دشمن قرار دیا گیا۔

اسرائیلی انٹیلی جنس کیونٹی کے جن اعلیٰ افسروں نے اوسٹروسکی کی کتاب کا مطالعہ کیا انہوں نے تاثر دیا کہ مصنف نے جن چیزوں کا کتاب میں دعویٰ کیا ہے وہ بڑی حد تک درست ہے۔

نیو یارک کی عدالت نے اسرائیل کے اس موقف کو رد کر دیا کہ کتاب میں کئے گئے رازوں کے افشاء سے اسرائیل کی سلامتی کو خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ وہ

نامعلوم مصنف جسے دنیا میں کوئی نہیں جانتا تھا، میکسویل کے اخبارات کے منفی پروپیگنڈے سے دنیا بھر میں مشہور اور اس کی کتاب بیسٹ سیلر بن گئی۔

جس شخص نے میکسویل کے موساد کے ساتھ خفیہ تعلق کو منکشف کیا وہ اوسٹروسکی تھا لیکن اس نے بھی پوری کہانی بیان نہیں کی۔ اس کا شامیر کے پرانے دوست اور رفیق کار رافی ایتان سے پرانا تعلق تھا۔

دونوں آدمی ایک دوسرے کو 1950ء سے جانتے تھے اور وہ موساد میں شامل ہو کر سمیر اوادوے اور ڈیمی کے ساتھ دنیا کے نقشے پر اسرائیل کے قیام کے لئے مصروف عمل تھے۔

1986ء میں یہ شامیر تھا جس نے رافی ایتان کا اس وقت ساتھ دیا تھا جبکہ اُسے بے رحم تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور پولارڈ افیئرز کے سلسلے میں صرف اُسے ہی ذمہ دار ٹھہرا کر کہا جا رہا تھا کہ وہ ایسے انٹیلی جنس افسروں کا گروپ لیڈر ہے جو کسی اختیار اور اجازت کے بغیر ہی من مانی کارروائیاں کرتے ہیں۔

دروغ گوئی کی یہ کوشش اسرائیلی حکومت کی اس چشم پوشی کا حصہ تھی جس کا مقصد اپنے آپ کو جاسوسی کے اس تمام عمل سے بری الذمہ قرار دینا تھا۔ حالانکہ جس سے انٹیلی جنس کیمونٹی کو بے پناہ فائدہ پہنچا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سوویت یونین اور ساؤتھ افریقہ نے بھی بے پناہ فائدہ اٹھایا تھا اسرائیلی حکومت کی مرضی و منشاء سے دونوں ملکوں نے امریکہ کی ان کے خلاف جاسوسی کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کی تھی۔

تاہم رافی ایتان کے ایران کو اسلحہ کے فروخت کے سکینڈل میں ملوث ہونے کے انکشاف سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس بات سے وہ مزید دل شکستہ اور مایوس ہوا کہ اس کے اپنے ساتھیوں نے سارا الزام اکیلے کے سر پر ڈالنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا لیکن اس کہنہ مشق

جاسوس نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور عام پبلک میں خاموشی اختیار کئے رکھی۔ اس کے دو سب با اعتماد دوست جو کسی زمانے میں اس کی بیٹھک میں بیٹھ کر اس کی جاسوسی کی کہانیاں اور اوڈولف آئسمین کو پکڑ کر اسرائیل لانے کا قصہ سنا کرتے تھے، یکدم منظر سے غائب ہو گئے۔ اسرائیل کس طرح اپنے اوپر خود حملہ آور ہو رہا تھا۔

سائیکے سٹریٹ میں واقع ایتان کے گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی کو بجانے کے لئے بہت ہی کم لوگ آتے تھے یا کاٹھ کباڑ سے بنائی ہوئی اس کی نئی نئی ایجادات کی تعریف کرنے کو موجود ہوتے تھے۔ وہ گھنٹوں اپنی چھوٹی سی لوہا پگھلانے کی بھٹی کے سامنے اکیلا اور تنہا کھڑا اپنے دماغ میں آنے والی مختلف چیزیں بناتا، یا ویلڈنگ ٹارچ سے تاکتے رہتا یا دھونکنی سے بھٹی میں آگ دہکاتا نظر آتا تھا۔ اس کے ہم سفر وفیت نے اس کے دماغ میں اپنے ساتھ آمد و "غیر حسن سلوک" پر کڑھنے اور دل جلانے کا وقت ہی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اب کوئی ایسی نئی چیز ایجاد کرنے یا کارنامہ انجام دینے کی تگ و دو میں مصروف تھا جس سے وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر کے کھیل میں شامل ہو سکے اور اپنے لئے چند روپیہ پیسہ بھی اکٹھا کر سکے۔ اس پر جس قدر بھی کیچڑ اچھالا گیا تھا، بہتیں اور الزامات لگائے گئے تھے اس کا فیصلہ تھا کہ اپنے ملک اسرائیل کی خدمت کرتا رہے گا۔

"حب الوطنی صرف ایک خوبصورت لفظ نہیں ہے، میں محب وطن ہوں اور اپنے ملک کی خدمت کو جزو ایمان سمجھتا ہوں۔ صحیح یا غلط، میں ہر اس شخص کے خلاف لڑوں گا جو میرے ملک یا اس کے باشندوں کے لئے خطرے کا باعث بنے گا۔"

ایران گیٹ میں ملوث کئے جانے کے ہنگامی دور کے دوران رفی ایتان نے اپنے مستقبل کے لئے ایک لائحہ عمل کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس کے زرخیز دماغ کے بہت سے دیگر منصوبوں کی طرح وہ اس منصوبے کے لئے بھی کسی اور کی اختراعات یا ایجادات کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آئندہ اُسے صرف نازی اوڈولف آئسمین کے شکاری کے طور پر ہی یاد نہ رکھا جائے بلکہ کسی اور ناقابل فراموش کارنامے کی وجہ سے لوگ اُسے یاد رکھیں۔ اس کی یہی خواہش اسے رابرٹ میکسویل کے قریب لے آئی اور یہ اس کا ایک قریبی ساتھی و مددگار بن گیا۔

1967ء میں الیکٹرانک ایجادات کا ماہر ولیم ہملٹن، ویتنام میں خدمات انجام دینے کے بعد تازہ تازہ امریکہ میں واپس آیا تھا۔ ویت نام میں اس نے ایسی الیکٹرانک ڈیوائسیں قائم کی تھیں جن کی مدد سے ویت کانگ گوریلوں کی نقل و حمل کو دیکھا اور بات چیت کو سنا جا سکتا تھا۔ امریکہ میں ہملٹن کو نیشنل سیکیورٹی ایجنسی میں نوکری کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے ذمہ جو پہلا کام لگایا گیا وہ ویتنامی، انگریزی، کمپیوٹرائزڈ ڈکشنری کا تھا۔ ویت کانگ گوریلوں کے پیغام کو پڑھنے، سمجھنے اور ان کے قیدیوں سے تفتیش کرنے میں اس نئے ہتھیار نے کام بہت آسان بنا دیا۔

یہ وہ دور تھا جب الیکٹرونک کمیونیکیشن، سیٹلائٹ ٹیکنالوجی اور مائکرو سرکٹ کی ایجادات کی بدولت انٹیلی جنس اور خفیہ معلومات اکٹھی کرنے میں تیز رفتار اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ کمپیوٹر سائز میں چھوٹے اور کارکردگی میں بہت بہتر ہو رہے تھے۔ ایسے پیچیدہ سنسر ایجاد ہو چکے تھے جو ہزاروں آوازوں سے کسی خاص شخص کی گفتگو کو الگ کر کے سنوا سکتے تھے۔ اسی طرح مخصوص اور مطلوبہ شخصیات کی تصویروں کی شناخت اور پہچان میں آسانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ لیکن اگر وہ جب ایجاد ہو رہی تھیں جن کی مدد سے لب سرگوشی و جھگڑا بھی دور بیٹھ کر واضح سنا جا سکتا تھا۔ ایسے تختے اور مدست منظر عام پر آ

گئے تھے جن کی مدد سے گھپ اندھیرے میں بھی صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ایسا انتظام وضع ہو چکا تھا کہ ایک تصویر کی مدد سے کسی دہشت گرد کو، خواہ وہ کوئی حلیہ اور روپ اختیار کرلے، شناخت کیا جاسکتا تھا۔

تین سال کی لگاتار ریسرچ، محنت اور کوشش کے بعد ہملٹن ایسا پروگرام تیار کرنے کے قابل ہوگیا تھا جس کی مدد سے سیٹلائٹ کے ذریعے بے شمار لوگوں کی نقل و حرکت کی پوری دنیا میں نگرانی کی جاسکتی تھی۔ جب صدر ریگن نے دہشت گردوں کو انتباہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''تم بھاگ تو سکتے ہو لیکن کہیں چھپ نہیں سکتے''۔ تو اس کا اشارہ اسی پروگرام کی طرف تھا۔ اس پروگرام کا نام ''پرامس'' (Promis) رکھا گیا تھا۔ ہملٹن نے 1981ء میں این ایس اے سے مستعفی ہوکر اپنا یہ پروگرام پیٹنٹ کروا کے اس کے جملہ حقوق ملکیت اپنے نام رجسٹرڈ کروا لئے اور ایک چھوٹی سی کمپنی خرید کر اس کے تحت کام شروع کردیا۔ کمپنی کا نام ''انسلا'' تھا۔ پروگرام کی کامیابی نے جلد ہی انسلا کو ایک منافع بخش کمپنی میں بدل دیا کیونکہ اس پروگرام کو این ایس اے، سی آئی اے، ایف بی آئی اور دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اپنی اپنی ضرورت کے تحت استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ امریکہ کے علاوہ دنیا بھر میں کسی کو اس پروگرام کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔

جس دور میں ریگن کیلیفورنیا کا گورنر تھا تو ارل براین وہاں کا سیکرٹری جیلز تھا جو فارسی زبان پر بھی عبور رکھتا تھا۔ ریگن نے اسے حکم دیا کہ وہ کیلیفورنیا کے صحت عامہ کے پروگرام کی طرح کا ایک پروگرام ایران کے لئے بھی تیار کرے (یہ وہ دور تھا جب امریکہ، اسرائیل کے ذریعے ایران کو عراق کے خلاف جنگ کے لئے ہتھیار سپلائی کررہا تھا)۔ مقصد یہ تھا کہ اس پروگرام سے ایران کے ساتھ تعلقات میں بہتری پیدا ہوگی اور علاقے میں امریکہ کا رسوخ اور اجارہ نظر آئے گا۔

جب براین تہران کے دورے پر تھا تو اس کی خبر موساد کے سربراہ رافی ایتان کو بھی ہوگئی جبکہ وہ اس وقت یرغمالیوں کے بدلے ایران کو اسلحے کی فروخت کی نگرانی کررہا تھا۔ اس نے براین کو اسرائیل آنے کی دعوت دے دی۔ دونوں میں جلد ہی قریبی تعلق و ربط پیدا ہوگیا۔ براین اپنے میزبان کے اس کارنامے سے متاثر ہوا کہ ایتان کس طرح آئشمین کو دبوچ کر اسرائیل لے کر آیا تھا اور ایتان اپنے مہمان کی اس کہانی کے سحر میں مبتلا رہ گیا جو اس نے کیلیفورنیا کی تیز رفتار ترقی اور بہتر معیار زندگی بارے اپنے میزبان کو سنائی تھی۔ براین نے ایتان کو پرامس کی ایجاد بارے بھی بتایا جس نے جاسوسی کی دنیا میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھ دی تھی۔

فلسطین کے علاقوں مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں ''انتفادہ'' کے نام سے ایک نئی انقلابی تحریک جنم لے چکی تھی اور اتنی تیزی اور سرعت سے پورے فلسطین میں پھیل گئی تھی کہ قابض اسرائیلی حکومت بھی پریشان ہوگئی تھی۔ اسرائیلی آرمی جتنے زیادہ فلسطینیوں کو گرفتار کرتی، ان پر تشدد اور مار پیٹ کرتی، ان پر گولیاں برساتی، ان کے گھروں کو جلاتی اور تباہ و برباد کرتی تھی، اتنی ہی انتفادہ کی تحریک میں شدت پیدا ہورہی تھی اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں تحریک کو زبردست پبلسٹی مل رہی تھی۔ ایک بہادر اور جرأت مند عرب نوجوان نے خود ساختہ ''گلائیڈر'' کے ذریعے لبنان کے ساتھ پیچیدہ حفاظتی رکاوٹوں کو پار کر عبور کیا اور شمالی قصبے کریات شامونا کے نواح میں لینڈ کیا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں انتہائی مسلح چھ اسرائیلیوں کو بھون جہنم واصل کردیا اور مزید سات کو شدید زخمی کردیا قبل اس کے کہ اسے شوٹ کیا جاتا۔

اس واقعے کے بعد جہاں فلسطینیوں کا جذبہ آزادی اپنی انتہا کو چھونے لگا، وہاں اسرائیلی خفیہ ادارے

اپنی ناکامی پر ایک دوسرے پر انگلیاں اٹھانے اور الزامات لگانے میں الجھ گئے۔ داخلی تحفظ کی ذمہ دار ایجنسی ''شن بیت'' آرمی کی جاسوس ایجنسی امان کو ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی اور پھر دونوں مل کر موساد کو ساری ناکامی کا ذمہ دار گردان رہی تھیں کہ اس نے لبنان سے کوئی پیشگی وارننگ کیوں نہیں دی۔ انہی دوران ایک اور انتہائی سنسنی خیز واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ غزہ میں واقع اسرائیل کی سخت ترین حفاظتی جیل سے چھ انتہائی خطرناک عرب دہشت گرد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس واقعہ کی ساری ذمہ داری موساد نے ''شن بیت'' پر ڈال دی۔ شن بیت نے یہ کہا کہ جان چھڑانے کی کوشش کی کہ جیل سے فرار کی سازش بیرون ملک تیار ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کی تمام ذمہ داری موساد پر عائد ہوتی ہے۔

ایسے وقت میں جبکہ اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسیاں آپس میں جوتم پیزار ہو رہی تھیں، یروشلم، حیفہ اور تل ابیب کی گلیوں میں ہر روز بے شمار فوجی اور سویلین قتل کیے جا رہے تھے۔ حالات سے دلبرداشتہ اور مایوس وزیر دفاع یزہاک رابن نے حالات پر قابو پانے کے لیے اعلان کیا کہ میں طاقت، تشدد اور تھپڑوں کی پالیسی اختیار کروں گا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اسرائیل کی خفیہ ایجنسیاں عربوں کی تحریک مزاحمت کے خلاف کوئی یکساں پالیسی اختیار کرنے پر متفق نہیں ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف دنیا بھر میں ٹی وی سکرینوں پر نظر آنے والے اسرائیلی بربریت اور ظلم و تشدد کی نظر آنے والی تصویروں نے دنیا بھر کے عوام میں اسرائیل کے خلاف نفرت و حقارت کے شدید جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ امریکی ذرائع ابلاغ عمومی طور پر اسرائیل کے ہمدرد اور دوست گنے جاتے تھے لیکن وہ بھی اپنے عوام کو اسرائیل کا اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور ہو گئے جس کی وجہ سے امریکہ نے بھی اسرائیل کو تنقید و تشنیع کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

1990ء میں براڈن امریکہ سے تل ابیب پہنچا۔ جہاز کے لمبے اور طویل سفر کی تھکن اس کے زرد چہرے سے ہی عیاں تھی۔ وہ اس بات پر بھی برہم تھا کہ امریکہ کا محکمہ انصاف منشیات کے سمگلروں اور بلیک مارکیٹ کے سوداگروں کے ڈالروں کی ملک کے اندر باہر منتقلی کا سراغ لگانے کے لیے پرامس کی ایک تبدیل شدہ شکل کو استعمال کر رہا ہے۔

رافی ایتان کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ اس کا پرانا دوست انتہائی مناسب اور موزوں وقت پر تل ابیب آیا ہے۔ ایک دفعہ پھر اسرائیل کی تمام خفیہ ایجنسیاں آپس میں دست و گریباں تھیں کیونکہ فلسطینیوں کی تحریک مزاحمت انتفادہ شکست پڑنے کے بعد دوبارہ پہلے سے زیادہ جوش و جذبے اور شدت کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ ایتان کے خیال میں عربوں کے سرگرم اور پرجوش رہنماؤں کی نگرانی اور نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے پرامس بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔

یہ نیا انقلاب جہاں تیز رفتاری کے لحاظ سے دہشت گردوں کے لیے حیرانی و پریشانی کا باعث بن رہا تھا وہاں فلسطینیوں اور عربوں میں نئی روح پھونکنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسرائیلی افواج جس قدر لوگوں کو گرفتار کر رہی تھیں، مار پیٹ رہی تھیں اور گولیوں سے چھلنی کر رہی تھیں، مزاحمتی تحریک اتنی ہی تیزی پکڑ رہی تھی۔ دنیا بھر کے کیمروں نے دکھایا کہ وہ اسرائیلی کس بے دردی سے ایک نوعمر فلسطینی لڑکے کے بازو کو بھاری پتھر تلے کچل رہے تھے۔ ایک حاملہ فلسطینی عورت کی بے رحمی سے پٹائی کر رہے تھے۔ بعد ازاں میں چھوٹے بچوں کو اسرائیلی فوجیوں پر پتھر پھینکنے کے جرم میں بندوقوں کے بٹ مار مار کر لہولہان کر رہے تھے۔

تحریک مزاحمت یا انتفادہ سے سوئی ہوئی اقوام متحدہ کے

جائے گا۔

اس ساری صورت حال اور بہت سے دیگر امور سے رانی ایتان نے اپنے مہمان ارل براؤن کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ جواب میں براؤن نے پراس کی کارکردگی اور اس صورت حال میں اس کے مؤثر استعمال بارے کچھ باتیں بتائیں۔ رانی ایتان نے محسوس کیا کہ اگر پراس پروگرام میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں اور کارکردگی کو مزید بہتر اور تیز رفتار کر دیا جائے تو انتفادہ تحریک کے خلاف اسے مؤثر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر اس کا رابطہ دنیا بھر میں موجود پی ایل او کے سترہ دفتروں کے کمپیوٹروں سے قائم کر لیا جائے تو اس عزائم کی نقل و حرکت اور آئندہ کے پروگراموں بارے آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ رانی ایتان نے اپنے لوہا پگھلانے اور کباڑ خانے سے مختلف چیزیں بنانے کے کام پر لعنت بھیجی اور پراس پروگرام کو اپنی ضرورت اور مطلب کے مطابق ڈھالنے کے کام میں جت گیا۔

کسی دہشت گرد کے رجحان کو سمجھنے کے لئے اب انسانی عقل، دانش اور مطالعے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ پراس کی مدد سے اب یہ حتمی طور پر معلوم کیا جا سکتا تھا کہ وہ کہاں اور کب واردات کرے گا۔ پراس کسی بھی دہشت گرد کے کسی بھی سمت اٹھنے والے ہر اقدام کا سراغ لگا سکتا تھا۔

اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی میں پراس جیسی نئی، انوکھی اور انقلابی چیز کا تعارف اور استعمال یقیناً رانی ایتان کو ایک تاریخی اور یادگار شخصیت بنا سکتی تھی لیکن اس کے سابقہ ساتھیوں اور ساتھ کام کرنے والوں نے جو زخم لگائے تھے وہ بہت گہرے تھے۔ اسے ایک معمولی پنشن پر فارغ کر کے بھلا دیا گیا تھا۔ اب اس کی اولین ترجیح اپنے کنبے کی دیکھ بھال اور خوشحالی تھی جسے وہ عرصہ دراز تک اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے نظر انداز کرتا رہا تھا۔ پراس پروگرام اسے ایک ایسا موقع فراہم کر رہا تھا جس سے وہ ماضی کی کسر بھی پوری کر سکتا تھا اور اس کا مناسب استعمال کر کے اپنی قسمت کو چار چاند لگا سکتا تھا لیکن اپنی تمام عقل و دانش، علم و تجربے کے باوجود وہ کمپیوٹر کا ماہر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اس کا علم صرف کمپیوٹر کو آن، آف کرنے تک محدود تھا لیکن اس نے ایک عرصہ تک لاکام (سائنسی علوم کا ڈیٹا اکٹھا کرنے والی ایجنسی) میں کام کیا تھا لہٰذا کمپیوٹر اور سائنس کے ماہرین تک اس کی رسائی آسان تھی۔

جب ارل براؤن واپس امریکہ چلا گیا تو رانی ایتان نے لاکام کے سابق کمپیوٹر پروگرامنگ کے ماہرین کی ایک چھوٹی سی ٹیم تشکیل دی۔ جنہوں نے پراس کی ڈسک کو اپنے ڈھب سے دوبارہ بنایا اور اس میں اپنی ضرورت کے مطابق ترمیم و اضافہ کیا۔ اب ان کے لئے پراس ایک خفیہ اور مؤثر ہتھیار کا روپ دھار چکا تھا لیکن اس کی ملکیت کا دعویٰ کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا۔ رانی ایتان نے اس کا اصلی نام پراس قائم رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ مارکیٹ میں یہ پہلے ہی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

انٹیلی جنس اداروں اور جاسوسی کی دنیا میں کام کرنے والے ایسے افراد جو کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے کماحقہ آگاہ نہ تھے، وہ بھی چند ”کی“ کو سمجھ کر اور چند بٹن دبانے سیکھ کر پراس پروگرام سے ایسی معلومات اور اطلاعات حاصل کر سکتے تھے جو ان کی اپنی بادراست یا دماغ سوزی سے ممکن نہ تھیں۔ پراس ڈسک عام لیپ ٹاپ میں بھی فٹ کی جا سکتی تھی۔ پھر عام کمپیوٹر کی غیر ضروری معلومات اور ڈاٹا سے الگ کر کے اسے صرف جاسوسی کے مقصد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا لہٰذا اس کا آپریٹ کرنا ہر ایک کے لئے آسان تھا لیکن معلومات اور اطلاعات مہیا کرنے کی اس کی رفتار انتہائی تیز تھی۔

بقول بن میناشے اس پروگرام کی فروخت سے پہلے

رائی ایتان اس میں ایک ایسی چپ کا اضافہ کرنا چاہتا تھا کہ خریدار یا استعمال کنندہ کے علم میں آئے بغیر ہی ایتان کو اس بات کا پتہ چلتا رہے کہ ان سے کس قسم کی معلومات حاصل کی گئی ہیں یا اسے کس مقصد اور آپریشن کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔

بن مناشے کیلیفورنیا کے ایک ایسے ماہر کو جانتا تھا جو ایک چھوٹی سی کمپنی چلا رہا تھا، وہ پانچ ہزار ڈالر میں ایسی مائیکرو چپ تیار کرنے کے لئے تیار ہو گیا جو پرامس پروگرام میں خفیہ طور پر نصب ہو گی اور نیز سے تیز سنسر بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکیں گے... یہ شخص بن مناشے کا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ اس نے خیال میں پانچ ہزار ڈالر میں یہ سودا بہت سستا تھا۔ اب اگلا مرحلہ اس سسٹم کو ٹیسٹ کرنے کا تھا۔

پروگرام کو چیک اور ٹیسٹ کرنے کے لئے اردن کا انتخاب کیا گیا کیونکہ ایک تو اس کی سرحد اسرائیل سے ملتی تھی دوسرے ان دنوں یہ انتفادہ کے رہنماؤں کی جنت بنا ہوا تھا۔ وہ یہیں آ کر پناہ لیتے تھے۔ یہیں سے وہ مغربی کنارے اور غزا کی پٹی میں مظاہرے کرنے والے فلسطینیوں اور عربوں کو اسرائیل کے اندر حملے کرنے کی ہدایات دیتے تھے۔ دہشت گرد اسرائیل کے اندر کارروائیوں کے بعد آسانی سے اردنی فوج کی مدد سے سرحد پار کر کے اردن میں آ کر پناہ حاصل کر لیتے تھے۔

فلسطینیوں کی تحریک مزاحمت انتفادہ کے آغاز سے پہلے ہی اسرائیل نے اردن کو اپنی نئی نئی ایجادات کے لئے ٹیسٹ گراؤنڈ بنا رکھا تھا۔ 1970ء میں دنیا کی کمپیوٹر تیار کرنے والی مشہور امریکی کمپنی آئی بی ایم نے اردن کی ملٹری انٹیلی جنس کے لئے جو کمپیوٹر فروخت کیا تھا اس میں اردن کے بادشاہ کنگ حسین کے محل میں رائی ایتان کے مقرر کردہ جاسوس نے ایک چپ لگا دی تھی جس کی وجہ سے اس کمپیوٹر کی معلومات اسرائیل میں موساد کے ہیڈ کوارٹرز میں پہنچتی رہتی تھیں۔ پرامس اس سے بھی بڑے کارنامے انجام دے سکتا تھا۔

یہ سسٹم براہ راست اردن کو فروخت کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی بحالی کئی سال دور تھی۔ لہٰذا برائن کی امریکن کمپنی "ہیلز رائٹ" نے عمان کے ملٹری ہیڈ کوارٹر سے سودا طے کیا۔ جب ارل برائن کی کمپنی کے کمپیوٹر ماہرین یہ سسٹم نصب کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اردنی آرمی انٹیلی جنس کا شعبہ فلسطینی رہنماؤں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے فرانس کے بنے ہوئے اسی قسم کے انظام سے کام لے رہا ہے۔ چنانچہ پرامس کے ماہرین نے خفیہ طریقے سے فرانسیسی سسٹم کو پرامس سے مربوط کر دیا۔ تل ابیب میں رائی ایتان نے جلد ہی نتیجہ دیکھ لیا کہ کون سے فلسطینی رہنما کو اردن والے ٹریک کر رہے ہیں۔

اب اگلا مرحلہ پرامس کی فروخت کے لئے میدان ہموار کرنے کا تھا۔ اس مقصد کے لئے یاسر عرفات کو تجربے کے لئے چنا گیا۔ یاسر عرفات اپنے سکیورٹی کے معاملات میں بہت حساس تھا۔ وہ ہر وقت اپنے پروگرام اور منصوبے تبدیل کرتا رہتا تھا۔ وہ کبھی ایک خوابگاہ میں دو دفعہ سے زائد نہیں سوتا تھا اور اپنے کھانے کا وقت آخری لمحوں میں تبدیل کر لیا کرتا تھا۔

جب کبھی عرفات ادھر ادھر آتا جاتا تھا تو اس کی تمام تفصیل پی ایل او کے ایک خفیہ اور محفوظ کمپیوٹر میں محفوظ کر لی جاتی تھی لیکن پرامس اس کمپیوٹر کے دفاعی نظام کو ناکام بنا کر معلومات ہیک (چرا کر) کر کے یہ معلوم کر سکتا تھا کہ یاسر عرفات کس جعلی یا عرفی نام سے اور کس قسم کے پاسپورٹ پر سفر کرتا تھا۔ پرامس اس کے فون نمبر حاصل کر کے یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اس نے کن نمبروں پر کالیں کی ہیں۔ پھر اس فون پر آنے والی کالوں سے انہیں ری چیک بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس طریقے سے

پراسس یاسر عرفات کی مواصلاتی تصویر پیش کرسکتا تھا۔

وہ اپنے دورے کے بارے میں سکیورٹی اداروں کو حفاظتی اقدامات کے لئے کہہ سکتا تھا اور پراسس وہاں کی لوکل پولیس کے کمپیوٹر سے لنک قائم کر کے تمام معلومات اُچک سکتا تھا۔ غرضیکہ یاسر عرفات کہیں بھی جاتا اپنے آپ کو پراسس سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

رافی ایتان کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ نہ تو ارل برائن اور نہ ہی اس کی کمپنی کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ پراسس کو بین الاقوامی سطح پر فروخت کے لئے متعارف کرا سکیں۔ اس کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کے عالمی سطح پر رابطے، بے پناہ وسائل اور جو سودا بازی کے گر جانتی ہو رافی ایتان ایک ہی شخصیت سے واقف تھا اور وہ شخص تھا رابرٹ میکسویل، "مرر" گروپ کا مالک ومختار۔

میکسویل کو آمادہ کرنے کے لئے تھوڑے سے سبز باغ دکھانے کی ضرورت تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ پراسس کی فروخت سے مال کمایا جا سکتا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک کمپیوٹر کمپنی ہے جو اس کی فروخت کا بندوبست کر سکتی ہے۔ کمپنی کا نام تھا "ڈیگم کمپیوٹرز لمیٹڈ" اور یہ تل ابیب میں قائم تھی اور پہلے سے ہی موساد کی سرگرمیوں میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ میکسویل نے موساد کو پہلے ہی اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ اس کے ایجنٹ اور مخبر سینٹرل اور جنوبی امریکہ میں کمپنی کے برانچ آفسوں کو کمپنی کے ملازم ظاہر کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ میکسویل نے اب دیکھا کہ پراسس کی مارکیٹنگ سے نہ صرف معقول منافع کمایا جا سکتا تھا بلکہ وہ موساد اور آخرکار اسرائیل کی نظروں میں مزید چہیتا اور ہی خواہ بن سکتا تھا۔

اس کے اسرائیل کے گزشتہ دورے سے موساد کے سربراہ ایڈمونی کو میکسویل کے رویے اور طرز عمل سے قدرے بے وفائی اور نمک حرامی کی بو آنے لگی تھی جب اس نے کہا کہ اپنی کمپنی میں ایسے نفسیاتی ماہرین کو بھرتی کرنا چاہتا تھا جو موساد کے دشمنوں کے دماغوں میں جھانک سکیں پھر اس نے خود ہی انہیں ختم کرنے کے ہدف بھی تجویز کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے ایڈمونی سے یہ بھی تقاضا کیا کہ وہ موساد کے قاتلوں سے ملنا اور ان کی تربیت اور ٹریننگ کا خود مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ ایڈمونی نے اس کی اس درخواست کو نرمی، دانائی اور حکمت عملی سے رد کر دیا۔ اس دوران موساد کے اندر بھی میکسویل کے بارے میں سوال اٹھنے شروع ہو گئے۔ کیا میکسویل کا رویہ موساد کو اپنے ڈھب پر چلانے کا تھا یا وہ اسرائیل کے لئے اپنی خدمات کے بدلے میں کسی نئی حکمت عملی کا آغاز کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس کا ذہن غیر متوازن تو نہیں ہو گیا اور وہ اسرائیل کے لئے کسی نئے مسئلے کا باعث تو نہیں بنے گا؟

لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ میکسویل ایک ذہین اور تیز طرار سودا باز تھا اور وہ پراسس کو مارکیٹ میں کامیاب بنا سکتا تھا اور موساد کے اس سسٹم کو انتہائی موثر اور مفید بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اس سسٹم کی پہلی خریدار اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی تھی اور یہ انتفادہ کی مزاحمتی تحریک کے خلاف ایک موثر ہتھیار ثابت ہو رہا تھا۔ پراسس کی مدد سے موساد کے قاتلوں کے ہاتھوں اردن کے اندر تحریک مزاحمت کے کئی رہنماؤں کے قتل کے بعد باقی رہنماؤں نے اردن سے باہر یورپ کے محفوظ مقامات کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

ایک اہم کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب انتفادہ کے ایک اہم کمانڈر نے روم سے جہاں اس نے پناہ حاصل کر رکھی تھی، بیروت کے ایک فون نمبر پر کال کی۔ یہ نمبر موساد نے پہلے ہی اپنے کمپیوٹر میں ایک "بم

ساز'' کے نمبر کے طور پر فیڈ کر رکھا تھا۔ روم سے کال کرنے والا شخص بم ساز سے ایتھنز میں ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ موساد نے پرامس کے استعمال سے بیروت اور روم کے تمام ٹریول ایجنٹوں کے دفتر کھنگال ڈالے تاکہ دونوں افراد کا سفری پروگرام معلوم کیا جا سکے۔ بیروت میں مزید چیکنگ سے معلوم ہوا کہ بم ساز نے اپنے گھر میں اشیائے ضروریہ مہیا کرنے والوں کو چیزوں کی سپلائی سے روک دیا ہے۔ پرامس کی مزید ریسرچ سے پتہ چلا کہ بم ساز نے اپنی ہوائی جہاز سے روانگی آخری لمحات میں منسوخ کر دی تھی تاہم اس سے اس کی جان بچ نہ سکی۔ بیروت ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک کار بم دھماکے کا شکار ہو گیا۔ اس سے رکھ ہفتہ بعد روم میں انفاذو کا عذر ایک روڈا بکمبڈنٹ میں مارا گیا۔ اسے ٹکر مارنے والی کار جائے حادثہ سے غائب ہو گئی۔

اس دوران موساد پرامس کی مدد سے کئی دوسری انٹیلی جنس کی معلومات چرانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس نے گوئٹے مالا میں اس سیکیورٹی فورسز اور منشیات کے سمگلروں کے درمیان قریبی تعلقات اور امریکہ میں منشیات کی فروخت کے مراکز کا سراغ لگایا۔ سمگلروں کے نام اور دیگر معلومات موساد نے ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی (DEA) اور ایف بی آئی کو مہیا کر دیں۔

جنوبی افریقہ میں اسرائیلی سفارتخانے میں تعینات موساد کے ایک ایجنٹ نے پرامس کے استعمال سے ملک کی ان کالعدم انقلابی تنظیموں کا سراغ لگایا جن کے مڈل ایسٹ کے گروپوں سے رابطے تھے۔ واشنگٹن میں اسرائیلی سفارتخانے میں موجود موساد کے ایجنٹوں نے نہ صرف پرامس کے استعمال سے دوسرے ملکوں کے کمیونیکیشن سسٹم میں سرائیت کر کے جاسوسی شروع کی بلکہ امریکہ کے سرکاری نظام اور مختلف ملکوں کی انٹیلی جنس کی چوری شروع کر دی۔ اب بھی سب رکھو لندن اور یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں ہو رہا تھا۔ یہ سسٹم موساد کے لئے اہم اور ضروری معلومات مہیا کر رہا تھا۔

1989ء تک پانچ سو ملین ڈالر کا پرامس پروگرام برطانیہ، آسٹریلیا، جنوبی کوریا اور کینیڈا کو فروخت کیا جا چکا تھا۔ یہ رقم شاید اس سے بھی زیادہ ہوتی اگر امریکن سی آئی اے اس قسم کا اپنا نظام دنیا کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو فروخت کرنا شروع نہ کر دیتی۔ برطانیہ میں یہ نظام M15 شمالی آئرلینڈ میں دہشت گردوں کا سراغ لگانے اور سیاسی لیڈروں مثلاً گیری آدمز کی نقل و حمل اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔

سیکیورٹی پرامس پروگرام پولینڈ کی انٹیلی جنس ایجنسی یو بی کو بیچنے میں کامیاب رہا تھا جس کے بدلے میں ہونے والے معاہدے کے مطابق پولینڈ نے موساد کو مگ 29 چرانے کی اجازت دی تھی۔ اس سے قبل ازیں عراقی مگ چوری کرنے کے آپریشن کی یاد تازہ ہوئی تھی۔ پولش انٹیلی جنس ایجنسی یو بی کے کاؤنٹر آفس کے انچارج ایک جنرل نے پیشکش کی تھی کہ وہ مگ 29 کو اپنے سٹاک سے ناکارہ اور ناقابل استعمال قرار دے کر رائٹ آف کر دے گا بشرطیکہ اس کے سوئٹزرلینڈ میں موجود بینک کے اکاؤنٹ میں دو ملین ڈالر جمع کرا دیئے جائیں حالانکہ یہ فائٹر جیٹ بالکل نیا تھا اور کچھ عرصہ پہلے ہی روسی فیکٹری سے تیار ہوا تھا۔ اس جہاز کو ناکارہ قرار دے کر ٹکڑوں میں بند کر دیا گیا اور تل ابیب کو روانہ کر دیا گیا۔ وہاں اسے دوبارہ جوڑ کر اسرائیلی ائرفورس نے اس کی ٹیسٹ پروازیں کیں اور اسرائیلی پائلٹوں نے شام کے ایسے جیٹ فائٹروں کے مقابلے کی ٹریننگ حاصل کی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد روس نے اس مگ 29 کی چوری کا سراغ لگا لیا۔ روس کی طرف وارسا پیکٹ کے ممالک کو سپلائی کیے گئے جہازوں کی معمول کی شناخت

چیکنگ کے دوران اس چوری کا پتہ چل گیا۔ ماسکو کی طرف سے اسرائیل کو سخت قسم کے احتجاج کا سامنا کرنا پڑا، ساتھ ہی یہ دھمکی بھی کہ آئندہ کے لئے روس سے اسرائیل آنے والے یہودیوں کا انخلاء روک دیا جائے گا۔ اسرائیلی حکومت اور اس کی ائرفورس، جو اس جہاز کی تمام خفیہ تکنیک سے واقفیت حاصل کر چکے تھے، روس سے اپنے چند افسروں کی غلط حرکت لالچ، حرص وہوس اور غیر ذمہ دارانہ حرکت پر خلوص دل سے معافی مانگ لی اور فوراً جہاز واپس کر دیا۔ اس دوران یو بی کا جرنیل اپنے ڈالروں کا مزہ اڑانے کے لئے بھاگ کر امریکہ پہنچ چکا تھا۔ امریکن ائرفورس بھی مگ جہاز کا معائنہ کر چکی تھی لہٰذا انہوں نے پولینڈ کے بھگوڑے جرنیل کو شہریت اور نئی شناخت دے دی۔

اس کے فوراً بعد رابرٹ میکسویل جہاز پکڑ کر ماسکو پہنچا۔ بظاہر اس کا مقصد میخائل گورباچوف کا انٹرویو کرنا تھا لیکن اصلیت میں وہ روسی انٹیلی جنس ایجنسی ''کے جی بی'' (KGB) کو پراسس بیچنا چاہتا تھا۔ پراسس کے اندر لگی خفیہ چپ کے ذریعے اب اسرائیل روس کے تمام خفیہ منصوبوں اور پروگراموں تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ لہٰذا موساد دنیا کی واحد خفیہ ایجنسی تھی جو روسی جاسوسی نظام سے پوری طرح آگاہ تھی۔

ماسکو سے میکسویل سیدھا تل ابیب آیا۔ ائرپورٹ پر ہمیشہ کی طرح اسے کسی طاقتور حکمران کی طرح خوش آمدید کہا گیا۔ ہوائی اڈے کی تمام ضروری کارروائیوں سے مستثنیٰ وزارت خارجہ کے ایک افسر نے اس کا استقبال کیا۔

میکسویل نے وزارت خارجہ کے اس افسر سے بھی اسی طرح کا سلوک کیا جس طرح کا سلوک وہ اپنے ذاتی ملازمین سے کیا کرتا تھا کہ اس کا بیگ بستہ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ کار میں اس کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے۔ میکسویل نے یہ بھی تحکمانہ لہجے میں افسر سے پوچھا کہ اس کی گاڑی کے آگے پیچھے چلنے والا موٹر سائیکلوں کا حفاظتی قافلہ کہاں ہے؟ تو اسے بتایا گیا کہ ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ اس نے استقبالیہ افسر کو دھمکی دی کہ وہ وزیراعظم کو فون کر کے اُسے نوکری سے نکلوا دے گا۔ ٹریفک کے ہر اشارے پر رکتے ہی میکسویل دھاڑتا اور افسر کو لتاڑنا شروع کر دیتا تھا۔ اس نے بے بس اور بے یار ومددگار افسر پر اپنی لعنت ملامت اپنے ہوٹل کے کمرے تک جاری رکھی۔ ہوٹل کے شاہی کمرے میں اس کی چہیتی طوائف اس کی خدمت کے لئے پہلے سے موجود تھی۔ میکسویل نے اُسے فوراً وہاں سے بھگا دیا۔ اس کے دماغ پر اس وقت اپنی جنسی بھوک مٹانے کی نسبت زیادہ اہم قسم کے معاملات سوار تھے۔

لندن میں میکسویل کی اخباری سلطنت کے مالی معاملات مشکلات کا شکار تھے۔ اگر فوری طور پر سرمایہ مہیا نہ ہوا تو اخبارات بند کرنا پڑ جائیں گے۔ ماضی میں وہ لندن شہر سے سرمایہ کار ڈھونڈ لیا کرتا تھا لیکن اب سب لوگ اس کے گروپ میں سرمایہ کاری کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ بڑے تجربہ کار سرمایہ کار جنہیں میکسویل سے ملنے کا اتفاق ہوا خود محسوس کرنے لگے تھے کہ اکڑفوں دکھانے اور پھول پھاں کرنے والے ''منگلی بوائے'' کے مالی معاملات دگرگوں ہیں اور وہ پہلے ہی کافی کچھ داؤں پر لگا چکے ہیں۔ ان دنوں وہ معمولی معمولی باتوں پر غصے میں آ جاتا اور دھمکیوں پر اتر آتا تھا۔ بنکوں نے بھی اُسے ایڈوانس دینے میں پابندیاں عائد کر دی تھی اور اس کی ڈیمانڈ پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بنک آف انگلینڈ اور دوسرے مالی اداروں میں یہ افواہ گردش میں تھی میکسویل کی کمپنی میں سرمایہ کاری محفوظ نہیں ہے۔

اس افواہ کی حقیقت وہ خفیہ اسرائیلی رپورٹیں تھیں جن میں میکسویل سے کہا گیا تھا کہ ''ہم وگرز دیپ ...... بدبنی

کے لئے اس نے جس اصلی سرمایہ کار (موساد) سے جو پیسہ لیا تھا وہ واپس کرے۔ اس سرمائے کی واپسی کے لئے مقررہ مدت بہت پہلے گزر چکی تھی اور اب اسرائیلی مطالبے میں زیادہ سختی آ گئی تھی اور وہ تسلسل کے ساتھ اپنے سرمائے کی واپسی کے لئے میکسویل پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اسی معاملے کو سلجھانے کے لئے وہ تل ابیب آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسرائیل سے مزید مہلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کے آثار کم ہی تھے۔ جہاز کی پرواز کے دوران اسے اپنے سرمایہ کاروں کی طرف سے کئی غصہ بھری فون کالیں موصول ہو چکی تھیں جن میں دھمکی دی گئی تھی کہ وہ معاملہ لندن شہر کی ریگولیٹری باڈی کے نوٹس میں لے آئیں گے۔

یہاں ایک اور معاملہ بھی میکسویل کی ذہنی پریشانی کا باعث بن رہا تھا۔ اس نے ''لورا'' کے منافع کی ایک بہت بڑی رقم چرائی تھی جو اسے سوویت بلاک کے بینکوں میں رکھنے کے لئے امانتاً اس کے سپرد کی گئی تھی۔ اس نے چوری کا یہ پیسہ مرر گروپ کو ترقی دینے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنے ملازمین کے پنشن فنڈ سے بھی زیادہ تر رقم چرائی تھی لیکن ان دونوں ذرائع سے چرائی ہوئی رقم بھی اس کی مبینہ ضروریات پوری کرنے میں ناکافی تھی۔

ان چوریوں کا اگر اس کے سرمایہ کاروں، جیسے اسرائیل وغیرہ کو ایک دفعہ پتہ لگ جاتا تو اسے بہت سخت قسم کے انسانوں، جیسے رافی ایتان وغیرہ کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ موساد کے سخت گیر سابق سربراہ سے نپٹنا آسان نہیں تھا۔

میکسویل نے اپنے ہوٹل کے شاہانہ طرز کے کمرے میں بیٹھ کر اپنی حکمت عملی ترتیب دینی شروع کی۔ پرامس کی فروخت سے ڈیکم کمپنی سے ملنے والا اس کے حصے کا منافع بھی اس کی مشکل کے حل کے لئے کافی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے اسرائیلی اخبار ''ماریو'' کی آمدنی جو مرر گروپ کے جھنڈے تلے چھپ رہا تھا، میکسویل کی ضرورت کے لئے کافی تھی لیکن ایک امکان اب بھی موجود تھا کہ تل ابیب کی ایک کمپنی سائی ٹیکس کارپوریشن اس کی ملکیت تھی جو اعلیٰ کوالٹی کے پرنٹنگ کے آلات تیار کرتی تھی۔ اگر سائی ٹیکس کو جلدی سے فروخت کیا جا سکتا تو اس پیسے سے یہ مسئلہ تھوڑا بہت حل ہو سکتا تھا۔

میکسویل نے سائی ٹیکس کے سینئر ایگزیکٹو کو جو کہ وزیراعظم اسرائیل یزہاک شامیر کا بھتیجا تھا اپنے ہوٹل میں بلا بھیجا۔ ایگزیکٹو نے اسے بری خبر سنا دی کہ فوری فروخت ممکن نہیں ہے۔ سائی ٹیکس کارپوریشن مارکیٹ میں سخت مقابلہ بازی کی وجہ سے اپنی مشکلات و مسائل میں گھری ہوئی تھی۔ یہ مناسب وقت نہیں تھا کہ اسے فروخت کے لئے بازار میں پیش کیا جائے۔ پھر کارپوریشن کی فروخت سے بے شمار تجربہ کار اور ہنرمند کارکن بے روزگار ہو جاتے جبکہ اسرائیل میں بے روزگاری کی شرح پہلے ہی بہت زیادہ تھی اور یہ مسئلہ الگ سے حکومت کا درد سر بنا ہوا تھا۔

اپنی نجات کی اس آخری امید کے دم توڑنے پر میکسویل کا ردعمل انتہائی اشتعال انگیز اور توہین آمیز تھا۔ موقع محل کے لحاظ سے اس کا وزیراعظم کے بیٹے پر گرجنا برسنا اور اسے لتاڑنا مناسب نہ تھا جس نے اپنے باپ کو جا کر بتا دیا کہ میکسویل اس وقت مالی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ وزیراعظم کو پتہ تھا کہ میکسویل کے موساد کے ساتھ رابطے ہیں۔ اس نے موساد کے سربراہ شابوم ایڈمونی کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے اپنے سینئر سٹاف کی میٹنگ اس بات پر غور کرنے کے لئے بلائی میکسویل بھی ایک نیا مسئلہ بن گیا تھا۔ کئی تجاویز پر غور کیا گیا تھا۔

ایک تجویز یہ بھی تھی کہ موساد وزیراعظم سے کہے کہ

وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسرائیلی سرمایہ کاروں کو نہ صرف طویل عرصے تک انتظار کرنے کا کہیں بلکہ اپنا پیسہ اور اثر و رسوخ میکسویل کو مالی مشکلات سے نکالنے کے لئے استعمال کریں۔ یہ تجویز اس بنیاد پر رد کر دی گئی کہ میکسویل نے پہلے ہی اپنے جارحانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویے سے شامیر کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہر شخص ہی جانتا تھا کہ شامیر اپنے ذاتی وقار کا بہت خیال رکھتا تھا لہٰذا اب وہ میکسویل سے فاصلہ بڑھانا چاہتا تھا۔

ایک اور تجویز یہ بھی تھی کہ لندن میں تعینات موساد کے ایجنٹوں سے کہا جائے کہ وہ میکسویل کے لئے ایک "راہِ نجات" پیکیج کی حمایت کریں۔ ساتھ ہی ساتھ موساد کے دوست صحافیوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ اخباری دنیا کے نواب کی شان میں ایسے قصیدے لکھیں کہ عنوز میں پھنسے نواب صاحب کی عزت و شہرت پر حرف نہ آئے۔

اس تجویز کی بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ایڈمونی کے پاس لندن کے ایجنٹوں کی ایسی رپورٹیں پہلے ہی آ چکی تھیں جن میں میکسویل کے "موساد" میں کردار کے خاتمے کا خیر مقدم اور "مرر" اخبار کے صحافیوں کے سوا شاید ہی باہر کا کوئی صحافی ایسے "نواب" کی شان میں قصیدہ لکھنے پر تیار ہو سکتا تھا کیونکہ وہ سال ہا سال تک ذرائع ابلاغ میڈیا کو دھمکاتا اور خوفزدہ کرتا رہا تھا۔

آخری تجویز یہ تھی موساد میکسویل سے اپنے تمام روابط ختم کر دے۔ اس میں بھی خطرہ موجود تھا۔ میکسویل کا دماغ اس وقت برہم تھا اور اس کے آئندہ کے رویے کے بارے میں کوئی پیشنگوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے اخبارات کو موساد پر حملوں کے لئے بھی استعمال کر سکتا تھا کیونکہ موساد کے اندر اس کو جو رسائی دے رکھی تھی (اور اسے موساد کے بے شمار خفیہ راز جرائم معلوم تھے) اس کے بھیانک نتائج نکل سکتے تھے۔

آخرکار میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ایڈمونی

قیس بن احسن نے کہا۔ "کوئی شخص مجھے تکلیف پہنچاتا ہے تو میں اس کے بارے میں غور کرتا ہوں۔ اگر اس کا مرتبہ مجھ سے بڑا ہے تو اس کی بڑائی میرے لئے جواب دینے میں مانع ہوتی ہے۔ اگر وہ میرا ہم مرتبہ ہے تو میں اس پر مہربانی کرتا ہوں، اُسے جواب نہیں دیتا۔ اگر وہ مجھ سے کم رتبہ ہے تو میں اس سے مقابلہ کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں"۔

میکسویل سے مل کر اُسے اسرائیل اور موساد کے بارے میں اُس کے فرض اور ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائے گا۔

اس رات دونوں معززین نے رات کے کھانے پر میکسویل کے ہوٹل کے شاہانہ کمرے میں ملاقات کی۔ ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور کیا کچھ طے پایا کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ یہ ایک راز ہی رہا لیکن چند گھنٹے بعد ہی رابرٹ میکسویل اپنے ذاتی جہاز میں تل ابیب سے روانہ ہو گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب کسی نے اُسے اسرائیل میں زندہ دیکھا تھا۔

ادھر لندن میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تمام مالی پریشانیوں اور دوسرے مسائل کے باوجود مرر گروپ کے اخبارات پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ افریقہ کے درویش رقاصوں کی طرح تیزی سے ایک میٹنگ سے دوسری میٹنگ میں رقصاں نظر آتا تھا تاکہ مالی مدد حاصل کر سکے۔ وہ وقتاً فوقتاً ایڈمونی سے بات کرنے کے لئے موساد کے ہیڈکوارٹر تل ابیب فون کرتا رہتا تھا۔ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

لیکن بعد ازاں موساد کے ایک سابقہ ایجنٹ وکٹر اوسٹروسکی نے کہا تھا کہ اب میکسویل موساد سے اپنی خدمات کا صلہ مانگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے کم از کم اتنی رقم تو ضرور ہی دی جائے جتنی اس نے مرر کے ملازمین کے پنشن فنڈ سے غبن کی تھی۔ میکسویل نے یہ بھی تجویز دی

تھی کہ موساد اس کی جگہ پر مورخائی وانونو کی رہائی اور اسے میکسویل کے حوالے کئے جانے کا مطالبہ کرے۔ پھر میکسویل وانونو کو جہاز میں بٹھا کر لندن لا کر خود اس کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا جو بلٹز "مرر" میں شائع کیا جانا تھا۔ انٹرویو ایک سنسنی خیز کہانی کے طور پر لکھا جانا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا کہ وانونو دوبارہ اسرائیل کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میکسویل کا استدلال تھا کہ اس انٹرویو کی اشاعت کے ساتھ ہی "مرر" کی سرکولیشن میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان تمام مالیاتی اداروں کے دروازے میکسویل پر کھلنے لگتے تھے جو اس وقت اس کی لندن میں شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

اوسٹروسکی یہ یقین کرنے میں اکیلا نہ تھا کہ میکسویل کا یہ پلان اتنا بیہودہ اور بیوقوفانہ تھا کہ موساد نے محسوس کیا کہ میکسویل اُن کے لئے ایک دھواں چھوڑتی ہوئی توپ کا روپ دھار چکا تھا جو کسی وقت بھی دھماکہ کر سکتی تھی۔

30 ستمبر 1991ء کو میکسویل کے گھبرا دینے کا اس وقت اظہار ہوا جب اس نے موساد کے سربراہ ایڈمونی کو ٹیلیفون کیا۔ اس وقت میکسویل کی دھمکیاں ڈھکے چھپے الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے نہ تھیں۔ اس کی مالی حالت ایک دفعہ پھر ابتری کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور اس کے برطانوی پارلیمنٹ اور ذرائع ابلاغ میں انکوائری اور تحقیقات کے مطالبے کئے جا رہے تھے اور اب اس کے نہایت مہنگے وکیل بھی قانونی موشگافیوں اور رٹ پٹیشنوں سے اس کا دفاع کرنے سے بے بس نظر آ رہے تھے۔ ایسے وقت میں میکسویل نے کھلم کھلا موساد کو دھمکی دے دی کہ موساد نے "مرر" کے ملازمین کے پنشن فنڈ چوری کئے تھے وہ واپس کرے ورنہ اس کے لئے شاید یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ ماسکو میں ایڈمونی کی والدہ میر گزی چوف، کے جی بی کے سابق سربراہ سے ملاقاتوں کے راز کو خفیہ رکھ سکے۔

کرپی چوف اس وقت ماسکو کی ایک جیل میں میخائل گورباچوف کی حکومت کا تختہ الٹنے کی گھناؤنی سازش کے جرم میں اپنے خلاف مقدمے کی سماعت کے انتظار میں سلاخوں کے پیچھے تھا۔ سازش کا یہ منصوبہ تھوڑا ہی عرصہ قبل کرپی چوف کی ایڈمونی کے ساتھ میکسویل کی ذاتی تفریحی کشتی پر ملاقات میں بحیرہ آرڈیاٹک میں فائنل ہوا تھا۔

موساد نے وعدہ کیا تھا کہ ماسکو میں نئی برسراقتدار آنے والی حکومت کے استحکام اور منظوری کے لئے اسرائیل اپنا اثر و رسوخ امریکہ اور یورپی طاقتوں پر استعمال کرے گا اور سفارتی تعلقات کی بحالی میں مدد کرے گا۔ اس کے بدلے میں کرپی چوف، روس میں تمام یہودیوں کی رسائی اور اسرائیل بھیجنے میں مدد دے گا۔ اگرچہ اس بات چیت کا نتیجہ تو کچھ نہ نکلا تھا لیکن اس کے انکشاف سے نہ صرف اسرائیل کی سازشی ذہنیت بے نقاب ہو جانے کی بلکہ موجودہ روسی اور امریکی انتظامیہ کے تعلقات کے خراب ہونے کا شدید خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

وکٹر اوسٹروسکی نے لکھا تھا۔ "یہی وہ لمحہ تھا جب دائیں بازو کے موساد کے افسروں کی ایک مختصر میٹنگ میں میکسویل کا کانٹا نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا"۔

اگر اوسٹروسکی کا دعویٰ درست تھا اور اسرائیل کی جانب سے بھی اس کی تردید نہیں کی گئی تو پھر یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ موساد کے ایجنٹوں کا گروپ اپنے اعلیٰ سطح کے افسروں حتیٰ کہ وزیراعظم یزاک شمیر، جو خود بھی موساد کے دشمنوں کے قتل میں شامل رہا تھا کے علم کے بغیر کارروائی کر رہا تھا۔

یہ معاملہ اس وقت موساد کے لئے اور بھی فوری اہمیت اختیار کر گیا۔ جب امریکہ کے ایک کہنہ مشق تحقیقاتی صحافی سیمور ایم ہرش کی کتاب "سیمسن آپشن = اسرائیل، امریکہ اینڈ بم" منظر عام پر آ گئی جس میں اسرائیل کے

ایٹمی قوت بننے کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کی اچانک اشاعت موساد کے لئے بالکل اچنبھے کا باعث تھی اور اس کی کئی جلدیں فوراً نیو یارک سے تل ابیب بھجوائی گئیں۔ یہ کتاب بھی اسی پبلشر نے چھاپی تھی جس نے وکٹر اوسٹروسکی کی کتاب شائع کی تھی، اس میں کافی ریسرچ ورک موجود تھا۔ اس میں پہلی مرتبہ ہرش نے میکسویل کے موساد کے ساتھ تعلق کا انکشاف کر دیا تھا۔ اس میں مرر گروپ کی طرف سے وانونو کی کہانی سے فائدہ اٹھانے، نک ڈیویز، اورا اور ارمی بن مناشے کے خفیہ تعلقات منکشف کئے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح میکسویل نے اپنے مہنگے وکیلوں کے ذریعے ہرش اور اس کے پبلشر کے خلاف رٹ پٹیشنیں عدالتوں میں داخل کر کے اپنے آپ کو قانون کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ ہرش ایک دلیر اور "پلٹزر پرائز" انعام یافتہ صحافی تھا، نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں میکسویل اور موساد کے خفیہ رابطوں بارے سوالات اٹھنے لگ گئے۔ اس کے بارے میں جو پرانے شکوک و شبہات تھے وہ پھر سر اٹھانے لگے۔ پارلیمنٹ کے ممبران اب یہ جاننا چاہتے تھے کہ برطانیہ کے اندر موساد جو آپریشن کرتی رہی ہے، میکسویل کو ان کا کس قدر علم تھا؟ وکٹر اوسٹروسکی کے الفاظ میں:

"میکسویل کے پاؤں کے نیچے کی دھرتی دہکنا (جلنا) شروع ہو گئی تھی"۔

وکٹر اوسٹروسکی کا دعویٰ تھا کہ موساد نے انتہائی ہوشیاری سے ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ میکسویل کو اس کے مرکز لندن سے دور کسی ایسی جگہ مارا جائے جہاں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ یہ ایسا ہی پلان تھا جیسا کہ مہدی بن برکا کو پیرس میں ہلاک کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

29 اکتوبر 1991ء کو اسرائیلی سفارت خانہ میڈرڈ (سپین) میں تعینات موساد کے ایک ایجنٹ کی میکسویل کو ٹیلیفون کال موصول ہوئی۔ اسے کہا گیا کہ وہ اگلے روز سپین پہنچے۔ اوسٹروسکی کے کہنے کے مطابق:

"اس کے مخاطب نے اسے یقین دلایا کہ معاملات سدھر جائیں گے۔ زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی"۔ اسے کہا گیا کہ وہ جہاز میں سوار ہو کر جبل الطارق (جبرالٹر) آ جائے اور وہاں سے اپنی ذاتی تفریحی کشتی "لیڈی غسلین" میں سوار ہو کر اپنے کشتی کے عملے کو "جزائر کناری" پہنچنے کا حکم دے اور وہاں اگلے پیغام کا انتظار کرے۔

رابرٹ میکسویل نے ان ہدایات پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرا دی۔

30 اکتوبر کو چار اسرائیلی مراکش کی بندرگاہ رباط پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سیاح ہیں اور گہرے سمندر میں مچھلی کے شکار میں چھٹیاں گزارنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تیز رفتار موٹر والی کشتی کرائے پر حاصل کر لی اور جزائر کناری کی طرف روانہ ہو گئے۔

31 اکتوبر کو بندرگاہ "سانتا کروز" جزیرہ ٹنی رائف پہنچنے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا ہوٹل مینسی میں اکیلے ہی کھایا۔ اس کے بعد ایک آدمی نے مختصر طور پر اس سے کچھ بات چیت کی۔ وہ کون شخص تھا اور ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟ میکسویل کی زندگی کے آخری دنوں کا ایک راز ہی رہا۔ اس کے فوراً ہی بعد رابرٹ میکسویل اپنی کشتی پر واپس آ گیا اور گہرے سمندر کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اگلے 36 گھنٹے تک میکسویل کی کشتی، ساحل سے دور، مختلف جزیروں کے درمیان گھومتی رہی۔ اس کی سپیڈ کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ میکسویل نے کشتی کے کپتان کو بتایا کہ وہ یہ فیصلہ کر رہا ہے کہ اس کی اگلی منزل کون سا جزیرہ ہو گی۔ عملے کو یاد نہیں کہ میکسویل فیصلہ کرنے میں تذبذب کا شکار تھا کہ نہیں۔

بعدازاں برطانیہ کے میگزین "بزنس ایج" نے خصوصی ہیڈ لائن "کیسے اور کیوں میکسویل کو ہلاک کیا"